راؤ شجاع الدین ابوبکر
اک جان کا بلیدان
انسانی فطرت کو بے نقاب کرنیوالی سات سچی تفتیشی کہانیاں
PDFBOOKSFREE.PK
حکایت پبلشرز
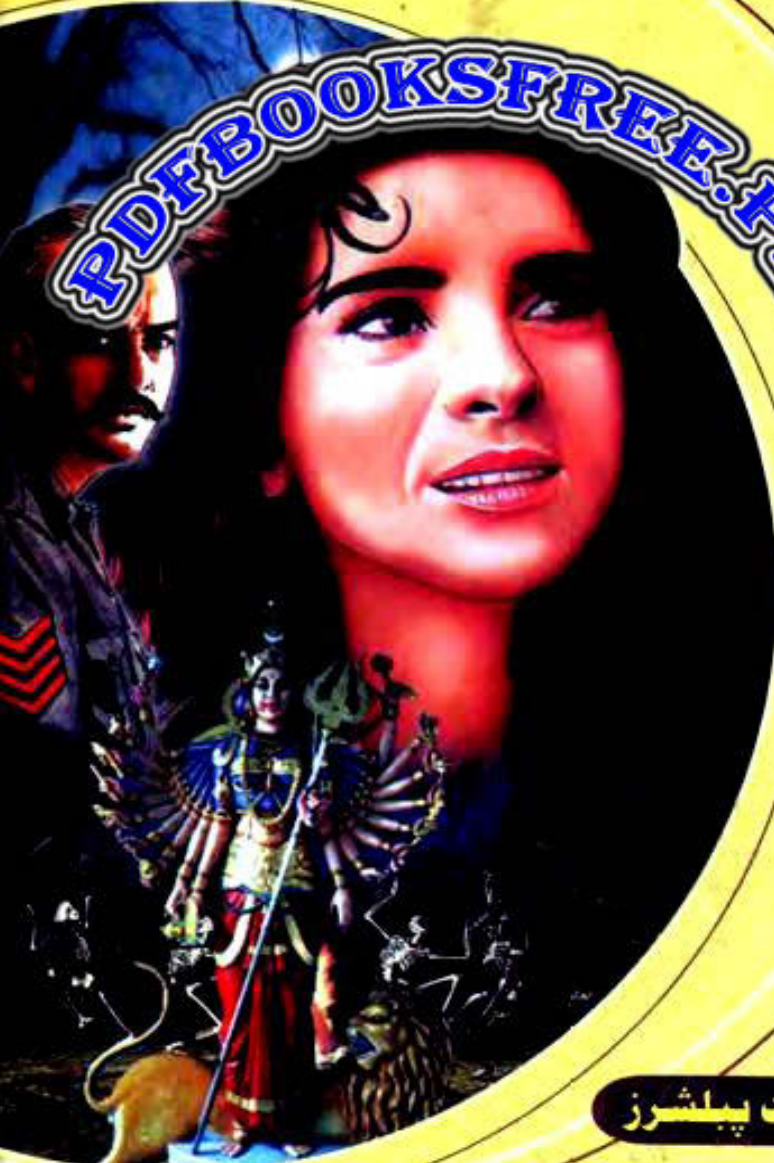
پیش لفظ

محترم راؤ شجاع الدین ابوبکر کی تفتیشی کہانیوں کا پہلا مجموعہ پیش خدمت ہے۔ اس سے پہلے ان کی ایک طویل کہانی تین انسپکٹروں کی مشترکہ کتاب ''بھائی اور بھیڑیا'' میں شامل ہے۔ جرم وسزا اور تفتیشی کہانیاں حکایت کا مقبول ترین سلسلہ ہے۔ اس سلسلے میں محترم احمد یار خان، محترم محبوب عالم، دبیر حسین رضوی کے بعد جس نام نے شہرت حاصل کی وہ محترم راؤ شجاع الدین ابوبکر ہیں۔

محترم راؤ صاحب 1950ء میں بھارت کے صوبہ بہار کی پولیس میں انسپکٹر تھے۔ تقسیم کے بعد ہجرت کر کے مشرقی پاکستان چلے گئے۔ انہیں مشرقی پاکستان کی پولیس میں بھی انسپکٹر کے عہدے پر لے لیا گیا۔ 1966ء میں ڈی ایس پی کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔

راؤ صاحب نے پہلی ہجرت بہار سے مشرقی پاکستان تک کی پھر دوسری ہجرت انہوں نے مشرقی پاکستان سے کراچی تک کی۔ ان کی دور بین نگاہوں نے 1970ء میں ملک کے بگڑتے ہوئے سیاسی حالات اور ہندوؤں کی سازشوں کو بھانپ لیا اور سمجھ گئے کہ آگ وخون کا طوفان آنے والا ہے۔ وہ حالات زیادہ خراب ہونے سے پہلے ہی وہاں سے نکل آئے تھے۔

محترم راؤ صاحب پکے مسلمان اور سچے پاکستانی ہیں۔ دوران سروس ان کا واسطہ ہندوؤں سے پڑتا رہا تھا اور وہ ہندو کی ذہنیت کو جان گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو سے نفرت ان کی رگ رگ میں سمائی ہوئی ہے۔ اس نفرت کا اندازہ ان کی کہانیوں سے بھی ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں آپ کو ایک اور ہی دنیا نظر آئے گی۔ جرم اور تفتیش کی دلچسپی کے علاوہ ہندو کا اصل گھناؤنا چہرہ، کالا جادو اور کالی ماتا پر انسانی قربانی جیسے مناظر بھی ملیں گے۔

ہم نے قارئین تک صاف ستھری اور معیاری کہانیاں پہنچانے کا عزم کر رکھا ہے، زیرِ نظر کتاب ''ایک جان کا بلیدان'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ یہ سلسلہ انشا اللہ قارئین کے تعاون سے جاری رہے گا۔

مدیر

''حکایت''

فہرست

جاگیردار کی بیٹی تھانیدار کا بہروپ

جرم اور سزا کی یہ تفتیشی کہانی اُن لوگوں کی خوش فہمی کی کہانی ہے جو سمجھتے ہیں کہ باپ دادا کی جاگیر اور دولت اور پھر اوپر والوں کی خوشامد انہیں ہر جرم کی سزا سے بچا سکتی ہے۔ پھر یہ اُن جرائم پیشہ لوگوں کی کہانی ہے جو اس خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں کہ وہ قانون کو جُل دے سکتے ہیں اور پولیس کو بھی گمراہ کرنے کی مہارت رکھتے ہیں۔

ہم پرانے دور کے لوگ ہیں اس لئے پرانی باتیں یاد آ جاتی ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ تشکیل پاکستان سے پہلے بمبئی میں قائداعظمؒ نے ایک موقع پر کہا تھا کہ جرائم پیشہ لوگ اوسط درجہ انسانوں سے کہیں زیادہ ذہین اور دانشمند ہوتے ہیں مگر Evil Genius بن جاتے ہیں۔

قائداعظمؒ نے بڑی صحیح بات کہی تھی۔ عادی مجرموں کو ہم پولیس افسر ہی صحیح طور پر سمجھتے ہیں لیکن میں اپنے تجربے کی بنا پر کہوں گا کہ اوسط درجہ سے کہیں زیادہ ذہانت کے باوجود ہر جرائم پیشہ آدمی ایسی احمقانہ حرکت کر بیٹھتا ہے جو اسے عمر بھر کے لیے جیل میں بند کرا دیتی یا پھانسی کے تختے تک پہنچا دیتی ہے۔ میری اس تفتیشی کہانی میں آپ کو ایسے ہی تین جرائم پیشہ اشخاص ملیں گے۔

یہ تشکیل پاکستان سے دو اڑھائی سال پہلے کی واردات ہے۔ میں اس وقت صوبہ بہار کے ایک قصبے امر پور میں ایس ایچ او ہوا کرتا تھا۔ اس وقت یہ قصبہ کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ برانچ لائن پر واقعہ تھا۔ البتہ اس کی اہمیت یہ ضرور تھی کہ بڑے ہی زرخیز علاقے میں تھا اور اس قصبے میں چار پانچ ہندو خاندان ایسے آباد تھے جنہیں غالباً یہ بھی صحیح طور پر معلوم نہیں تھا کہ ان کی کتنی اراضی ہے۔ یوں کہہ لیجئے کہ یہی تین چار خاندان میل ہا میل تک کے زرعی علاقے کے مالک تھے۔ ان کے متعلق یہ کہنا بالکل صحیح تھا کہ ان کے

گھروں میں گھڑے اور مٹکے نوٹوں سے بھرے رہتے تھے۔

اتنی زیادہ زرخیز جاگیر اور اتنی زیادہ دولت کے باوجود یہ لوگ انگریزوں کے آگے سجدہ ریز ہو جایا کرتے تھے اور دوسری طرف اپنے لوگوں کے لئے فرعون بنے رہتے تھے۔ وہ چونکہ تاجر اور دکاندار نہیں تھے اس لیے ان میں ہندوؤں والا بنیا پن نہیں تھا نہ ہی ان میں ہندوؤں والی روایتی بزدلی اور فریب کاری تھی۔ مسلمانوں کی طرح کشادہ ظرف بھی تھے اور خون خرابے کی حد تک مار دھاڑ کرنے کی ہمت بھی رکھتے تھے۔

ایک شام چار پانچ بجے کے درمیان دو ہندو تھانے میں آئے۔ ان میں ایک سے میں واقف تھا۔ وہ اس قصبے میں اناج کی تجارت کرتا تھا یعنی ان بڑے جاگیرداروں اور زمینداروں سے اناج خرید کر بڑے شہروں کی منڈیوں میں پہنچاتا تھا۔

اس کے ساتھ جو آدمی تھا وہ بھی اسی کی عمر کا ہندو تھا۔ اس کے چہرے پر گھبراہٹ دیکھ کر میں نے محسوس کر لیا کہ یہ کوئی رپورٹ لکھوانے آئے ہیں۔ میں نے اپنے جاننے والے ہندو سے پوچھا کہ وہ کس طرح آئے ہیں۔ اس نے دوسرے ہندو کا تعارف کرایا۔ وہ بھی غلے کی منڈی کا تاجر تھا۔ اس کا نوجوان بیٹا لاپتہ ہو گیا تھا۔ بیٹے کی عمر اٹھارہ انیس سال تھی اور یہ اس کا چھوٹا بیٹا تھا۔

اس نے تفصیل یہ بتائی کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار کھیلنے گیا تھا۔ میں اس سے اپنے مطلب کی باتیں پوچھتا جا رہا تھا۔ یہ وقوعہ اس طرح ہوا کہ سات آٹھ نوجوان لڑکوں نے شکار پارٹی بنا رکھی تھی۔ ان کے پاس دو دو نالی بندوقیں تھیں اور ایک لڑکے کے پاس ایک نالی بندوق تھی۔ ان میں زیادہ تر لڑکے گھوڑوں پر جاتے اور دو تین پیدل جایا کرتے تھے۔ اس صبح بھی وہ شکار کو گئے۔ دو ہرن نظر آئے۔ پیشتر اس کے کہ ہرن بھاگ جاتے، ایک لڑکے نے دور سے ایک ہرن پر کارتوس فائر کر دیا۔ ہرن یوں گرا کہ پچھلی ٹانگوں پر بیٹھا، فوراً اٹھا اور بھاگ گیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ہرن کی پچھلی ٹانگیں کارتوس کے چھروں سے زخمی ہوئی ہیں اس لئے مرا نہیں اور اس کے تعاقب میں جا کر اسے پکڑا جا سکتا ہے۔ جو لڑکے گھوڑوں پر سوار تھے انہوں نے گھوڑے دوڑا دیئے۔ ان کے ساتھ تین شکاری کتے بھی تھے جن میں سے ایک اس لڑکے کا تھا جو لاپتہ ہو گیا تھا۔ یہ لڑکا ایک گھوڑی پر سوار تھا جو اس کی اپنی نہیں تھی۔ کسی سے مانگی تھی یا غالباً کرائے پر لی تھی۔

اس لڑکے کا نام نروتم داس تھا اور نرداس کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس کا باپ جو بیان دے رہا تھا وہ اسے لڑکوں نے بتایا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ میرے چند ایک سوالات کے جواب نہ دے سکا۔ ان لڑکوں نے نرداس کی گمشدگی کے متعلق واپس آکر اس کے باپ کو یہ بتایا کہ زخمی ہرن جنگل میں کہیں غائب ہو گیا اور اس کی تلاش میں لڑکے جنگل میں بکھر گئے۔ بہت دیر بعد سب اکٹھے ہوئے تو ان میں نرداس نہیں تھا۔ دو کتے واپس آگئے تھے، نرداس کا کتا نہ آیا۔ لڑکے جو گھوڑوں پر سوار تھے وہ نرداس کی تلاش میں چلے گئے۔ اڑھائی تین گھنٹوں بعد واپس آئے۔ انہیں نرداس کی گھوڑی مل گئی۔ نرداس بھی غائب تھا اور اس کا کتا بھی۔

ساری شکاری پارٹی مایوس ہو کر واپس آگئی اور نرداس کے باپ کو اس کی گمشدگی کی اطلاع دی۔ آج کل لوگوں کے گھروں میں ڈکیتی کی وارداتیں ہوتی ہیں تو بھی لوگ تھانے جانے سے ڈرتے ہیں کہ کوئی شنوائی نہیں ہوگی اور الٹا اپنے اوپر ہی پھڈا بن سکتا ہے۔ اب تو دن دیہاڑے کئے ہوئے قتل بھی ہضم ہو جاتے ہیں لیکن وہ انگریزوں کا دور حکومت تھا جب صرف تقریریں ہی نہیں ہوتی تھیں کہ عوام کے دروازے پر انصاف مہیا کیا جائے گا بلکہ عوام کو عملاً انصاف ملتا تھا۔ انگریز اپنی ذات کی توہین برداشت کر لیتا تھا اپنے قانون کی خلاف ورزی انگریز کی برداشت سے باہر تھی۔

نرداس کے باپ نے اس کے دوستوں کی باتیں سنیں تو اپنے اس تاجر دوست سے بات کی اور دونوں فوراً تھانے آگئے۔ انہیں یقین تھا کہ تھانے میں انہیں ان کا پورا حق ملے گا اور انصاف کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔

میرے ذہن میں ایک ہی بار کئی خیالات اور امکانات آئے جن میں ایک یہ تھا کہ ایسا ہو سکتا ہے کسی نے اندھا دھند کارتوس فائر کیا اور نرداس چھروں کی زد میں آگیا اور مر گیا۔ ان سب لڑکوں نے گرفتاری اور سزا کے ڈر سے نرداس کی لاش کو کہیں دفن کر دیا اور آکر اس کے باپ کو یہ کہانی سنا دی۔ ایک امکان یہ بھی ذہن میں آیا کہ نرداس گھوڑی سے گر کر مر گیا ہوگا اور ان لڑکوں نے اس کی لاش کہیں غائب کر دی کہ ان پر کوئی شک وشبہ نہ ہو۔ اس جنگل میں شیر چیتے جیسا کوئی درندہ بھی نہیں تھا کہ یہ خطرہ ہوتا کہ گمشدہ لڑکے کو کوئی درندہ لے گیا ہے۔ اس جنگل میں عام طور پر ہرن اور چھوٹے جانور پائے جاتے تھے۔

یہ تو میں تسلیم کر ہی نہیں سکتا تھا کہ نرداس کو زمین نے نگل لیا ہو یا اسے جن بھوت اٹھا لے گئے ہوں۔ اگر وہ خود ہی کسی وجہ سے کہیں جانے کا ارادہ رکھتا تو گھوڑی پر ہی جاتا اور اس کا کتا کتوں کی فطرت کے مطابق اس کا پیچھا نہ چھوڑتا...... میں نے نرداس کے باپ سے پوچھا کہ اس کے بیٹے کی کسی کے ساتھ کوئی دشمنی عداوت ہوگی۔ باپ کو کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ میرے بہت سے سوالات کے جواب یہ لڑکے ہی دے سکتے تھے اور مجھے جو بھی کارروائی کرنی تھی وہ ایک منٹ بھی ضائع کئے بغیر کرنی تھی کیونکہ گمشدگی کے سلسلے میں کچھ اور خطرات بھی تھے۔

گمشدہ لڑکے نرداس کے باپ نے ایک اور بات یہ بتائی کہ نرداس کے دوست جب اسے گھر آ کر یہ واقعہ بتا رہے تھے اس وقت نرداس کا کتا جنگل سے واپس آ گیا۔ کتا بہت بے چین تھا۔ نرداس کے باپ کی ٹانگوں کے ساتھ چکر کاٹتا اور کبھی رک کر اس کے منہ کی طرف دیکھتا تھا۔ کبھی واپسی چل پڑتا اور چند قدم جا کر پھر واپس آ جاتا۔ کتا بھونک یا غرا نہیں رہا تھا بلکہ بڑی بے چینی سے اُوں اُوں جیسی آوازیں نکالتا تھا۔

ان میں سے کسی نے بھی نہ سوچا کہ کتا یہ اظہار کر رہا تھا کہ اسے اس کا مالک نہیں مل رہا اور نہ جانے وہ کہاں غائب ہو گیا ہے۔ باپ کتے کو گھر باندھ کر تھانے آ گیا۔

میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ یہ سب ہندو تھے اور کتے کی فطرت سے واقف نہیں تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ہندو گھروں میں کتا رکھتے ہی نہیں۔ اسے وہ نجس اور ناپاک جانور سمجھتے ہیں۔ پنڈت یعنی برہمن تو کتے کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں۔ ان لڑکوں نے کتے پال لئے تھے۔ میں نے بتایا ہے کہ اس علاقے کے ہندو روایتی ہندوؤں سے بہت مختلف تھے۔ میں نے نرداس کے باپ سے پوچھا کہ اس کتے کے ساتھ زیادہ پیار کون کرتا تھا۔ باپ نے جواب دیا کہ وہ تو گھر میں کتے کو پسند کرتا ہی نہیں اس لئے صرف نرداس کتے کے ساتھ لگا رہتا اور وہی اسے باہر لے جاتا تھا۔ یہ سن کر مجھے کچھ افسوس ہوا۔ اس کتے کو اگر باندھنے کی بجائے کھلا چھوڑ کر اس کے پیچھے چل پڑتے تو کتا انہیں وہاں تک لے جاتا جہاں اس کے مالک کی لاش پڑی ملتی۔ اب یہ کام مجھے کرنا تھا اور میرا خیال تھا کہ اچھا خاصا وقت ضائع کر دیا گیا ہے۔

مجھے وہ گھوڑی بھی دیکھنی تھی جس پر نرداس جنگل میں گیا تھا اور گھوڑی اس کے بغیر ملی

تھی۔ مشکل یہ پیدا ہو رہی تھی کہ سورج غروب ہو رہا تھا۔ میں نے بہت غور کیا اور اس فیصلے پر پہنچا کہ پوری رات ضائع کرنا ٹھیک نہیں۔ میں اسی وقت اٹھا۔ ایک سینئر ہیڈ کانسٹیبل اور پانچ کانسٹیبل ساتھ لئے۔ تین بڑی ٹارچیں بھی ساتھ لے لیں اور میں چل پڑا۔ سب سے پہلے میں قصبے کے اس محلے میں گیا جہاں مجھے اس شکار پارٹی کے تمام لڑکے مل سکتے تھے۔ ان سب کو بلوایا پھر وہ گھوڑی بمعہ زین منگوائی جس پر نرداس شکار کرنے گیا تھا۔ اس گھوڑی اور زین کو بڑی ہی اچھی طرح دیکھا۔ کوئی ایسا نشان نظر نہ آیا جس سے مجھے کوئی سراغ یا شک ملتا۔ میں زیادہ تر خون کے نشان دیکھ رہا تھا لیکن مجھے مایوسی ہوئی۔

میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ میں لڑکوں کے بیان لیتا۔ اس دور میں گھوڑوں گھوڑیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میں نے کچھ گھوڑے منگوا لئے اور اس طرف چلے جدھر یہ لڑکے شکار کے لیے گئے تھے۔ تمام لڑکوں کو بھی ساتھ لے لیا۔

میں راستے میں ان لڑکوں سے پوچھتا اور سنتا رہا کہ شکار پر کیا کچھ ہوا تھا۔ مفصل تفتیش تو تھانے میں بیٹھ کر کرنی تھی۔ نرداس کے کتے کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔ اس وقت کتا میری نگاہ میں سب سے زیادہ اہم تھا۔ نرداس کے باپ کو بھی ساتھ لے جانا تھا لیکن اس کا بڑا بھائی ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا کیونکہ باپ اتنی مشقت برداشت کرنے کے قابل نہیں تھا۔

جب ہم تین ساڑھے تین میل دور سے شروع ہونے والے جنگل میں داخل ہوئے اس وقت سورج غروب ہو چکا تھا۔ خوش قسمتی تھی کہ چاند تقریباً پورا تھا اور چاندنی بڑی ہی صاف تھی۔ چاندنی نہ ہوتی تو بھی ہمارے پاس ٹارچیں تھیں۔ کتا کھلا ہوا تھا۔ وہ ہم سے آگے نکل گیا۔ میری نظر کتے پر تھی۔

میں نے سب کو پیچھے ہی روک دیا۔ صرف نرداس کے بھائی کو ساتھ رکھا اور ہم دونوں کتے کے پیچھے چلے گئے۔ کتا زمین سونگھتا جا رہا تھا اور اس طرح ہم کتے کے پیچھے ایک میل سے زیادہ چلے گئے۔ کچھ اور آگے جا کر کتا ایک جگہ رک کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔ کبھی ایک طرف دوڑتا اور کبھی دوسری طرف چل پڑتا اور کبھی رک کر منہ آسمان کی طرف کر کے لمبی ''ہو'' جیسی آواز نکالتا اور بڑی ہی زیادہ بے چینی کا اظہار کرتا تھا۔

کچھ دیر بعد کتا آگے کو دوڑ پڑا۔ وہ زمین سونگھ سونگھ کر آگے بڑھ رہا تھا۔ ہم اس کے پیچھے گئے۔ تقریباً آدھا میل آگے ایک ندی آ گئی۔ پانی گہرا نہیں تھا۔ بمشکل گھٹنوں تک ہو

گا۔ کتا وہاں رک گیا اور بہت بے چین ہونے لگا۔ یہ کتے کی فطرت ہے کہ اپنے مالک کا ساتھ نہیں چھوڑتا۔ مالک کہیں حادثے کا شکار ہو جائے، زخمی ہو جائے، مارا جائے، کتا گھر آ کر ایسی بے چینی کا اظہار کرتا اور باہر کو دوڑتا ہے کہ گھر کے افراد سمجھ جاتے ہیں کہ کوئی حادثہ ہو گیا ہے۔ وہ کتے کے پیچھے چل پڑتے ہیں اور کتا انہیں جائے حادثہ تک لے جاتا ہے۔ نرداس تو اس کتے سے بہت ہی پیار کرتا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ نرداس ندی کے پار گیا ہے۔ میں اب کتے پر ہی بھروسہ نہیں کر سکتا تھا۔ وقت ضائع ہو رہا تھا۔ میں واپس آ گیا۔ اب لڑکوں سے پوچھنا شروع کیا کہ کہاں سے انہوں نے ہرن پر بندوق فائر کی تھی اور پھر کس طرح وہ نرداس کو ڈھونڈتے رہے تھے، اس کی گھوڑی کہاں سے ملی وغیرہ۔

وہ سات نوجوان تھے۔ سب سے چھوٹے کی عمر تقریباً 18 سال اور سب سے بڑے کی 24 سال کے لگ بھگ تھی۔ میں نے انہیں وارننگ دے دی کہ ان میں سے کسی نے جھوٹ بولا یا کوئی بات چھپانے کی کوشش کی تو میں اسے نرداس کی گمشدگی کا ذمہ دار ٹھہرا کر گرفتار کر لوں گا۔ اگر کوئی لڑکا کوئی ایسی بات بتانا چاہتا ہو جو اس کے سامنے کہنے والی نہ ہو تو وہ مجھے الگ بتا دے۔

ان نوجوان لڑکوں سے میں نے فرداً فرداً بھی پوچھ گچھ کرنی تھی لیکن وہاں میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ لڑکے کیا بتاتے ہیں اور ہر لڑکے کا بتانے کا انداز اور موڈ کیا ہے۔ یوں کہہ لیں کہ میں ایک یا ایک سے زیادہ مشتبہوں کی تلاش میں تھا۔ لڑکوں نے بتانا شروع کیا۔

میں نے دیکھا کہ چار لڑکے زیادہ بولتے تھے اور ان میں ایک جو سب سے بڑا تھا، سب سے زیادہ بولتا تھا اور اس کے بولنے کا انداز ایسا تھا جیسے اس شکار پارٹی کا سربراہ یا کمانڈر ہو۔ وہ کچھ رعب اور برتری سے بات کرتا تھا۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ یہ تمام لڑکے ہندو تھے۔

''ہم پہلی بار شکار کھیلنے نہیں آئے تھے''۔۔۔ اس نوجوان نے فیصلہ سنانے کے لہجے میں کہا۔۔۔ ''کئی بار آئے ہیں۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کوئی لڑکا لاپتہ ہی ہو گیا ہو۔ یہ لڑکا نرداس کچھ ایسا ویسا ہی تھا۔ خود ہی کہیں بھاگ گیا ہے۔ گھوڑی اور کتا پیچھے چھوڑ گیا ہے''۔

''ایسا ویسا سے تمہارا مطلب کیا ہے؟''۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔۔۔ ''تم اس کے دوست ہو۔ اس نے تمہیں ضرور بتایا ہوگا کہ وہ گھر سے بھاگنا چاہتا ہے۔ تم بھاگنے کی وجہ بھی جانتے ہو گے''۔

''لڑکیوں کے پیچھے پھرنے کا شوقین تھا''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''اس نے کسی کو بتایا تو نہیں، یہ میرا اپنا خیال ہے کہ کسی اور گاؤں کی کسی لڑکی کے ساتھ اس کے تعلقات تھے اور اس لڑکی کے ساتھ کہیں بھاگ گیا ہے''۔

تین چار لڑکوں نے اس کی تائید کر دی۔ میں نے ان لڑکوں کا یہ شک ذہن میں رکھ لیا لیکن اسے ایک شک کی ہی صورت میں رکھا۔ ہر کسی کی بات پر یقین کر لینے سے تفتیش الجھ جاتی ہے کامیابی نہیں ہو سکتی۔ میں نے اس لڑکے کے متعلق کسی خاص بات کی وجہ سے محسوس کیا کہ اس سے مجھے کوئی نہ کوئی سراغ یا کام کی بات ضرور مل جائے گی۔

اس لڑکے کا تعارف یوں ہے کہ اس کا باپ اس علاقے کا سب سے بڑا زمیندار تھا اور انگریزوں کی طرف سے بھی اسے کچھ زرعی زمین بطور جاگیر ملی تھی اس لئے میں اسے جاگیردار ہی کہوں گا۔ بہت ہی دولتمند آدمی تھا۔ اسے کسی ریاست کا راجہ کہوں تو بھی غلط نہیں ہوگا لیکن اولاد کے معاملے میں وہ بدقسمت نکلا۔ اس کی پانچ بیٹیاں تھیں جن میں سے دو کی شادی ہو چکی تھی اور ایک جوانی میں داخل ہو گئی تھی۔ باقی دو ابھی لڑکپن کی عمر میں تھیں۔ لڑکا یہی ایک تھا اور یہ شکار کا شوقین تھا۔ باپ نے اسے بڑی اعلیٰ نسل کی گھوڑی دے رکھی تھی۔ اس کا نام جگن ناتھ تھا اور جگو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

میں جب اپنی اس پارٹی کے ساتھ واپس تھانے پہنچا تو آدھی رات ہونے کو آ گئی تھی۔ تھانے میں میرا اسٹاف میرے انتظار میں بیدار تھا۔ اے ایس آئی اور محرر ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ صبح اس علاقے کے تمام نمبر دار جنہیں دراصل کھیا کہا جاتا تھا، تھانے میں آ جائیں۔ محرر ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اشتہار شوروغوغا تیار کر لے اور گمشدہ لڑکے نرداس کے بھائی سے پوچھ کر اس کا حلیہ اور عمر وغیرہ اچھی طرح لکھ لے۔ نرداس کا بڑا بھائی میرے ساتھ ہی تھانے آ گیا تھا۔ یہ پولیس کی ضروری کارروائیاں تھیں جن کی تفصیلات سے آپ کو دلچسپی نہیں ہوگی۔ شکار پارٹی کے تمام لڑکوں کو میں نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ وہ صبح تھانے آ جائیں۔

میں اگلی صبح اپنے معمول کے وقت سے کچھ پہلے تھانے جا پہنچا۔ تھانے میں اور بھی کچھ کام اور مسائل تھے لیکن میرے ذہن پر نرداس سوار تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ گمشدہ لڑکے کو ڈھونڈنا میرا فرض تھا اور دوسری وجہ یہ کہ وہ ہندوؤں کی غالب اکثریت کا علاقہ تھا بلکہ پورے کا پورا صوبہ ہندوؤں کی اکثریت کا تھا۔ ہندوؤں کے تو جیسے دھرم میں لکھا ہے کہ مسلمان کو نقصان پہنچانا ہے۔ میں جانتا تھا کہ میری تھانیداری ہندوؤں کو چبھتی ہے۔ اپنے علاقے میں ہندو مسلمان تھانیدار کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اس صورتِ حال میں مجھے بہت ہی محتاط ہونا پڑتا تھا کہ ذرا سی بھی کوتاہی نہ ہو اور انتہائی مشکل اور پیچیدہ تفتیش میں بھی کامیابی حاصل کروں۔ کسی مجبوری کے تحت بھی ذرا سی کوتاہی ہو جاتی تو ہندو مجھے سب انسپکٹر سے اے ایس آئی یا ہیڈ کانسٹیبل بنا دیتے۔

سب سے پہلے تو یہ کارروائی کی کہ اردگرد کے تھانوں کو قواعد و ضوابط اور قانونی طریقہ کار کے مطابق اطلاع بھجوا دی جس میں نرداس کا حلیہ عمر وغیرہ لکھا تھا۔ ہر تھانہ جانتا تھا کہ اس اطلاع پر انہیں کیا کرنا ہے۔

شکار پارٹی کے سارے لڑکے آ گئے اور جن نمبرداروں کو بلوایا تھا وہ بھی ایک ایک کر کے آنے لگے۔ میں سب سے پہلے انہیں بتانا چاہتا تھا کہ وقوعہ کیا ہے اور انہیں کیا کرنا ہے۔ جب وہ آ گئے تو میں نے انہیں اپنے دفتر میں بٹھا کر بتایا کہ ایک لڑکا شکار کے دوران لاپتہ ہو گیا ہے، اسے سارے جنگل میں ڈھونڈنا ہے۔ میرا مطلب دراصل یہ تھا کہ اس کی لاش کی تلاش کرنی ہے۔ وہ خود بھی جانتے ہی تھے لیکن میں نے انہیں یاد دلایا کہ جہاں کہیں وہ گدھ اترتے دیکھیں وہاں پہنچیں۔ ہو سکتا ہے وہاں گمشدہ لڑکے کی لاش ہی پڑی ہو۔ یہ تو مجھے یقین تھا کہ یہ لوگ کوتاہی نہیں کریں گے۔ پولیس اور انگریز بادشاہ کو خوش کرنا تو ان کے جیسے مذہب میں شامل تھا۔

جاگیردار کے بیٹے جگن ناتھ کے شک کے پیش نظر میں نے ان نمبرداروں سے کہا کہ یہ کھوج لگانے کی بھی کوشش کریں کہ کسی گاؤں میں کسی گھر کی لڑکی لاپتہ ہو گئی ہو۔ اگر ایسا ہو تو مجھے فوراً اطلاع دیں۔ دراصل یہ لوگ پولیس کے قابل اعتماد مخبر ہوتے تھے اور پولیس کی طرح تفتیش بھی کر سکتے تھے۔

انہیں فارغ کر کے میں نے شکاری لڑکوں کی طرف توجہ دی۔ ان لڑکوں کو باری

باری اپنے پاس بٹھایا۔ ان سے اس طرح پوچھ گچھ کی جیسے لیموں نچوڑا جاتا ہے۔ بہت جرح کی لیکن سوائے ایک کے کسی سے بھی کوئی اشارہ نہ ملا جو تفتیش میں میری مدد کرتا۔ صرف جگن ناتھ نے ایک ہندو لڑکے کے متعلق بتایا کہ اس کے ساتھ نرداس کی لڑائی ہوئی تھی جو بڑوں تک جا پہنچی تھی اور پھر معاملہ رفع دفع ہو گیا تھا۔ میں نے لڑائی کی وجہ پوچھی تو جگن ناتھ نے بتایا کہ ظاہر یہ کیا گیا تھا کہ پیسوں کے لین دین پر جھگڑا تھا لیکن اصل وجہ کوئی لڑکی تھی جسے نرداس نے چھیڑا تھا یا دست درازی کی تھی۔

اس لڑکے کے متعلق میں نے پوچھا تو جگن ناتھ نے بتایا کہ بڑا لڑاکا لڑکا ہے۔ اس کا شمار بدمعاشوں میں بھی ہوتا ہے۔ دراصل جگن ناتھ نرداس کے متعلق یہ شک صحیح ثابت کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ نرداس لڑکیوں کا شکاری تھا اور اس کی گمشدگی میں کسی لڑکی کا عمل دخل ضرور ہے۔

میں نے جگن ناتھ سے اس لڑکے کا نام پتہ پوچھ لیا اور اسے تھانے لانے کے لیے ایک کانسٹیبل کو بھیج دیا۔ ان لڑکوں کو یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ وہ اپنے طور پر نرداس کا کھوج لگانے کی کوشش کرتے رہیں۔

جس لڑکے کو بلوایا تھا وہ آ گیا۔ اس سے پوچھا کہ نرداس کے ساتھ اس کی لڑائی کیوں ہوئی تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ کم و بیش تین مہینے پہلے کا واقعہ ہے اور لڑائی پیسے کے لین دین پر ہوئی تھی۔ میں نے اپنے انداز سے سوال و جواب کر کے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اس لڑائی کی وجہ کوئی لڑکی تھی یا نہیں۔ اس نے بڑے پختہ لہجے میں بتایا کہ کسی لڑکی کا اس لڑائی میں اشارہ تک شامل نہیں تھا نہ نرداس نے کسی لڑکی کو چھیڑا تھا نہ اس لڑکے کو کسی لڑکی کے ساتھ کوئی دلچسپی تھی۔

''بے شک نرداس سے میری لڑائی ہوئی تھی'' ـــ اس نے کہا ـــ ''لیکن میں اس پر کوئی ایسا الزام نہیں تھوپوں گا جو بالکل ہی بے بنیاد ہو یا جس کا مجھے علم ہی نہ ہو''۔

''مجھے کسی نے بتایا تھا کہ نرداس لڑکیوں کے پیچھے پھرتا ہے'' ـــ میں نے کہا ـــ ''تمہارا کیا خیال ہے؟''

''پہلے یہ بتائیں کہ آپ کو کس نے بتایا ہے؟'' ـــ اس نے پوچھا۔

میں نے ذرا سوچا اور اسے بتا دینا ہی بہتر سمجھا۔ اسے بتایا کہ یہ جگن ناتھ کی رائے

ہے اور اس نے یہ بھی کہا کہ نرداس کسی گاؤں کی لڑکی کو ساتھ لے کو بھاگ گیا ہے...... اس لڑکے کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

"جگن ناتھ کو یہ بات اپنے متعلق کہنی چاہئے تھی" ـــــ اس نوجوان نے کہا ـــــ "دراصل بات کہنے سے پہلے میں آپ سے درخواست کروں گا کہ یہ راز میں رکھیں کہ میں نے یہ بات کہی تھی۔ جگن ناتھ اپنے آپ کو راجکمار سمجھتا ہے۔ اسے پیدا کرنے والوں نے ایسے فضول لاڈ و پیار سے پالا ہے کہ سوائے عیش کرنے کے کچھ اور جانتا ہی نہیں اور لڑکیوں کے پیچھے پھرنے والی گھٹیا عادت کا یہ خود عادی ہے۔ یہ بھی آپ کو بتا دوں کہ کسی اچھے اور امیر خاندان کی کوئی لڑکی اسے منہ نہیں لگاتی۔ اپنے مزارعوں اور نوکروں چاکروں کی بہو بیٹیوں کے ساتھ عشق بازی کرتا رہتا ہے۔ میں ایک بات اور کہوں گا جس کا مجھے پورا یقین تو نہیں لیکن اندر اندر یہ بات سنی سنائی جاتی ہے کہ جگن ناتھ کی ایک کنواری بہن نرداس سے ملتی ملاتی ہے۔ میرے دو دوستوں نے انہیں دو تین بار کھیتوں میں ذرا دوور دور ایک دوسرے کو اشارے کرتے دیکھا ہے"۔

"کیا اس کا جگن ناتھ کو علم ہے؟" ـــــ میں نے پوچھا۔

"میں اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا" ـــــ اس نوجوان نے جواب دیا ـــــ "مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ بتا دیا ہے"۔

میں نے اس لڑکے کی زبان سے اس معاملے کے متعلق کچھ اور اگلوانے کی بہت کوشش کی لیکن مجھے یقین کرنا پڑا کہ یہ کچھ نہیں جانتا۔ مجھے اس سوال کا جواب اپنے مخبروں سے مل سکتا تھا۔ میں نے اس نوجوان کو فارغ کر دیا۔

اس کے بعد چار پانچ دن گزر گئے تھے۔ تھانے میں بہت سے اور کام اور کیس بھی تھے، ان کی طرف بھی توجہ دینی تھی اور اس کے ساتھ میں نرداس کا کھرا کھوج لگانے میں لگا رہا۔ دیہات سے مجھے کوئی تسلی بخش اطلاع نہیں مل رہی تھی۔ نمبرداروں نے دور دور تک کا جنگل کھوج مارا تھا۔ نرداس کی لاش نہ ملی اور وہ کسی کو زندہ بھی نظر نہ آیا۔ مخبروں نے اپنی لمبی لمبی رپورٹیں دیں لیکن کوئی خاص بات معلوم نہ ہوئی، البتہ دو مخبروں نے بتایا کہ جگن ناتھ کی بہن اور نرداس کا آپس میں کوئی چکر ضرور چل رہا ہے لیکن یہ کوئی نہ بتا سکا کہ جگن ناتھ کو اس کا علم تھا یا نہیں۔

جگن ناتھ سے براہِ راست معلوم کرنا ممکن نہیں تھا۔ وہ ایسی بات کبھی نہ مانتا کیونکہ وہ اس کی بہن کا معاملہ تھا۔ بہر حال یہ میرے لئے بڑا کارآمد پوائنٹ تھا جو کسی نہ کسی ذریعے سے مجھے واضح کرنا تھا۔ میں نے جگن ناتھ کی ان باتوں کو جو اس نے جنگل میں میرے ساتھ کی تھیں اور پھر تھانے میں اس کے ساتھ جو سوال و جواب ہوئے تھے، اپنے ذہن میں تازہ کیا اور پھر خاص طور پر اس کے بولنے کے انداز پر غور کیا تو کچھ ایسا شک پیدا ہونے لگا جیسے نرداس کو اس نے غائب کرایا ہے اور اس کی وجہ صرف یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے اپنی بہن کو کبھی نرداس کے ساتھ دیکھ لیا ہوگا۔

ایک روز ڈاک میں مجھے ایک لفافہ ملا۔ میں نے کھول کر خط پڑھا۔ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد مجھے خط کی پوری تحریر لفظ بہ لفظ یاد نہیں رہی البتہ یہ اچھی طرح یاد ہے کہ خط میں لکھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے وہ یہ دیکھا کہ خط کس نے لکھا ہے لیکن اس پر کسی کا نام نہیں تھا۔ لفافے پر ڈاک خانے کی مہر دیکھی۔ اس سے پتہ چلا کہ خط اسی قصبے سے پوسٹ کیا گیا ہے۔

یہ خط میرے لئے حیران کن تھا۔ حیرت کی وجہ یہ کہ تعلیم کی کمی تھی۔ لڑکیوں میں تو تعلیم بہت ہی کم تھی۔ کسی امیر کبیر خاندان کی لڑکیاں آٹھ اور حد سے زیادہ دس جماعتیں پڑھ لیتی تھیں۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس طرح گمنام خط لکھنے کا تصور ہی نہیں تھا۔ میں اس رائے پر پہنچا کہ یہ خط کسی امیر خاندان کی لڑکی کا ہے۔

خط میں اس لڑکی نے لکھا تھا کہ اپنا نام ظاہر نہیں کر سکتی ورنہ قتل ہو جاؤں گی۔ آپ کو صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ نرداس مجھ سے محبت کرتا تھا اور میرے دل میں اس کی جو محبت ہے اس کا اندازہ شاید کوئی بھی نہ کر سکے۔ میں آپ کو یقین کے ساتھ کہتی ہوں کہ نرداس گم نہیں ہوا بلکہ اسے گم کیا گیا ہے۔ اس کی وجہ میری اور نرداس کی محبت ہے۔ نرداس اب تک قتل ہو چکا ہوگا اور شاید اس کی لاش آپ کو کبھی بھی نہ ملے۔ مجھے جس روز یقین ہو گیا کہ نرداس قتل ہو گیا ہے میں اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں قتل کر دوں گی۔ اگر آپ نے نرداس کو زندہ برآمد کر لیا تو اگلے روز صبح آپ اپنے گھر کے صحن میں نوٹوں کی ایک گٹھی پڑی پائیں گے جو میں رات کے وقت آپ کے گھر پھینک جاؤں گی۔

یہ خاص طور پر ذہن میں رکھیں کہ یہ خط ہندی میں لکھا تھا اردو میں نہیں تھا نہ ہی ہندو

اردو کو قبول کرتے تھے۔ میں ہندی لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔

یہ خط اپنے پاس محفوظ کرلیا۔ کوئی عام آدمی ہوتا یا کوئی اناڑی تھانیدار ہوتا وہ فوراً جگن ناتھ کو تھانے بلاکر اس کے آگے یہ خط رکھ دیتا اور پوچھتا کہ اس خط کا کیا مطلب ہے اور بتاؤ نرداس کہاں ہے۔ مشتبہ اور ملزم ایسے سوالوں کا جواب انکار کی صورت میں ہی دیا کرتے ہیں۔ صحیح جواب لینے کے لئے شہادت ضروری ہوتی ہے۔ میں نے اسی وقت دو کانسٹیبلوں کو بلایا اور انہیں شکاری پارٹی کے تمام لڑکوں کے نام پتے دے کر دوڑایا کہ انہیں تھانے لے آئیں۔ جگن ناتھ کو نہ بلایا۔

جو لڑکا سب سے پہلے آیا میں نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ اب میرا رویہ دوستانہ نہیں تھا بلکہ تھانیداری رعب والا تھا۔ میں نے اس لڑکے سے پہلی بات یہ کہی کہ سچ بول دو ورنہ حوالات میں بند کردوں گا اور رات کو اتنا تشدد کروں گا کہ تم تین دن ہوش میں نہیں آؤ گے۔ اس طرح کچھ اور سخت کلامی سے میں نے اس لڑکے کے دماغ پر قبضہ کرلیا۔ میں یہ معلوم کرنے کی کوشش میں تھا کہ وہ لڑکی کون ہے جس کی محبت نرداس کے ساتھ تھی اور اس میں جگن ناتھ کا رول کیا ہے۔

اس لڑکے نے روتی ہوئی آواز میں بتایا کہ وہ نرداس کا بھی اور جگن ناتھ کا بھی دوست ہے لیکن ان دونوں کی زبان سے میں نے کبھی اس کا نام نہیں سنا۔

"تم بکواس کرتے ہو" ___ میں نے لڑکے سے کہا ___ "تم اس لڑکی کو جانتے ہو جسے نرداس بھی چاہتا ہے اور جگن ناتھ بھی۔ تم یہ بھی جانتے ہو کہ نرداس کو اس رقابت کی وجہ سے غائب کیا گیا ہے"۔

یہ لڑکا رو پڑا اور اپنے مذہب کی قسمیں کھا کر مجھے یقین دلانے لگا کہ اسے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں۔ میں نے اسے یہ کہہ کر باہر بٹھا دیا کہ وہ سوچے اور مجھے صحیح جواب دے۔

اس کے بعد میں نے باری باری تین اور لڑکوں کو بلایا۔ انہوں نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا۔ ان کے بعد جو لڑکا آیا اس نے کچھ باتیں بتائیں۔ اسے میں نے پہلے لڑکوں کی طرح دہشت زدہ کردیا تھا۔ دراصل ہو یہ رہا تھا کہ جوں جوں لڑکے میرے سامنے آکر یہ کہتے گزر جاتے تھے کہ نہیں معلوم توں توں میرا غصہ بڑھتا جارہا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ سب

لڑکوں کو نہیں تو ایک دو لڑکوں کو ضرور معلوم ہوگا جو میں معلوم کرنا چاہتا تھا۔ یہ لڑکا میرے سامنے آیا تو میرا غصہ عروج کو پہنچا ہوا تھا۔ میں نے گرج کر اسے ڈانٹا اور ایسی دھمکیاں دیں کہ اس کا رنگ پیلا پڑ گیا۔

اس لڑکے نے بتادیا کہ وہ لڑکی جس کی نرداس کے ساتھ محبت تھی وہ جگن ناتھ کی بہن ہے لیکن اسے یہ معلوم نہیں تھا کہ اس بات کا جگن ناتھ کو علم تھا یا نہیں۔ اس سوال کا جواب مجھے اس کے بعد آنے والے لڑکے نے دیا۔ یہ لڑکا نرداس کا زیادہ گہرا دوست تھا اور ان کی آپس میں رازداری بھی تھی۔

اس نے بتایا کہ نرداس اور جگن ناتھ کی بہن کی محبت اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ انہوں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ ان کی شادی نہ ہوسکی تو وہ گھر سے بھاگ جائیں گے۔ نرداس نے اپنے اس دوست کو یہ بھی بتایا تھا کہ جگن ناتھ کو اپنی بہن کی اس محبت کا علم ہوگیا ہے اور اس نے اپنی بہن کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کی ہے۔ نرداس کو یہ بات جگن ناتھ کی بہن نے بتائی تھی لیکن حیرت اس بات پر ہوئی کہ جگن ناتھ نے نرداس سے کوئی بات نہ کی۔ نرداس کا یہ دوست حیران تھا کہ جگن ناتھ تو انسان کو انسان سمجھتا ہی نہیں لیکن نرداس کو اس نے کچھ بھی نہ کہا۔

"اس کی وجہ ایک ہی ہوسکتی ہے" ___ میں نے کہا ___ "جگن ناتھ بہن کی شادی نرداس کے ساتھ کردینے کا فیصلہ کرچکا ہوگا"۔

"یہ بات شاید صحیح نہ ہو" ___ اس لڑکے نے کہا ___ "ہمارے ساتھ ایک اور لڑکا ہے جو جگن ناتھ کا سب سے زیادہ گہرا دوست ہے اور اس لڑکے کی بہن جگن ناتھ کی اس بہن کی ہمراز سہیلی ہے۔ ان کا ایک دوسرے کے گھر میں آنا جانا لگا رہتا ہے"۔

میں نے اس لڑکے کو باہر بھیج کر دوسرے کو، جس کی بہن جگن ناتھ کی بہن کی سہیلی تھی، بلایا۔ اس خیال سے کہ وہ کوئی بات چھپا نہ لے، میں نے اسے کہا کہ مجھے سب کچھ معلوم ہے، اس سے صرف تصدیق کرنی ہے اور اگر اس نے کوئی بات چھپانے کی کوشش کی تو اسے گرفتار کرلوں گا۔ اس کا لڑکے پر اچھا اثر ہوا۔ اس سے یہ پوچھنے کی بجائے کہ شکار کے دوران کیا ہوا تھا، میں نے کہا کہ وہ جگن ناتھ کی بہن اور نرداس کی محبت کی تمام باتیں بتائے اور یہ بھی کہ اس معاملے میں جگن ناتھ کا رویہ کیا تھا۔

اس نے تصدیق کر دی کہ اس لڑکی اور نرداس کی محبت ان کے دلوں میں بہت ہی گہری اتری ہوئی ہے۔ اس کا مطلب دراصل یہ تھا کہ وہ دونوں عشق و محبت کے اس مقام تک پہنچ گئے تھے جہاں سے واپسی ناممکن ہوتی ہے۔ میں اس لڑکے سے اس کے بیان سے ہی باتیں نکال کر سوال کرتا جا رہا تھا۔ اس طرح جو صورتِ حال میرے سامنے آئی وہ میں آپ کو سناتا ہوں۔

یہ قصہ یوں تھا کہ جگن ناتھ کی بہن جس کا نام غالباً شانتی تھا اس لڑکے کی بہن کی ہمراز سہیلی تھی اور یہ بہن اپنے بھائی کو شانتی کی باتیں بتاتی رہتی تھی۔ ایک روز بہن نے اپنے بھائی سے کہا کہ اپنے دوست نرداس کو بتا دو کہ وہ شانتی کا خیال دل سے نکال دے ورنہ جگن ناتھ کوئی خطرناک حرکت کر گزرے گا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ جگن ناتھ کو پتہ لگ گیا تھا کہ اس کی بہن شانتی کے تعلقات نرداس کے ساتھ ہیں۔ جگن ناتھ نے اپنی بہن کو صرف ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی تھی بلکہ دو چار تھپڑ بھی مارے تھے۔

''ایک بات بتاؤ'' ___ میں نے اس لڑکے سے پوچھا ___ ''کیا جگن ناتھ نے نرداس کو کچھ بھی نہیں کہا تھا؟''

''کچھ بھی نہیں!'' ___ اس لڑکے نے جواب دیا ___ ''میں خود حیران تھا کہ نرداس کے ساتھ جگن ناتھ کا سلوک برتاؤ پہلے جیسا ہی رہا۔ جگن ناتھ اپنے آپ کو اس علاقے کا مہاراجہ سمجھتا ہے اور کسی نہ کسی کے گلے پڑ جانا اس کے لئے قابل فخر بات ہوتی ہے اس سے مجھے شک ہوا کہ جگن ناتھ کے ارادے خطرناک ہیں۔ میں نے نرداس کو یہ بات بتائی تو اس نے کہا کہ شانتی اسے پہلے ہی بتا چکی ہے اور جگن ناتھ اس کے خلاف کچھ نہیں کرے گا۔ کئی دن گزر گئے تو مجھے اطمینان ہو گیا کہ جگن ناتھ نرداس کے معاملے میں ٹھنڈا ہو گیا ہے اور خطرہ ٹل گیا ہے''۔

اس کے بعد اس لڑکے نے جو بیان دیا وہ مختصراً یوں تھا کہ جگن ناتھ نے اپنے تمام دوستوں سے کہا کہ فلاں دن شکار کو چلتے ہیں اور کم از کم دو ہرن مار کر لائیں گے۔ یہ لڑکا جب یہ بیان دے رہا تھا تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم ہندو لوگ گوشت تو کھاتے نہیں پھر ہرن کے شکار کا تمہیں کیا فائدہ ملتا ہے؟...... اس نے بتایا کہ جگن ناتھ کے گھر میں گوشت کھایا جاتا ہے اور باقی دوستوں میں سے تین چار چوری چھپے کھا لیتے تھے۔ شکار کا باقی فائدہ اتنا

ہی تھا کہ ہماری تفریح اور کھیل کود ہو جاتی تھی۔

پھر اس لڑکے نے بتایا کہ اس نے خاص طور پر دیکھا کہ جگن ناتھ نرداس کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا کہ شکار پر ضرور چلے۔ دوستوں کو تو اتنا ہی کہہ دینا کافی ہوتا تھا کہ فلاں دن شکار پر چلنا ہے لیکن نرداس کو جگن ناتھ بار بار کہتا تھا کہ وہ ضرور چلے۔ پھر وہ شکار پر چلے گئے۔ جب یہ لڑکا شکار کی تفصیلات سنا رہا تھا تو میں نے اسے روک دیا اور کہا کہ اب وہ مجھے اچھی طرح یاد کر کے بتائے کہ جب زخمی ہرن کے پیچھے سب لڑکے گئے تھے تو کون کہاں تھا اور سب کس طرح بکھرے تھے اور وہ خود کہاں تھا۔

اس لڑکے نے ذہن پر زور دے دے کر مجھے بتانا شروع کر دیا۔ میں دراصل یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس تعاقب میں جب سب بکھر گئے اس وقت جگن ناتھ کہاں اور نرداس کہاں تھا۔

لڑکے نے بتایا کہ اتفاق سے اس کی نظر جگن ناتھ پر تھی۔ اس نے دیکھا کہ جگن ناتھ نے خاصی دور جا کر اپنی گھوڑی نرداس کی گھوڑی کے قریب کر کے ایک طرف اشارہ کیا اور نرداس نے گھوڑی اس طرف موڑی اور سرپٹ دوڑا دی۔ اس طرف گہرے کھڈ بھی تھے اور کچھ ٹیکریاں بھی تھیں۔ نرداس ان کی اوٹ میں چلا گیا اس کے بعد نرداس ہمیں نظر نہ آیا۔ اس سے آگے جنگل زیادہ گنجان ہو جاتا ہے۔

میں جب رات کے وقت اس علاقے میں گیا تھا تو وہاں تک نہیں پہنچا تھا جہاں کی بات یہ لڑکا سنا رہا تھا۔ اس کی اس بات سے میں نے چند ایک سوال نکالے۔ لڑکے نے سوچ سوچ کر ہر سوال کا جواب دیا اور میرا یہ شک مستحکم ہو گیا کہ نرداس کو جگن ناتھ نے ہی غائب کروایا ہے۔ جگن ناتھ نے نرداس کو یہی کہا ہو گا کہ ہرن اس طرف جا رہا ہے اور تم ادھر سے اسے روکو۔

''اب میں تم سے ایک بڑی ہی نازک بات پوچھنے لگا ہوں'' ___ میں نے کہا ___ ''اگر تم نے یہ بات باہر کسی کو بتائی تو میں تمہیں معاف نہیں کروں گا اور پولیس کو دھوکا دینے کے جرم میں کم از کم ایک سال سزا دلواؤں گا ...... اپنی بہن سے پوچھ کر مجھے بتاؤ کہ شانتی نے پولیس کو خط لکھا ہے؟ تم ابھی چلے جاؤ اور اپنی بہن سے اس طرح پوچھنا کہ میرا ذکر نہ ہو اور غلط بیانی بھی نہ ہو''۔

لڑکے نے میری منت سماجت شروع کر دی کہ میں کسی کو پتہ نہ چلنے دوں کہ یہ راز اس نے میرے آگے کھولا ہے۔ یہ باتیں مجھے بتا کر لڑکا پوری طرح میرے قبضے میں آ گیا تھا اور اب اس پر میرا بھی خوف طاری تھا اور جگن ناتھ کا بھی۔ وہ چلا گیا۔ ایک دو لڑکے رہ گئے تھے۔ میں نے انہیں باری باری بلایا، ان سے پوچھ گچھ کی لیکن وہ کوئی ایسی بات نہیں جانتے تھے۔ میں بھی اب رسمی کارروائی کر رہا تھا۔ کام کی باتیں تو مجھے معلوم ہو ہی گئی تھیں۔

تقریباً ایک گھنٹے تک وہ لڑکا آ گیا اور بڑی اچھی خبر لایا۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ہو گیا کہ اس لڑکے کی بہن اور جگن ناتھ کی بہن شانتی کی کتنی گہری راز داری تھی۔ لڑکے نے بتایا کہ اس کی بہن کو پہلے ہی معلوم تھا کہ شانتی نے میرے نام خط پوسٹ کیا ہے۔ شانتی نے اپنی اس سہیلی کو بتا دیا تھا۔ اس سہیلی نے شانتی سے کہا کہ اس نے کوئی اچھی کارروائی نہیں کی، اس سے اس کا بھائی پکڑا جائے گا۔ شانتی نے کہا کہ اس نے خط پر اپنا نام نہیں لکھا اور اگر اس کا بھائی جگن ناتھ پکڑا جاتا ہے تو اس کی اسے خوشی ہو گی۔ میں یہ بات سن کر سمجھ گیا کہ شانتی کو بھائی نے مارا پیٹا تھا اور وہ انتقام لے رہی تھی اور یہ بھی کہ اسے یقین سا تھا کہ اس کے محبوب نرداس کو جگن ناتھ نے غائب کروایا ہے۔

اب میں نے جگن ناتھ کو تھانے بلوایا۔ وہ اپنی اعلیٰ نسل کی گھوڑی پر آیا اور دوسرے گھوڑے پر اس کا جاگیردار باپ سوار تھا۔ میں اپنے دفتر میں بیٹھا تھا۔ باہر سے جگن ناتھ کے باپ کی حاکمانہ آواز آئی ـــ ''کہاں ہے تمہارا داروغہ!'' ـــ مجھے کچھ ایسی ہی توقع تھی کہ یہ شخص اپنے بیٹے کے ساتھ آئے گا اور اس کا انداز حاکمانہ ہی ہو گا۔ ایک کانسٹیبل ان دونوں کو میرے دفتر میں لایا۔ میں نے اٹھ کر اس جاگیردار سے ہاتھ ملایا اور دونوں کو بٹھایا۔

''آپ نے میرے بیٹے کو تھانے کیوں بلایا ہے؟'' ـــ جاگیردار نے اپنے بارعب انداز سے پوچھا۔

''آپ کا بیٹا اُس شکار پارٹی کا سربراہ تھا جس پارٹی کا ایک لڑکا لاپتہ ہو گیا ہے''۔ میں نے کہا ـــ ''اس سلسلے میں اس سے کچھ باتیں معلوم کرنی ہیں''۔

''ضرور کریں'' ـــ جگن ناتھ کے باپ نے حکم کے لہجے میں کہا ـــ ''جو پوچھنا ہے میری موجودگی میں پوچھ لیں، میں اسے اپنے ساتھ ہی لے جاؤں گا''۔

''مہاراج!'' ـــ میں نے کہا ـــ ''بہتر ہے آپ چلے جائیں، مجھے جو پوچھنا ہے

وہ میں صرف اس سے ہی پوچھوں گا۔ تفتیش ایسی ہے کہ کسی غیر متعلقہ آدمی کو پاس نہیں بٹھایا جا سکتا''۔

اس شخص کے چہرے پر رعونت کے تاثرات اور زیادہ نمایاں ہو گئے۔ اس کی نگاہ میں میری ایک کمزوری تو یہ تھی کہ میں مسلمان تھا اور وہ مجھے اپنا غلام سمجھتا تھا جب کہ وہ خود انگریزوں کا غلام تھا اور اس پر وہ فخر بھی کرتا تھا اور اسے اپنی طاقت بھی سمجھتا تھا۔ جنگِ عظیم میں اس قسم کے جاگیرداروں اور بلیک سے دولت کمانے والے تاجروں نے وار فنڈ میں بہت چندہ دیا تھا اور یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے انگریزوں کو خرید لیا ہے مگر وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ انگریز اپنے قانون کی توہین برداشت نہیں کیا کرتا۔ اس شخص نے مجھے بڑے بارعب طریقے سے اس بات پر لانا شروع کر دیا کہ میں اس کی موجودگی میں اس کے بیٹے سے پوچھ گچھ کروں۔ آخر مجھے تھانیداروں کے لہجے میں بولنا پڑا لیکن وہ پکا ڈھیٹ بنا ہوا تھا۔ آخر میں نے اسے یہ کہہ کر اٹھایا کہ وہ میرے ڈی ایس پی کے پاس چلا جائے اور میری شکایت اس کے آگے رکھے۔ اس کے بعد بھی وہ اڑا رہا اور مہاراجوں کی طرح بولا کہ میں اپنے بیٹے کو ساتھ لے جا رہا ہوں۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو آواز دی۔ وہ دوڑا آیا۔ میں نے جگن ناتھ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اسے حوالات میں بند کر دو۔ ہیڈ کانسٹیبل نے آگے بڑھ کر جگن ناتھ کا بازو پکڑا۔ اس کا باپ اٹھا اور ہیڈ کانسٹیبل کو ذرا پیچھے کر دیا اور بالکل ہی بدلے ہوئے لہجے میں مجھے کہا کہ میں ایسی زیادتی نہ کروں۔ میں نے اسے بتایا کہ پولیس کو کیسے کیسے اختیارات حاصل ہیں اور اس حوالات میں تو انگریز بھی بند رہے ہیں۔

''میں باہر بیٹھتا ہوں'' ـــ جاگیردار نے کہا۔

''جی نہیں مہاراج!'' ـــ میں نے کہا ـــ ''آپ تھانے کی حدود سے باہر چلے جائیں۔ اگر نہیں جائیں گے تو میں آپ کو اس الزام میں گرفتار کر لوں گا کہ آپ تفتیش میں رکاوٹ پیدا کر رہے ہیں، بہتر ہے آپ فوراً یہاں سے چلتے نظر آئیں''۔

وہ مجھے رعونت اور نفرت سے گھورتا ہوا میرے دفتر سے نکل گیا اور پھر میں نے اسے تھانے کی حدود سے نکلتے بھی دیکھا۔

''کان کھول کر سن لو جگن ناتھ!'' ـــ میں نے کہا ـــ ''یہاں تمہارے پتا جی کا حکم

نہیں چلے گا۔ بادشاہی انگریزوں کی ہے تمہارے پتا جی کی نہیں۔ میں جو پوچھوں وہ سچ بتاؤ پھر میں تمہاری مدد کروں گا۔ اگر تم نے یہ سوچا کہ تمہارا باپ تمہیں چھڑا لے گا یہ خوش فہمی ذہن سے نکال دو"۔

"پوچھیں کیا پوچھنا ہے"۔۔۔ جگن ناتھ نے کہا۔

میں نے پہلی بات اس سے یہ پوچھی کہ یہ کہاں تک صحیح ہے کہ اس کی بہن نرداس کو چاہتی ہے۔ اس نے اس کی تصدیق ایسے لہجے میں کی جیسے وہ انکار کرنا چاہتا تھا۔ پھر میں نے پوچھا کہ ان دونوں کی محبت کے متعلق اس کا کیا خیال ہے۔

"مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا"۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ "میں تو ان کی شادی کروانا چاہتا ہوں"۔

"پھر اپنی بہن کو مارا پیٹا کیوں تھا؟"۔۔۔ میں نے پوچھا۔

وہ کوئی پکا جرائم پیشہ تو تھا نہیں کہ یہ چوٹ سہہ جاتا۔ اس کا ردِعمل یہ تھا جیسے کسی نے بجلی کے ننگے تار اس کے جسم کے ساتھ لگا دیئے ہوں۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھل گئی تھیں۔ میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ کچھ لوگ اس خوش فہمی میں مبتلا ہو کر غلط حرکتوں اور جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں کہ دولت اور جاگیر انہیں بچا لے گی۔ مجھے ابھی یہ یقین تو نہیں تھا کہ جگن ناتھ ہی میرا ملزم ہے لیکن وہ ایسی خوش فہمی میں مبتلا تھا جس کا میں نے ذکر کیا ہے۔ میں نے اپنا سوال دہرایا تو اس نے ہکلاتی ہوئی سی زبان میں جواب دیا کہ بہن نے اس کے ساتھ کوئی بدتمیزی کی تھی۔

"ہرن کے پیچھے جاتے ہوئے تم نے نرداس کو ایک طرف اشارہ کر کے بھیجا تھا"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اس کے بعد نرداس کسی کو نظر نہیں آیا۔ کیا تم نے ان نیکریوں کے پیچھے جا کر اسے تلاش کیا تھا؟...... جواب دینے سے پہلے یہ سوچ لینا کہ یہ کہو گے کہ تم نے تلاش کیا تھا اور فلاں فلاں لڑکا تمہارے ساتھ تھا تو میں ان سے پوچھوں گا کہ تمہارا یہ جواب صحیح ہے یا غلط ہے"۔

اس نے فوراً جواب نہ دیا۔ اس کے چہرے کا رنگ بالکل ہی بدل گیا تھا جو گھبراہٹ کا واضح اظہار تھا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھنا شروع کر دیا۔ پھر اس نے دبی سی آواز میں کہا کہ مجھے یاد نہیں آ رہا۔

"تمہیں سب کچھ یاد ہے جگن ناتھ!"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "میں نے تمہیں کہا ہے کہ سچ بولو میں تمہاری مدد کروں گا"۔

"میں بالکل سچ بول رہا ہوں"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "نرداس کا مجھے کچھ علم نہیں"۔

میں اس لڑکے کی زبان ہلکے سے تشدد سے کھلوا سکتا تھا لیکن میں تشدد سے گریز کر رہا تھا جس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ صرف اقبالی بیان لے لینے پر ہی کیس مکمل نہیں ہو جاتا بلکہ شہادت اکٹھی کرنی پڑتی ہے اور دوسری مشکل یہ تھی کہ یہ ایسے جاگیردار کا بیٹا تھا جو بڑی آسانی سے اوپر پہنچ سکتا تھا۔ میں اس سے بھی ذرا بچنا چاہتا تھا۔ میں نے اس لڑکے کو پریشان کرنے کا یہ طریقہ اختیار کیا کہ اسے کانسٹیبلوں کی بیرک میں بٹھا دیا اور کہا کہ وہ سوچ کر مجھے جواب دے۔

شام کے وقت علاقہ ڈی ایس پی کا فون آیا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ واردات کیا ہے۔ اس نے جگن ناتھ کے باپ کا نام لے کر کہا کہ اس کے بیٹے کو میں نے شامل تفتیش کیا ہے اور اس کی کیا پوزیشن ہے۔ میں نے اس انگریز ڈی ایس پی کو بتایا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ یہ جاگیردار تھانے میں آ کر مجھ پر حکم چلاتا ہے۔ بہرحال میں نے ڈی ایس پی کو صحیح پوزیشن بتا دی۔ اس نے میری حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا کہ میں تفتیش جاری رکھوں اور کسی سے ڈروں نہیں۔ میں سمجھ گیا کہ جگن ناتھ کا باپ ڈی ایس پی کے پاس جا پہنچا ہے۔ ڈی ایس پی ضلع کے مرکزی شہر میں ہوتا تھا۔ اس کی حوصلہ افزائی سے میں اور زیادہ جرأتمند ہو گیا۔ اب مجھے اس جاگیردار کا کوئی ڈر اور خطرہ نہیں رہا تھا۔ اگلی صبح نرداس کا باپ گھبراہٹ کی حالت میں تھانے آیا۔ وہ تو بہت ہی خوفزدہ معلوم ہوتا تھا۔ میں تھوڑی ہی دیر پہلے تھانے آیا تھا۔ اس سے پوچھا کہ کوئی نئی واردات ہو گئی ہے؟...... وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتا اور خوفزدہ ہو کر کہتا تھا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ میں تھانے میں آیا ہوں۔ اس نے ایک کاغذ میرے آگے سرکا دیا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہنے لگا کہ دروازہ بند کر دیں۔ میں نے اس کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھنی شروع کی۔

یہ تحریر ہندی زبان میں تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ تمہارا بیٹا نرداس ہمارے پاس ہے۔ اگر تم اسے زندہ ہم سے لینا چاہتے ہو تو بیس ہزار روپیہ ادا کر دو اور بیٹے کو لے جاؤ ورنہ تمہیں بیٹے کی لاش ملے گی۔

اس تحریر میں ایک دن اور وقت لکھا ہوا تھا۔ اگر مجھے وہ دن صحیح یاد ہے تو وہ بدھ تھا اور وقت بارہ بجے دن تھا۔ وہ جگہ بھی لکھی ہوئی تھی جہاں یہ رقم دینی اور نرداس کو وصول کرنا تھا۔ یہ جگہ قصبے سے تقریباً ایک میل دور تھی۔ چونکہ یہ میرے تھانے کا علاقہ تھا اس لئے میں اس جگہ سے واقف تھا۔ بالکل بنجر اور ویران جگہ تھی۔ کچھ حصہ نشیبی تھا۔ وہاں ایک دوسرے سے دور دور چند ایک درخت تھے۔ اس رقعے کے نیچے لکھا تھا کہ تمہیں یہ سودا منظور ہے تو اپنے گھر کے باہر والے دروازے کے ساتھ چھوٹا سا سفید کپڑا لٹکا دینا اور پھر مقررہ دن اور وقت پر رقم لے کر اس جگہ پہنچ جانا۔

نرداس کا باپ اس وجہ سے خوفزدہ تھا کہ اس رقعے میں لکھا تھا کہ پولیس کو بتانے کی غلطی نہ کرنا اور اگر وہاں تمہاری جگہ پولیس آ گئی تو پھر تمہیں بیٹے کی لاش بھی نہیں ملے گی۔

میں یہ خاص طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ اس زمانے میں اغوا برائے تاوان کی وارداتیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ آج کل تو یہ جرم عام ہو گیا ہے۔ ٹیلی فون نے اس جرم میں خاصی سہولت پیدا کر دی ہے۔ میرے زمانے میں شہروں میں شاید کبھی کبھار ایسی واردات ہوتی ہو گی، قصبوں اور دیہات میں تو اس واردات کا تصور ہی نہیں تھا۔ میری رائے یہ تھی کہ یہ کوئی بڑے ہی پختہ کار جرائم پیشہ لوگ ہیں جنہوں نے اتنی دلیری اور جرأت سے یہ واردات کی ہے۔

مجھے اب یہ ڈر تھا کہ انہیں پتہ نہ چل جائے کہ نرداس کا باپ تھانے آیا تھا۔ اس شخص نے عقلمندی کی تھی کہ صبح سویرے ہی میرے پاس آ گیا تھا۔ جرائم پیشہ لوگ اتنی جلدی جاگ اٹھنے کے عادی نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے جو دن دیا تھا اس میں چار دن باقی تھے۔ میں اب چاہتا تھا کہ یہ شخص فوراً تھانے سے نکل جائے تاکہ ملزم اسے دیکھ نہ سکیں۔ میں مسلمان ہوں اور اپنے دین کے عقائد کو روح کی گہرائیوں سے مانتا ہوں۔ میں نے اللہ پر توکل رکھتے ہوئے نرداس کے باپ سے کہا کہ وہ گھر جا کر دروازے کے سامنے چھوٹا سا سفید کپڑا لٹکا دے اور دن بھر لٹکا ہی رہنے دے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ یہ شخص بیس ہزار روپیہ تاوان ادا کرنے پر رضامند ہے۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ اس زمانے کا بیس ہزار روپیہ آج کے سات آٹھ لاکھ روپوں کے برابر تھا۔

میں نے اس شخص سے یہ تو کہہ دیا کہ وہ دروازے پر سفید کپڑا لٹکا دے لیکن مسئلہ یہ

تھا کہ میں ملزموں کو موقعہ پر کس طرح پکڑوں گا۔ میں نے پہلے وہ جگہ بیان کی ہے جو ان لوگوں نے تاوان وصول کرنے کے لیے مقرر کی تھی۔ وہ سپاٹ میدان تھا جہاں پولیس کو چھپایا نہیں جا سکتا تھا۔ اگر میں اپنے عملے کو پرائیویٹ کپڑوں میں لے جاتا تو بھی ملزم محتاط ہو جاتے اور یہ بھی میرے ذہن میں تھا کہ یہ جرائم پیشہ لوگ ہیں جو تھانے کے ہر ایک فرد کو جانتے پہچانتے ہوں گے۔ اس جگہ گہرے کھڈ تو تھے لیکن وہاں پولیس کے آدمیوں کو چھپانا محفوظ نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ یہ لوگ پکے جرائم پیشہ تھے، وہ ضرور دیکھ لیتے کہ ان کھڈوں میں کوئی چھپا ہوا تو نہیں۔

میں نے پکا عہد کر لیا کہ انہیں پکڑوں گا اور اس باپ کے نوجوان بیٹے کو آزاد کراؤں گا۔ میں نے اپنے انداز سے اللہ سے مدد مانگی۔ میں نماز باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ اس روز عشاء کے بعد میں نے خاص طور پر اللہ کے حضور گڑگڑا کر التجا کی کہ مجھے اس دشوار مہم میں کامیابی عطا فرمائے۔

یقین کیجئے کہ رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو بجلی چمکنے کی مانند دماغ میں ایک چمک آئی اور میں اٹھ بیٹھا اور دماغ نے میری ایسی رہنمائی کی کہ میں نے سکیم تیار کر لی اور میں اطمینان سے سو گیا۔

اگلے روز جب میں تھانے گیا تو ایک سیانے سے کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ نرداس کے باپ کی دکان پر جائے لیکن وردی میں نہ ہو۔ اسے اتنا ہی کہے کہ میں رات کسی وقت اس کے گھر آؤں گا اور وہ گھر پر ہی رہے...... کانسٹیبل پرائیویٹ کپڑے پہن کر چلا گیا اور واپس آ کر اس نے مجھے بتایا کہ وہ پیغام دے آیا ہے۔

جگن ناتھ کو میں نے تھانے میں پابند کر رکھا تھا۔ اس کا باپ ایک بار پھر آیا اور اپنے بیٹے کے متعلق پوچھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ لے، اس پر ذرا سا بھی تشدد نہیں ہو رہا اور وہ بیٹے سے کہے کہ سچ اگل دے۔ میں نے باپ بیٹے کی ملاقات کرا دی اور باپ نے اس ملاقات کے بعد مجھے یہ فیصلہ سنایا کہ اس کا بیٹا بے گناہ ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ چلا جائے اور جب مجھے اس کے بیٹے کی بے گناہی کا ثبوت مل جائے گا، میں اسے چھوڑ دوں گا۔ اس جاگیردار باپ نے اب مجھ پر اپنی اونچی حیثیت کا رعب نہ جھاڑا۔ اسے میرے انگریز ڈی ایس پی نے بتا دیا ہو گا کہ قانون کے مقابلے میں وہ اس کی کوئی مدد نہیں

کر سکتا۔

مجھے یقین ہو چکا تھا کہ نرداس کے غائب ہونے میں جگن ناتھ کا ہاتھ ضرور ہے لیکن یہ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ لڑکا اس جرائم پیشہ گروہ تک کس طرح جا پہنچا۔

اس روز میں نے ایک کام اور کیا۔ قصبے میں ایک سفری تھیٹر کمپنی کچھ دنوں سے آئی ہوئی تھی۔ اس دور میں سفری تھیٹر کمپنیاں اسی طرح شہر شہر اور قصبہ قصبہ گھومتی پھرتی رہتی تھیں۔ ہر جگہ کچھ دن اپنے ڈرامے دکھا کر آگے چلی جاتی تھیں۔ ان کمپنیوں کے مالک جہاں بھی جاتے وہاں سب سے پہلے پولیس کے ساتھ رابطہ کرتے تھے تاکہ انہیں پولیس کی حفاظت مل جائے۔ اس کمپنی کا مالک میرے پاس تین چار مرتبہ صرف سلام دعا کے لیے آ چکا تھا۔

میں نے تھیٹر کے اس مالک کو بلوایا۔ یہ لوگ حلیہ بدلنے اور بہروپ دھارنے کے ماہر تھے۔ یہی ان کا کام تھا۔ وہ آیا تو میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے ایسا بوڑھا بھکاری بنا دے کہ میرے گھر کا کوئی فرد قریب آ کر دیکھے تو بھی پہچان نہ سکے۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا کہ آپ خود بھی اپنے آپ کو پہچان نہیں سکیں گے۔ پھر اسے یہ کہا کہ مجھ سے یہ نہ پوچھے کہ میں یہ بہروپ کیوں دھار رہا ہوں اور کسی کے ساتھ اشارتاً بھی ذکر نہ ہو۔

''میں سمجھتا ہوں حضور انور!''—— اس نے کہا—— ''پولیس کو مجرم پکڑنے کے لیے ایسے ڈھنگ کھیلنے ہی پڑتے ہیں''۔

اتفاق سے وہ مسلمان تھا اور سمجھتا تھا کہ میں اوپر نیچے، دائیں بائیں سے ہندوؤں میں گھرا ہوا ہوں اور میری نوکری خطرے میں پڑ سکتی ہے۔

میں کوئی انوکھا ڈرامہ نہیں کھیل رہا تھا۔ آپ کو کئی ایسے واقعات سنا سکتا ہوں، پولیس کے انگریز افسروں نے حلیے بدل کر اور ہندوستانی بہروپ دھار کر وہ ڈاکو پکڑے تھے جن کی گرفتاری ناممکن نظر آتی تھی۔ کسی ملزم کے نہ پکڑے جانے کو پولیس اپنی توہین سمجھتی تھی۔

میں اس رات نرداس کے گھر چلا گیا۔ میں پرائیویٹ کپڑوں میں تھا۔ نرداس کے باپ کو صرف اتنا کہا کہ وہ مقررہ دن مقررہ وقت پر اس جگہ چلا جائے اور اس کے ہاتھ میں ایک تھیلی یا عام قسم کا تھیلا ہو جس سے ملزم یہ سمجھیں کہ یہ شخص رقم لایا ہے۔ یہ شخص منڈی کا ہول سیل تاجر تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اس کے گھر روپیہ پیسہ ہے اور یہ بیس ہزار روپیہ دے

سکتا ہے۔ مجھے یقین تھا کہ ملزم اس کے ہاتھ میں تھیلا دیکھیں گے تو انہیں یقین آ جائے گا کہ یہ شخص رقم لایا ہے۔ اس ہندو تاجر نے کچھ عجیب سے لہجے میں پوچھا کہ رقم تو نہیں لے جانی؟...... میں نے اسے ایک بار پھر بتایا کہ وہ رقم نہ لے جائے۔ یہ سن کر وہ بہت ہی خوش ہوا۔

ایک خاص بات نوٹ فرمائیں۔ میں آپ کو ہندو بنئے کی فطرت کا صحیح عکس دکھاتا ہوں۔ اس ہندو نے یہ سن کر کہ رقم ساتھ نہیں لے جائے گا خوشی کا اظہار کیا لیکن یہ نہ پوچھا کہ اس کا بیٹا اسے زندہ مل بھی جائے گا یا نہیں۔ اسے نوجوان بیٹے کی نسبت بیس ہزار روپیہ زیادہ عزیز تھا۔ ہر ہندو کی ذہنیت بالکل ایسی ہی ہوتی ہے۔

مقررہ روز میں صبح تھانے جانے کی بجائے پرائیویٹ کپڑوں میں تھیٹر کمپنی کے مالک کے ہاں چلا گیا۔ اس کے ساتھ وقت پہلے سے طے کر رکھا تھا۔ اس نے متعلقہ آدمی کو بلا کر کہا کہ مجھے کیا بہروپ دینا ہے۔ ان کے پاس تمام ضروری سامان موجود رہتا تھا۔ یہ تو آپ جانتے ہیں کہ سٹیج ڈرامے میں دو چار روز پہلے جو اداکار بادشاہ کے رول میں سامنے آتا ہے، ہو سکتا ہے اگلے ڈرامے میں وہ ایک پگلا بھکاری بن کر آئے۔ دو آدمیوں نے میرے کپڑے اتروا دیئے اور بوسیدہ اور میلے کچیلے سے کپڑے پہنائے۔ میرے سر کے بالوں کے ساتھ بڑے ہی بھدے سے بال چپکائے۔ میرے چہرے پر انہوں نے کچھ ملا اور پھر چہرے پر داڑھی اور مونچھیں چپکانے لگے۔ میرے ہاتھوں اور بازوؤں پر بھی انہوں نے کوئی محلول مل دیا جس سے میری جلد کا رنگ بھدا اور پھیکا سا ہو گیا۔ اس طرح دو گھنٹے صرف کر کے انہوں نے مجھے ضعیف العمر بھکاری بنا دیا۔ میں نے آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو تھیٹر کمپنی کے مالک کی یہ بات صحیح نکلی کہ میں اپنے آپ کو پہچان نہ سکا۔ مالک نے مجھے خود چل کر بتایا کہ میں کس طرح کندھے آگے کو کر کے اور ذرا جھک کر چلوں گا۔

میں وہاں سے چل پڑا۔ چلنے کا انداز وہی رکھا جو تھیٹر کمپنی کے مالک نے بتایا تھا اور جو میں خود بھی سمجھتا تھا۔ میرے سامنے ایک میل سے کچھ زیادہ سفر تھا۔ میں نے وقت کا حساب کر لیا تھا۔ ابھی خاصا وقت باقی تھا۔ قصبے میں تو میں جھکا جھکا آہستہ آہستہ چلتا گیا۔ قصبے سے باہر جا کر رفتار ذرا تیز کر لی اور جونہی کسی کو اپنی طرف آتے دیکھتا تو میں پھر ضعیف العمر بن جاتا۔ اس طرح میں مقررہ جگہ تک پہنچ گیا۔ وہاں ابھی کوئی نہیں آیا تھا۔ اب میں

اور ہی زیادہ بوڑھا بن گیا اور یوں قدم گھسیٹنے لگا جیسے میں گر پڑوں گا۔

پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ نرداس کا باپ آتا نظر آیا اور کچھ اتنے ہی وقت بعد تین آدمی آئے جن کے ساتھ ایک عورت تھی اور یہ عورت پرانے زمانے کے ڈیزائن کے میلے سے برقعے میں تھی۔ برقعے کا نقاب نیچے تھا۔ میں تھانیدار تھا، میں سمجھ گیا کہ اس برقعے میں نرداس ہے۔ یہ تینوں آدمی دائیں بائیں اور پیچھے دیکھتے آ رہے تھے۔

قریب ہی ایک خشک درخت تھا جس کے صرف ٹہن اور ٹہنیاں تھیں، پتا ایک بھی نہیں تھا۔ ان تینوں آدمیوں نے مجھے دیکھا اور ان میں سے ایک میری طرف آیا۔ میں اس درخت کے نیچے اس طرح بیٹھ گیا جیسے میں گر پڑا ہوں اور وہیں ایک پہلو پر لیٹ گیا۔

''اوئے، تو یہاں کیا کر رہا ہے!''۔۔۔اس آدمی نے کہا۔

میں نے اس طرح کروٹ بدلی جیسے مجھ میں کروٹ بدلنے کی بھی ہمت نہ ہو۔ میں نے لرزتی کانپتی آواز میں کہا۔۔۔''رام بھلی کرے بابا جہاں گر پڑا ہوں وہیں پڑا رہنے دے اور کچھ دے جا بابا، تیرے بچے جئیں''۔۔۔میں پھر کروٹ کے بل ہو گیا اور اس طرح کھانسنا شروع کر دیا جیسے کھانسی کا دورہ پڑ گیا ہو۔ وہ آدمی واپس چلا گیا۔ میں لیٹے لیٹے اسے دیکھتا رہا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو میرے متعلق بتایا ہوگا۔ اتنی دور سے میں سن تو نہیں سکتا تھا کہ اس شخص نے میرے متعلق اپنے ساتھیوں کو کیا بتایا تھا، ان کے اشاروں سے پتہ چلتا تھا کہ میرے متعلق وہ مطمئن ہو گئے ہیں۔

مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ یہ لوگ بڑی جلدی میں ہیں۔ ایسا مجرمانہ لین دین بڑی تیزی سے کیا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک نے نرداس کے باپ کو اشارہ کیا کہ آگے آ جائے۔ دوسرے نے برقعے کا نقاب اٹھایا۔ وہ نرداس کے باپ کو دکھا رہے تھے کہ یہ ہے تمہارا بیٹا۔

وہ مجھ سے تقریباً چالیس پچاس قدم دور تھے۔ اس زمانے میں ڈاکوؤں کے پاس ریوالور ہوتے تھے، عام قسم کے جرائم پیشہ لوگ چاقو یا خنجر پاس رکھتے تھے۔ ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتا تھا کہ ان کے پاس ریوالور ہے یا نہیں۔ خنجر یا چاقو تو لازمی تھے۔

نرداس کا باپ ان سے ابھی دس بارہ قدم دور تھا۔ میں تیزی سے اٹھا۔ میں نے اٹھنے سے پہلے کپڑوں کے اندر سے ریوالور نکال لیا تھا جس میں چھ گولیاں لوڈ تھیں اور

کپڑوں کے اندر میں نے جو بیلٹ باندھ رکھی تھی اس میں بارہ گولیاں تھیں۔ میں نے ریوالور کی پہلی گولی اس طرح فائر کی کہ ان تینوں کے سامنے تقریباً ڈیڑھ دو گز دور زمین پر لگی۔ تینوں نے میری طرف دیکھا۔

''جہاں ہو وہیں رہو''۔۔۔میں نے للکار کر کہا۔

انہوں نے میرے ہاتھ میں ریوالور دیکھ لیا تھا۔ میں بڑی تیزی سے ان کی طرف چلا۔ ان میں سے ایک ڈر کر بھاگ اٹھا۔ میں نے اس کی ٹانگوں پر گولی چلائی۔ ٹانگوں پر اس لئے کہ میں ان سب کو زندہ پکڑنا چاہتا تھا۔ گولی اس کی ران میں لگی اور وہ ران پر ہاتھ رکھ کر گر پڑا اور چلانے لگا۔ اس کے ساتھیوں نے اسے دیکھا تو وہ اتنا ڈرا کہ ہاتھ اوپر کر کے زور زور سے ہلانے اور چلانے لگے کہ میں اور گولی فائر نہ کروں۔

میں وہاں اکیلا نہیں گیا تھا۔ تقریباً نصف میل پیچھے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چھ کانسٹیبلوں کی گارد چھپی بیٹھی تھی۔ میں نے یہ انتظام پہلے ہی کر دیا تھا اور انہیں کہا تھا کہ میری گولی فائر ہوتے ہی دوڑ کر مجھ تک پہنچیں۔ میں نے پیچھے دیکھا، میری گارد دوڑی آ رہی تھی۔ پوری گارد رائفلوں سے مسلح تھی۔ اللہ نے میری دعا قبول فرمائی تھی اور میری سکیم سو فیصد کامیاب رہی تھی۔ ملزم تو پہلے ہی ہتھیار ڈال چکے تھے۔ گارد نے آ کر انہیں ہتھکڑیاں لگا لیں۔ برقعے میں نرداس ہی تھا۔ اس کا بیان تھانے میں جا کر لینا تھا۔ جس ملزم کی ران سے گولی گزر گئی تھی اس کے زخم پر اس کی پگڑی اتار کر باندھ دی اور کانسٹیبل اسے سہارا دے کر چلانے لگے۔ اڑھائی تین فرلانگ گئے ہوں گے تو دور سے ایک خالی تانگہ جاتا نظر آیا۔ آواز دے کر اسے بلایا۔ زخمی ملزم کو اس میں بٹھایا، میں خود بھی تانگے میں بیٹھا اور نرداس اور اس کے باپ کو بھی تانگے میں بٹھا لیا اور گارد سے کہا کہ وہ تھانے پہنچیں۔

بات لمبی کرنے کی بجائے میں اس مقام پر آ جاتا ہوں جہاں سب کے بیانات سے انکشاف ہوا کہ جرم کا ارتکاب کس طرح کیا گیا تھا۔ نرداس کی حالت تو بہت ہی بری تھی۔ اس پر ملزموں نے کوئی تشدد نہیں کیا تھا سوائے اس کے کہ اسے قید میں رکھا اور اس کے ذہن پر یہ اذیت ناک بوجھ رہتا تھا کہ اسے قتل کر دیا جائے گا۔ میں اسے اپنے پاس بٹھا کر شفقت اور پیار سے نارمل حالت میں لایا اور کہا کہ اس پر جو بیتی ہے وہ تفصیلاً بتا دے۔

اس کے بیان سے یہ تصدیق ہو گئی کہ جگن ناتھ کی بہن شانتی کے ساتھ اس کی محبت

چل رہی تھی اور ان کی ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ جگن ناتھ کو پتہ چل گیا۔ جگن ناتھ کے دوست کا بیان بالکل صحیح نکلا کہ اس نے اپنی بہن کو مارا پیٹا تھا لیکن نرداس کو ذرا سا اشارہ بھی نہیں دیا تھا کہ اس کے خلاف اسے کوئی گلہ شکوہ ہے۔ نرداس کو دو دوستوں نے خبردار کیا تھا کہ جگن ناتھ سے بچ کر رہے، یہ ضرور کوئی اوچھا وار کرے گا۔

نرداس نے یہ بھی بتایا کہ شانتی نے جگن ناتھ کو کہہ دیا تھا کہ بہتر ہے کہ مجھے جان سے مار ڈالو، میں زندہ رہی تو عمر نرداس کے ساتھ ہی گزاروں گی۔ جگن ناتھ کے لیے یہ توہین اور اتنی سخت چوٹ قابل برداشت نہیں تھی۔

یہ تھی وجہ جگن ناتھ اور نرداس کی عداوت کی۔ یہ جرم اس طرح سرزد ہوا کہ جگن ناتھ نے لڑکوں کو اکٹھا کر کے شکار کا پروگرام بنایا اور نرداس سے بڑے پیار سے کہا کہ اس کے بغیر وہ شکار پارٹی کو نامکمل سمجھے گا۔ نرداس شکار پر چلا گیا۔ اس سے آگے نرداس نے جو بیان دیا وہ میں آپ کو سنا چکا ہوں کہ ایک ہرن پر گولی چلائی گئی، ہرن زخمی ہو کر بھاگا اور لڑکوں نے اس کا تعاقب کیا۔

نرداس نے اس سے آگے اپنے بیان میں کہا کہ ہرن کے تعاقب میں لڑکے بکھر گئے۔ نرداس جگن ناتھ کے قریب رہا۔ میرا خیال یہ ہے کہ نرداس جگن ناتھ کے قریب نہیں رہا تھا بلکہ جگن ناتھ کی کوشش یہ تھی کہ وہ نرداس کے قریب رہے کیونکہ وہ نرداس کو انتقاماً اغوا کرنا چاہتا تھا۔ بہرحال نرداس کا بیان یہ تھا کہ وہ جگن ناتھ کے قریب رہا جو اس کی سمجھ کے مطابق اتفاقیہ بات تھی۔

جگن ناتھ نے نرداس سے کہا کہ لڑکے بڑے بیوقوف ہیں، ویسے ہی اِدھر اُدھر بھاگتے دوڑتے پھر رہے ہیں۔ پھر اس نے ٹیکریوں کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ تمہارے ساتھ کتا بھی ہے اور تم گھوڑی پر سوار ہو، تم ادھر جاؤ، میں نے خود دیکھا ہے کہ ہرن ٹیکریوں کے پیچھے چلا گیا ہے اور اس کی دوڑنے کی رفتار کم ہو گئی ہے، میں دوسری طرف سے آتا ہوں اور اس طرح ہم دونوں ہرن کو گھیر لیں گے۔

نرداس اس طرف چلا گیا۔ میں نے بتایا ہے کہ وہ علاقہ کیسا تھا۔ ایک طرف اونچی ٹیکریاں، کھڈ اور اس کے ساتھ ہی گھنا جنگل تھا۔ نرداس وہاں گیا تو سب کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اسے ہرن کہیں بھی نظر نہ آیا۔ تین آدمی سامنے آگئے۔ نرداس گھوڑی کو روک

کر اِدھر اُدھر ہرن کو دیکھ رہا تھا۔ وہاں ہرن کا نام ونشان نہ تھا۔ نرداس نے ان آدمیوں سے پوچھا کہ انہوں نے ایک زخمی ہرن تو نہیں دیکھا!...... تینوں آدمی اس کے قریب آگئے۔ ایک نے پوچھا کہ ہرن کس طرح زخمی ہوا تھا۔ اس آدمی نے بالکل قریب آکر گھوڑی کی لگام پکڑ لی۔ دوسرے نے کہا کہ نیچے آؤ تمہیں ہرن دکھائیں۔ نرداس کو تو ذرا سا بھی شک نہ تھا کہ یہ آدمی اسی کے انتظار میں یہاں کھڑے ہیں، وہ گھوڑی سے اتر آیا اور تینوں نے اسے دبوچ لیا۔ ایک نے اس کے منہ پر اس طرح کپڑا ڈال کر پیچھے گانٹھ لگا دی کہ اس کا منہ بھی بند ہو گیا اور آنکھیں بھی۔

''خاموشی سے ہمارے ساتھ چلے چلو''___ایک نے کہا___''نہیں تو تمہیں مارتے پیٹتے لے جائیں گے، گھسیٹیں گے بھی اور پھر اٹھا لیں گے''۔

ایک آدمی نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ کتے اور گھوڑی کو ڈنڈے مار کر بھگا دو۔

نرداس آخر ہندو تھا، بہت ہی خوفزدہ ہوا۔ ہندو نہ ہوتا، کوئی بھی ہوتا تو اس صورتِ حال میں وہ اتنا ہی خوفزدہ ہوتا۔

نرداس ان کے ساتھ چلتا گیا۔ دو آدمیوں نے اسے دائیں بائیں سے پکڑ رکھا تھا اور وہ انہی کے سہارے چلتا گیا۔ اس کے اندازے کے مطابق ایک میل سے زیادہ چلے ہوں گے تو اسے ایک مکان میں داخل کیا گیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر اسے چارپائی پر بٹھا دیا گیا۔ یہ لوگ اتنے دلیر تھے کہ انہوں نے اپنے چہروں کو چھپانے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی تھی۔ انہوں نے نرداس کے چہرے سے کپڑا کھول دیا۔ نرداس ان کے آگے بہت رویا اور منتیں کیں لیکن وہ تینوں ہنستے مسکراتے رہے اور اس کی ایک نہ سنی۔

اس کے بعد اسے یہاں کھانا پانی ملتا رہا۔ رات کو ایک آدمی اس کے کمرے میں سوتا تھا۔ دن کے وقت کمرہ باہر سے بند ہوتا تھا۔ یہ کوئی شہر یا گاؤں نہیں تھا۔ نرداس کو اندازہ تھا کہ یہ کوئی الگ تھلگ کچا مکان ہے۔ اسے یہ اندازہ اس طرح ہوا کہ باہر کسی انسان کی یا مویشی کی آواز نہیں آتی تھی۔

نرداس کو تو جیسے وقت کا بھی احساس نہیں رہا تھا۔ یہ انتہائی خوفزدگی کی علامت تھی۔ اس کے اندازے کے مطابق پانچ چھ دنوں بعد رات کے وقت دو آدمی آئے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے بھی اسے ایک کمرے میں بند رکھا اور ایک روز برقعہ پہنا کر

اپنے ساتھ لے گئے اور پھر اس جگہ اس نے اپنے باپ کو دیکھا جو میں پہلے بیان کر چکا ہوں اور پھر وہاں جو کچھ ہوا وہ بھی میں نے سنا دیا ہے۔

نرداس کو میں نے اس کے باپ کے حوالے کر دیا۔ اسے سختی سے کہہ دیا کہ کسی کو نہ بتائے کہ اس نے کیا بیان دیا ہے اور جگن ناتھ کو تو بالکل ہی نہ بتائے...... میرے ہاتھ میں اب تین ملزم تھے جنہیں عین موقعہ پر پکڑا تھا۔ میرا کام آسان ہو گیا تھا۔ یہ جھوٹ تو بول ہی نہیں سکتے تھے۔ ان میں سے ایک کو اندر بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ یہ جواں سال آدمی میرے لیے اجنبی تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کوئی مشہور جرائم پیشہ ہوں گے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں ان کے چہروں سے واقف ہوتا۔ صرف ایک ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا کہ وہ ان میں سے دو کو پہچانتا ہے اور یہ ساتھ والے تھانے کے علاقے میں چھوٹی موٹی وارداتیں کرتے ہیں۔

یہ جو میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا، اس نے پہلی بات یہ کہی کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنا لوں۔ مجھے وعدہ معاف گواہ کی ضرورت ہی نہیں تھی لیکن اس سے پورا بیان لینے کے لئے میں نے کہہ دیا کہ وہ اپنے آپ کو وعدہ معاف گواہ سمجھے اور مکمل بیان دے دے۔ ظاہر ہے کہ اس کے ساتھ میری بہت باتیں ہوئی ہوں گی جو ساری کی ساری نہیں سنائی جا سکتیں۔ میں ضروری باتیں پیش کرتا ہوں۔

اس نے سنایا کہ جگن ناتھ کے خاندان کی زرعی اراضی اتنی زیادہ ہے جس کا صحیح اندازہ شاید انہیں خود بھی نہیں۔ ان کے مزارعے اور نوکر چاکر بہت ہی زیادہ تھے۔ ان میں اچھے بھی تھے اور برے بھی تھے اور کچھ جرائم پیشہ قسم کے بھی تھے۔ ایسے جاگیردار چند ایک بدمعاش خود بھی رکھتے ہیں جو مزارعوں وغیرہ کو کنٹرول میں رکھتے ہیں اور اپنے آقاؤں کے دشمنوں کے خلاف بھی کام آتے ہیں۔

اس ملزم نے اپنے اقبالی بیان میں کہا کہ انہوں نے یہ لڑکا جگن ناتھ کے تین مزارعوں سے ایک ہزار روپے پر خریدا تھا۔ یہ تینوں مزارعے جگن ناتھ کے باپ کے پالے ہوئے غنڈے تھے اور وہاں بہت عیش کرتے تھے۔ ان کا دوستانہ تینوں ملزموں کے ساتھ تھا۔ ایک روز اغوا کرنے والے دو آدمی ان ملزموں سے ملے اور باتوں باتوں میں نرداس کا ذکر آ گیا۔ ان کی آپس میں راز داری چلتی تھی۔ اغوا کرنے والوں نے صاف بتا دیا کہ جاگیردار کے بیٹے جگن ناتھ نے ایک لڑکے کو اغوا کرایا ہے اور اسے قتل کرنا ہے لیکن انہوں

نے لڑکے کو فوری طور پر قتل نہ کیا، پانچ چھ دن اپنے پاس بند رکھا۔ وہ دراصل اس لڑکے سے کچھ زیادہ رقم کمانے کی سوچ رہے تھے۔

یہ تو اغوا کرنے والوں سے مجھے پوچھنا تھا کہ انہوں نے اتنا انتظار کیوں کیا، یہاں یہی ذہن میں رکھیں کہ انہوں نے نرداس کو قتل نہ کیا۔ انہوں نے پانچ چھ دن انتظار کیا۔ ان دوسرے جرائم پیشہ ملزموں نے فوراً ایک بات سوچ لی اور اغوا کرنے والے ملزموں کے ساتھ سودا طے کر لیا کہ وہ اسے قتل کر دیں گے۔ اس کی اجرت دے دیں۔ انہوں نے تین ہزار روپے مانگے لیکن سودا ایک ہزار پر طے ہو گیا۔ دراصل ان تینوں ملزموں نے اغوا کرنے والے ملزموں سے کہا تو یہ تھا کہ وہ اسے قتل کریں گے لیکن انہوں نے ارادہ یہ کیا تھا کہ نرداس کے باپ سے رقم وصول کر کے لڑکا اس کے حوالے کر دیں گے۔

میں نے ابتدا میں کہا ہے کہ جرائم پیشہ لوگ بڑے ہی ذہین اور باریک بین ہوتے ہیں لیکن کبھی ایسی غلطی کر بیٹھتے ہیں کہ سیدھے جیل میں جا پہنچتے ہیں۔ مجرمانہ زندگی میں ایک مقام آ جاتا ہے جہاں مجرم اس خوش فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انہیں کوئی پکڑ ہی نہیں سکتا۔ ایسی ہی غلطی ان سے ہو گئی۔ دراصل ان کے دماغوں پر بیس ہزار روپیہ غالب آ گیا تھا اور اس سے ان کی عقل ماری گئی تھی۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ اغوا برائے تاوان کا جرم کس طرح کیا جاتا ہے اور لین دین کس طرح ہوتا ہے۔ انہوں نے کبھی سنا تھا کہ ایک شخص نے یہ واردات کی تھی اور اسے بڑی آسانی سے تیس ہزار روپیہ مل گیا تھا۔

وہ ایک ہزار روپیہ نقد دے کر نرداس کو لے گئے۔ اغوا کرنے والے کو تو معلوم ہی نہیں تھا کہ ایک ہزار دے کر وہ بیس ہزار کمائیں گے..... میں نے آپ کو نرداس کا بیان سنایا ہے۔ اس نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ اسے اس کمرے کی قید سے نکال کر ایک اور جگہ لے گئے تھے لیکن اسے ان لوگوں کے لین دین کا کچھ علم نہیں۔

وہ رقعہ جو نرداس کے گھر پھینکا گیا تھا اس ملزم نے لکھا تھا جو میری گولی سے زخمی ہو گیا تھا۔ نرداس کے گھر اس ملزم نے رقعہ پھینکا تھا جو مجھے بیان دے رہا تھا۔ پھر اس نے جا کر اگلے روز دیکھا تھا کہ نرداس کے گھر کے دروازے کے ساتھ سفید کپڑا لٹکا ہوا ہے یا نہیں۔ کپڑا لٹکا ہوا تھا۔ مقررہ دن اور وقت انہوں نے کہیں سے سفید برقعہ لے کر نرداس پر ڈالا اور اسے مقررہ جگہ پر لے گئے اور پکڑے گئے۔ میرے متعلق انہیں پورا یقین تھا کہ میں کوئی

بہت بوڑھا اور کمزور فقیر ہوں اور دنیا کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں۔

اس ملزم کے دوسرے ساتھی نے بھی بالکل یہی بیان دیا۔ اس نے خود تو وعدہ معاف گواہ بننے کی درخواست نہ کی، میں نے خود ہی اسے یہ لالچ دے کر پورا بیان لے لیا۔ اس نے اپنے ساتھی کے بیان کی تصدیق کر دی۔ پھر میں ہسپتال چلا گیا۔ ملزم جو زخمی ہوا تھا اسے ہسپتال بھجوا دیا تھا۔ وہاں جا کر پتہ چلا کہ میرے ریوالور کی گولی اس کی ران کے پٹھے میں سے گزری تھی، ہڈی بچ گئی تھی۔

میں نے اسے کہا کہ اس نے جھوٹ بولا تو میں ڈاکٹر سے کہہ کر اس کے زخم میں زہریلی دوائی ڈالوا دوں گا جس سے زخم خراب ہو جائے گا اور اس کی ٹانگ کاٹ دی جائے گی۔ اس نے تو رونا شروع کر دیا۔ پھر اس نے اپنے ساتھیوں کو گالیاں دیں اور کہا کہ وہ کہتے تھے کہ بڑی آسانی سے بیس ہزار روپیہ مل جائے گا۔

میں نے ان تینوں کی نشاندہی پر اغوا کرنے والے ملزموں کو بھی گرفتار کر لیا اور پھر نرداس کو ساتھ لے جا کر وہ کمرہ دیکھا جہاں اسے قید میں رکھا گیا تھا۔ پھر ملزموں کی اپنی نشاندہی پر وہ مکان جا کر دیکھا جہاں اسے دوسری پارٹی نے قید رکھا تھا۔

یہ تو پولیس کی کارروائیاں ہیں۔ شہادت اکٹھی کرنے کے لیے اور پھر اسے قابل اعتماد بنانے کے لیے پولیس کو بڑے جتن کرنے پڑتے ہیں، کچھ استادی طریقے لڑانے ہوتے ہیں۔ یہ کارروائیاں مکمل ہوتے دو دن لگ گئے۔ اس کے بعد میں نے جگن ناتھ کو اپنے پاس بٹھایا۔ اس کے پاس جھوٹ بولنے کا کوئی جواز رہ ہی نہیں گیا تھا۔ اس نے ملزموں کی دونوں پارٹیوں کو دیکھ لیا تھا اور پھر اس نے نرداس کو بھی دیکھا تھا۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے جرم سے پردے اٹھ گئے ہیں۔

میں نے اتنے دن جگن ناتھ کو تھانے میں ہی پابند رکھا تھا اور اس دوران اس کا باپ تین چار مرتبہ آیا اور میں نے ہر بار اسے تسلیاں دے کر رخصت کر دیا تھا۔ بالائی انگریز افسروں نے اس کی کوئی مدد نہیں کی تھی اور اب میں نے اسے بتایا کہ اس کے بیٹے نے کیا جرم کیا ہے تو اس نے رشوت پیش کرنی شروع کر دی۔ میں نے رشوت لینے سے انکار کیا تو اس نے مجھے دھمکیاں دیں جو میں نے فون پر اپنے انگریز ڈی ایس پی تک پہنچا دیں۔ ڈی ایس پی نے اسے بلا کر بہت سی ذلیل کیا اور اس طرح میں اس شخص سے محفوظ ہو گیا۔

کیس کورٹ میں گیا۔ میں نے مقدمہ بڑی محنت سے تیار کیا تھا۔ اغوا کرنے والوں کو اور پھر اسے ایک ہزار روپے پر خرید لے جانے والوں کو پانچ پانچ سال سزائے قید ملی لیکن جگن ناتھ بری ہو گیا کیونکہ ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ اس نے اپنے ان تین مزارعوں سے کہا تھا کہ وہ نرداس کو اغوا کر کے قتل کر دیں۔ کسی کا صرف یہ کہہ دینا کہ اسے یہ جرم کرنے کی ترغیب فلاں نے دی تھی، سزا دلانے کے لئے کافی نہیں ہوتا۔

جگن ناتھ کی بہن شانتی نے میرے نام جو گمنام خط لکھا تھا اس میں اس نے لکھا تھا کہ آپ نرداس کو برآمد کر لیں تو ایک صبح آپ اپنے گھر کے صحن میں نوٹوں کی گٹھی پڑی پائیں گے جو میں رات کے وقت آپ کے گھر پھینک جاؤں گی۔

میں نوٹوں کی اس گٹھی کا منتظر ہی رہا اور صبحیں طلوع ہوتی رہیں۔ نوٹوں کی گٹھی تو میرے صحن میں نہ گری البتہ مقدمہ ختم ہوا تو ایک بجلی مجھ پر گری۔

مقدمہ ختم ہونے کے پندرہ سولہ دنوں بعد جگن ناتھ کا باپ میرے پاس آیا اور یہ رپورٹ لکھوائی کہ اس کی بیٹی شانتی غائب ہو گئی ہے اور اس نے شک نرداس کے خلاف لکھوایا۔ یہاں سے ایک اور ڈرامہ شروع ہو گیا جو کوشش کروں گا کہ جلدی پیش کروں۔

***

جاگیردار کی بیٹی، کمالے کا بالکا

اسی کتاب میں میری ایک تفتیشی کہانی ۔۔۔ ''جاگیردار کی بیٹی، تھانیدار کا بہروپ''۔۔۔ شائع ہوئی ہے جس کے اختتامیہ پر میں نے یہ اشارہ دیا تھا کہ جگن ناتھ کی بہن شانتی نے میرے نام جو خط لکھا تھا اس میں اس نے یہ لکھا تھا کہ آپ نرداس کو برآمد کر لیں تو صبح آپ اپنے گھر کے صحن میں نوٹوں کی گٹھی پڑی پائیں گے جو میں رات کے وقت آپ کے گھر پھینک جاؤں گی۔

میں نوٹوں کی اس گٹھی کا منتظر ہی رہا اور صبحیں طلوع ہوتی رہیں۔ نوٹوں کی گٹھی تو میرے صحن میں نہ گری البتہ مقدمہ ختم ہوا تو ایک بجلی مجھ پر گری۔ میں نے اس کہانی کے آخر میں وعدہ کیا تھا کہ یہاں سے ایک اور ڈرامہ شروع ہو گیا جو کوشش کروں گا کہ جلدی پیش کروں...... لیجئے، میں اس نئے ڈرامے کے ساتھ حاضر ہو گیا ہوں۔ بہتر ہے آپ کو دشواری نہ ہو۔ میں بار بار پچھلی کہانی کے کسی نہ کسی واقعہ کا حوالے دے کر آپ کا اور اپنا وقت ضائع کرنے سے گریز کروں گا۔

نرداس کے اغوا وغیرہ کے مقدمے میں ملزموں کو سزائیں ہو گئیں اور میرا ایک مقدمہ بڑی کامیابی سے اختتام پذیر ہوا۔ کسی تھانیدار کا تیار کیا ہوا مقدمہ اس طرح ختم ہو کہ ملزموں کو سزا مل جائے تو وہ تھانیدار ہی نہیں بلکہ اس کے تھانے کا سارے کا سارا عملہ جشن مناتا ہے۔ میں بھی جشن منانے کے موڈ میں تھا۔ اگر ملزم بری ہو جاتے تو جگن ناتھ کا جاگیردار باپ مجھے بہت نقصان پہنچاتا۔ وہ اثر و رسوخ والا آدمی تھا، میرے خلاف غلط مقدمہ کورٹ میں پیش کرنے کی پاداش میں محکمانہ کارروائی کروا دیتا۔

میرے لیے اصل خوشی تو یہی تھی کہ میری سروس داغدار ہونے سے بچ گئی تھی لیکن یہ خوشی پندرہ سولہ دن تک ہی رہی اور مجھ پر وہ بجلی گری جس کا میں نے نرداس والی کہانی میں

اشارہ دیا تھا۔ یہ اس طرح ہوا کہ ایک صبح میں ابھی گھر میں تھانے کو جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے اطلاع دی کہ یہی جاگیردار یعنی جگن ناتھ کا باپ آیا ہے، اس نے کچھ بتایا تو نہیں لیکن اس کی جذباتی اور مزاجی کیفیت بتاتی ہے کہ کوئی خاص واقعہ ہو گیا ہے اور وہ کہتا ہے کہ آپ کو جلدی تھانے لایا جائے۔

یقین کیجئے کہ میں ملزموں اور مشتبہوں کی طرح بھاگم بھاگ تھانے پہنچا اور اس شخص سے یوں ملا جیسے یہی میرا ڈی ایس پی ہو۔ اس کے چہرے کا تاثر دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ یہ کافر کوئی بری ہی خبر لایا ہے۔

''شانتی لاپتہ ہو گئی ہے''۔۔۔ اس نے یوں کہا جیسے ابھی رو پڑے گا۔

میں اپنا اس وقت کا تاثر بیان کرتا ہوں۔ یہ شخص اس طرح شکست خوردہ اور غمناک لہجے میں بات کرنے والا آدمی نہیں تھا وہ تو حاکموں کی طرح بات کیا کرتا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ بیٹی چاہے تو اپنے غریب باپ کا بھی سر اونچا کر سکتی ہے اور چاہے تو اس قسم کے جابر اور متکبر باپ کا سر جھکا سکتی ہے۔ اس بیٹی نے لاپتہ ہو کر اس شخص کی ساری رعونت ختم کر ڈالی تھی۔

کسی جوان لڑکی کے لاپتہ ہو جانے کی رپورٹ پر تھانیدار جو سوال پوچھا کرتے ہیں وہ میں نے پوچھ ڈالے۔ بڑا اچھا اتفاق تھا کہ میں اس لڑکی کے پس منظر سے پوری طرح واقف تھا۔ مجھے توقع تھی کہ یہ شخص نرداس کے خلاف شک لکھوائے گا، بالکل ایسے ہی ہوا اس نے گمشدگی کی رپورٹ کے بعد پورے وثوق سے کہا کہ لڑکی نرداس کے ساتھ چلی گئی ہے۔

''لیکن یہ سوچ لیں راؤ جی!''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''آپ رپورٹ اس طرح لکھیں کہ لڑکی اپنی مرضی سے نہیں گئی بلکہ اسے اغوا کیا گیا ہے۔ میں اس لڑکے نرداس کو ایسے انجام تک پہنچاؤں گا کہ اس کا سارا خاندان باقی عمر پچھتاتے اور روتے گزارے گا''۔

''آپ جو بھی رپورٹ دیں گے وہ میں آپ کے ہی الفاظ میں لکھ لوں گا''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''لیکن تفتیش میں جو کچھ سامنے آئے گا، میرا کیس اسی بنیاد پر کھڑا ہو گا۔ قانون میرے اور آپ کے چاہنے کی پرواہ نہیں کرتا۔ میں آپ کو یہیں بتا دیتا ہوں کہ میں قانون کی خلاف ورزی نہیں کروں گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میری تفتیش کی لپیٹ میں میرا

اپنا سگا بھائی بھی آ گیا تو میں اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہیں کروں گا، آپ کی بیٹی کو زمین کے نیچے سے بھی نکال کر آپ کی گود میں ڈال دوں گا''۔

''میں ایسی بیٹی کے منہ پر تھوکنا بھی گوارہ نہیں کرتا''—— اس جاگیردار نے یکلخت جیسے بیدار ہو کر کہا—— ''اس بیٹی نے تو میرا سر جھکا دیا ہے۔ میں وہ شخص ہوں جس نے مندر میں جا کر بھی کبھی سر نہیں جھکایا۔ اس بداخلاق بیٹی نے میرے اکلوتے بیٹے کو جیل تک تو پہنچا دیا تھا لیکن بیٹے کے خلاف کوئی شہادت نہ ملی اس لیے بچ گیا۔ اگر بیٹی مجھے مل گئی تو شاید میں اسے زندہ نہ چھوڑوں''۔

یہ شخص اپنے بیٹے کی یوں بات کر رہا تھا جیسے وہ بڑا ہی شریف لڑکا ہو اور اس نے کوئی جرم نہ کیا ہو۔ اس کی خوش قسمتی یہ تھی کہ اس کے بیٹے نے جرم کیا نہیں بلکہ دوسروں سے کرایا تھا اور اس کا بھی کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے سزا پا گئے اور وہ بچ گیا۔

اس جاگیردار کو اپنی فرعونیت پر اتنا ناز تھا کہ اسے یہ بھی احساس نہیں تھا کہ وہ ایک تھانیدار کے ساتھ بات کر رہا ہے اور اس کی باتوں سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اس کی بیٹی اغوا نہیں ہوئی بلکہ خود گئی ہے۔

اس نے نرداس کا نام لے کر مجھے شک میں ڈال دیا تھا۔ مجھے پچھلی واردات کی تفتیش میں پتہ چلا تھا کہ نرداس اور شانتی نے گھر سے بھاگ جانے کا پروگرام بنا رکھا تھا۔ وہ نرداس کا نام نہ لیتا تو بھی میں اسی پر شک کرتا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے معلوم کروایا ہے کہ نرداس بھی گھر سے غائب ہے یا نہیں؟

''نہیں!''—— اس نے جواب دیا—— ''یہ کام آپ کے کرنے والے ہیں۔ آپ اپنے انداز سے تفتیش کریں''۔

مجھے یقین کی حد تک شک تھا کہ شانتی اغوا نہیں ہوئی خود گئی ہے۔ یہ شک ذہن میں رکھ کر میں نے اس کے اس جاگیردار باپ سے پوچھا کہ وہ جوتی، چپل یا سلیپر پہن کر گئی ہے یا گھر میں وہ جو بھی جوتی یا چپل پہنتی ہے وہ پلنگ کے پاس پڑی تھی؟

''پلنگ کے پاس اس کی کوئی جوتی نہیں پڑی تھی''—— باپ نے جواب دیا۔

لڑکی کو اگر سوتے میں اٹھایا جائے تو اٹھانے والے ایسا اہتمام نہیں کیا کرتے کہ لڑکی کو جوتی پہنا لیں۔ شانتی کے باپ کی رپورٹ یہ تھی کہ شانتی رات اپنے کمرے میں سو گئی

تھی، صبح کمرے میں نہیں تھی۔ میرے ایک سوال کے جواب میں اس نے بتایا کہ صبح دیکھا کہ باہر والا دروازہ اندر سے کھلا ہوا تھا۔

''گھر سے کچھ رقم یا زیور بھی گئے ہیں؟''—— میں نے پوچھا۔

''نہیں!''—— اس نے جواب دیا—— ''یہ ہم نے سب سے پہلے دیکھا تھا۔ کوئی چوری چکاری نہیں ہوئی''۔

یہ جواب سن کر میں کچھ اور ہی سوچ میں الجھ گیا۔ مجھے یاد تھا کہ پچھلی واردات کی تفتیش کے دوران نرداس نے مجھے بتایا تھا کہ شانتی نے اس کے ساتھ گھر سے بھاگنے کا جو پروگرام بنایا تھا اس میں یہ بھی تھا کہ شانتی گھر سے جتنی بھی رقم اور زیور اڑا سکی اڑا لائے گی اور یہ مال نئی جگہ جا کر آئندہ زندگی بنانے کے کام آئے گا لیکن اس کا باپ کہہ رہا تھا کہ رقم بھی نہیں گئی زیور بھی نہیں گیا۔ میں یہی کہہ سکتا تھا کہ شانتی کو رقم اور زیور کی چوری کا موقع نہیں ملا یا وہ نرداس کے ساتھ نہیں گئی۔

یہ تو ان لوگوں کے گھر جا کر دیکھنا تھا کہ لڑکی اگر اغوا ہوئی ہے تو اسے اس کے کمرے سے اغوا کیا بھی جا سکتا تھا یا نہیں۔ یہ مجھے ممکن نظر نہیں آتا تھا...... مجھے احساس ہوا کہ میں وقت ضائع کر رہا ہوں۔ فوری طور پر تو مجھے یہ دیکھنا تھا کہ نرداس بھی غائب ہے یا نہیں ہے۔ میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور شانتی کے باپ کی موجودگی میں کہا کہ نرداس گھر میں ہے یا جہاں کہیں بھی ہے اسے ساتھ لے آئے اور اگر ان کا باپ یا بھائی وغیرہ کہیں کہ وہ شہر سے کہیں باہر چلا گیا ہے یا بتائے بغیر کہیں غائب ہو گیا ہے تو اس کے باپ کو ساتھ لے آئے۔ پچھلی واردات کی وجہ سے میرے سٹاف کے کئی ایک آدمی نرداس، اس کے باپ اور اس کے بڑے بھائی کو بڑی اچھی طرح جانتے پہچانتے تھے اور اس کے گھر سے بھی واقف تھے۔

شانتی کا باپ میرے پاس بیٹھا رہا اور شانتی کے متعلق ہی زیادہ تر باتیں ہوتی رہیں۔ میں نے اپنا انداز بے تکلف دوستوں جیسا رکھا لیکن میں اس کی نیت اور اپنے کام کی کچھ دیگر باتیں اس کے سینے سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ تو نفرت کی حد تک اپنی اس بیٹی کو ناپسند کرتا تھا۔ اس نے بھولے سے بھی ایسے افسوس کا اظہار نہ کیا کہ اس کی بیٹی کو نہ جانے کون اغوا کر کے لے گیا ہے اور بے چاری نہ جانے کس حال میں ہو گی۔

میں نے اس کی دوسری بیٹیوں کے متعلق بھی کچھ باتیں کیں تو دیکھا کہ یہ شخص دوسری بیٹیوں کو بھی اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ صرف اپنے بیٹے جگن ناتھ کی تعریفیں کرتا اور یہ تاثر دے رہا تھا کہ جگن ناتھ بڑا ہی دانشمند اور بڑے اچھے کردار کا لڑکا ہے۔ یہ تو میں ہی جانتا تھا یا اس شہر کے لوگ جانتے تھے کہ جگن ناتھ جو جگو کہلاتا تھا، بڑا ہی گھٹیا اور اوچھا لڑکا تھا۔ ہندو ویسے بھی لڑکیوں کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔

مجھے اس کی دوستانہ باتوں سے یہ پتہ چل گیا کہ اس شخص کو معلوم ہے کہ اس کی بیٹی خود گئی ہے اور اسے کوئی زبردستی نہیں لے گیا۔ میں نے اسے ابھی تک نہیں کہا تھا کہ اس کا یہ شک محض وہم ہے کہ اس کی بیٹی کو اغوا کیا گیا ہے۔ ابھی تو میں خود بھی کوئی رائے نہیں دے سکتا تھا، البتہ شانتی کا باپ صرف یہ زور دے رہا تھا کہ اس کی بیٹی کو نرداس لے گیا ہے اور یہ جبری اغوا کی واردات ہے۔ میں بڑی بے تابی سے نرداس کا انتظار کر رہا تھا لیکن ہیڈ کانسٹیبل زیادہ ہی وقت ضائع کر رہا تھا۔ نرداس کا گھر دور نہیں تھا۔ چھوٹا سا تو یہ قصبہ تھا۔ میں نے اس جاگیردار کو باتوں میں الجھائے رکھا۔

ہیڈ کانسٹیبل تقریباً نصف گھنٹے بعد آیا۔ میری میز کرسی دفتر میں ایسی جگہ رکھی تھی کہ مجھے تھانے کے احاطے کا گیٹ نظر آتا تھا۔ میں نے دور سے ہی دیکھ لیا کہ ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ نرداس کی بجائے اس کا باپ آرہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ نرداس بھی لاپتہ ہے اور اس کا باپ مجھے یہی بتانے آیا ہے کہ نرداس گزشتہ رات کچھ بتائے بغیر کہیں چلا گیا ہے۔ میں نے شانتی کے باپ کو بتا دیا اور ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ اسے وہ اپنی بارک میں بٹھائے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ دونوں باپوں کا آمنا سامنا ہو۔

ہیڈ کانسٹیبل نرداس کے باپ کو میرے سامنے لے آیا اور میرے پاس بٹھا کر چلا گیا۔ میں نے اس باپ سے پوچھا کہ نرداس کیوں نہیں آیا۔

''خود ہی چل کر دیکھ لیں صاحب!''ـــ اس نے بوجھل سی آواز میں جواب دیاـــ ''آج تیسرا دن ہے بخار میں پڑا جل رہا ہے...... اب نرداس کی آپ کو کیا ضرورت آپڑی ہے صاحب؟...... میں یہ پوچھنے چلا آیا ہوں کہ اسے تھانے حاضر کرنا بہت ضروری ہے تو تانگے میں ڈال کر لے آتا ہوں۔ ہماری گلی اتنی کشادہ ہے کہ تانگہ آسانی سے دروازے تک جا سکتا ہے''۔

میں نے پوچھا کہ علاج کس کا ہو رہا ہے تو اس نے ایک ڈاکٹر کا نام لیا جو ہندو تھا اور قابل ڈاکٹر مانا جاتا تھا۔ اس شخص سے مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ جھوٹ بولے گا۔ میں نے اس کا بیٹا اپنے آپ کو خطرے میں ڈال کر برآمد کیا تھا۔ یہ تو میرا احسان مند تھا پھر بھی تصدیق ضروری تھی۔ میں نے اے ایس آئی کو بلایا۔ نرداس کے باپ کو باہر نکال دیا۔ اے ایس آئی کو بتایا کہ یہ واردات ہے اور نرداس کا باپ یہ خبر لایا ہے، اے ایس آئی جائے اور ایک تو اس ڈاکٹر سے ملے جو اس لڑکے کا علاج کر رہا ہے اور اس سے پوچھے کہ نرداس کو کیا تکلیف ہے۔ پھر نرداس کے گھر جا کر دیکھے کہ وہ واقعی بیمار ہے یا معاملہ مشکوک ہے۔

میں نے جو تحریری کارروائی کرنی تھی وہ مکمل کر لی۔ پھر دونوں باپوں سے کہا کہ وہ انتظار کریں۔ میں تھانے کے دوسرے ضروری کاموں میں مصروف ہو گیا۔

اے ایس آئی خاصا تجربہ کار اور ہوشمند آدمی تھا۔ وہ ایک گھنٹے سے کچھ زیادہ وقت لگا کر واپس آیا۔ اس نے جب اپنی کارگزاری سنائی تو یوں سمجھیں کہ وہ آدھی تفتیش کر آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ نرداس واقعی بخار میں جل رہا ہے اور ڈاکٹر نے ملیریا بتایا ہے۔ اے ایس آئی کی رپورٹ کے مطابق نرداس سے ٹھیک طرح بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ اے ایس آئی نے جو بات سنائی وہ میں پیش کرتا ہوں۔

''اب مجھے تھانے کیوں بلایا جا رہا ہے؟''ـــ نرداس نے اے ایس آئی سے پوچھا۔

''تمہاری شانتی لاپتہ ہو گئی ہے''ـــ اے ایس آئی نے اسے بتایاـــ ''بجا طور پر شک ہے کہ وہ تمہارے ساتھ گھر سے بھاگی ہے''۔

''کب سے غائب ہے؟''ـــ نرداس نے پوچھا۔

''گزشتہ رات سے!''ـــ اے ایس آئی نے جواب دیاـــ ''اس کا باپ تھانے میں بیٹھا ہوا ہے''۔

''وہ تو یہی کہے گا کہ اس کی بیٹی کو میں لے گیا ہوں''ـــ نرداس نے کہاـــ ''گزشتہ رات بخار اتنا تیز تھا کہ مجھ پر غشی طاری ہوئی جا رہی تھی''۔

''ڈرنا نہیں نرداس!''ـــ اے ایس آئی نے کہاـــ ''مجھے صحیح بات بتا دو، ایسی بات تو نہیں کہ شانتی کسی خاص جگہ پہنچ گئی ہے اور تم صحت یاب ہو کر وہاں پہنچ جاؤ گے؟''

"اگر آپ صحیح بات سننا چاہتے ہیں تو یہ بھی سن لیں" ـــ نرداس نے کہا ـــ "اسے نہ ڈھونڈیں۔ مل بھی گئی تو اس کی لاش ملے گی"۔

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم بہت کچھ جانتے ہو" ـــ اے ایس آئی نے کہا۔

"جی ہاں!" ـــ نرداس نے کہا ـــ "میں بہت کچھ جانتا ہوں"۔

نرداس نے اے ایس آئی کو جو بات سنائی وہ یہ تھی کہ جب پچھلی واردات کا مقدمہ شروع ہوا تو شانتی کو ماں باپ نے گھر میں اس طرح قید کر دیا تھا جس طرح ہندوؤں میں کوئی عورت بیوہ ہو جائے تو اسے دھتکار کر الگ پھینک دیا جاتا ہے اور کوئی اس کے ساتھ ٹھیک طرح بات بھی نہیں کرتا۔ شانتی کو جگن ناتھ نے بھی مارا پیٹا اور باپ نے بھی دو تین مرتبہ اس کی پٹائی کی اور اس کا باہر نکلنا بند کر دیا۔

"تمہیں یہ سب کیسے معلوم ہوا تھا؟" ـــ اے ایس آئی نے نرداس سے پوچھا۔

"مجھے اس کے پیغام ملتے رہے ہیں" ـــ نرداس نے جواب دیا ـــ "مجھے اس کا جو آخری پیغام ملا وہ یہ تھا کہ وہ میری بے وفائی سے اور دنیا کی بے وفائی سے تنگ آ چکی ہے اور اب وہ اس دنیا سے جا رہی ہے...... میرا خیال ہے اس نے کہیں جا کر خودکشی کر لی ہے"۔

"مجھے دو باتیں بتا دو" ـــ اے ایس آئی نے پوچھا ـــ "تمہیں اس کے پیغام کس طرح ملتے تھے اور دوسری بات کہ تم نے اس کے ساتھ کیا بے وفائی کی تھی"۔

"میں نے اس سے تعلق توڑ لیا تھا" ـــ نرداس نے کہا ـــ "اس کے پیغام آتے رہے کہ چلو گھر سے بھاگ چلیں لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ اس محبت کے پیچھے جو مجھ پر گزری ہے وہ آپ جانتے ہیں۔ مجھے جگو نے اغوا کرایا۔ وہاں قتل ہونے سے بچا تو دوسری جگہ میرے باپ کو 20 ہزار تاوان پڑ گیا۔ یہ تو آپ لوگوں کا اور راؤ صاحب کا کمال تھا کہ مجھے برآمد کروا لیا ورنہ میں تو مارا گیا تھا یا پھر میرے باپ کو 20 ہزار روپے تاوان پڑ گیا تھا۔ میں تو اتنا ڈر گیا ہوں کہ ایک لڑکی کے پیچھے اپنے بوڑھے باپ کو ذلیل نہیں کرا سکتا نہ اسے دکھوں اور غموں میں ڈال سکتا ہوں"۔

نرداس نے اور بھی بہت سی باتیں کی تھیں جن میں ایک اہم بات یہ ہے کہ اس نے اپنے خاندان کی حیثیت سے بہت ہی اونچی حیثیت کے ایک خاندان کی لڑکی کے ساتھ دل

لگا لیا تھا۔ اگر وہ لڑکی کو گھر سے بھگا لے جاتا تو جاتا کہاں؟...... اور لڑکی اگر رقم اور زیورات ساتھ لاتی تو یہ ایک اور جرم بن جاتا۔ شانتی کا باپ اتنا اثر و رسوخ رکھتا تھا اس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ اسے تلاش کر کے گرفتار کروا سکتا تھا۔ گرفتاری کی صورت میں اس پر ایک تو اغوا کا الزام لگایا جاتا اور دوسرا چوری کا۔ نرداس یہ سوچ کر بھی چپ رہا۔

پھر اس نے یہ بھی سوچا کہ معلوم نہیں اتنے بڑے خاندان کی لڑکی اس کے ساتھ مطمئن رہ بھی سکے گی یا نہیں۔ اگر وہ پکڑے نہ جائیں اور کوئی اپنا کاروبار یا ذریعہ معاش اختیار کر لیں تو ابتدا میں تو وہ نہایت معمولی ہو گا لیکن لڑکی اپنے خاندان کی شہزادی تھی وہ یقیناً اکتا جاتی...... نرداس نے یہ باتیں اے ایس آئی کو سنائیں لیکن میں جو سمجھا وہ یہ تھا کہ یہ ہندو نوجوان ڈر گیا تھا۔ اس پر جو گزری تھی وہ کسی بھی نوجوان کے لئے اذیت ناک تھی۔ بہرحال نرداس نے شانتی کو صاف جواب دے دیا تھا کہ وہ گھر سے نہیں بھاگے گا اور آئندہ وہ اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔

نرداس جو محبت کرتا رہا تھا وہ دراصل نوجوانی کے جذبات کا ایک ڈرامہ تھا جو اکثر و بیشتر نوجوان کھیلا کرتے ہیں اور جب کوئی جھٹکا یا دھچکا لگتا ہے تو ان کے ہوش ٹھکانے آ جاتے ہیں۔ تب انہیں محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے عقل و ہوش پر جذبات کو غالب کر رکھا تھا۔

اے ایس آئی نے اس سے دوسری بات یہ پوچھی تھی کہ اسے شانتی کے یہ پیغام کس طرح ملتے تھے۔ اس نے جواب دیا وہ یوں تھا کہ ایک غریب عورت تھی جس کا نام رامو تھا اور پورا نام رام پیاری تھا۔ یہ عورت شانتی کی ماں کی ٹانگیں دبانے اور مٹھی چاپی کرنے کے لیے ان کے ہاں جاتی تھی اور خاصا وقت وہاں رہتی تھی۔ شانتی نے اس عورت کو اپنے اثر میں لے لیا تھا اور اسے پیسے دیتی رہتی تھی۔ کبھی شانتی بھی اس سے اپنا جسم دبواتی تھی اور اس دوران پیغام دے دیتی تھی۔ یہ پیغام زبانی ہوتے تھے۔ رامو کو شانتی نے بھی اور نرداس نے بھی قابل اعتماد تسلیم کر لیا تھا۔

رامو نے ہی نرداس کو بتایا تھا کہ پہلے جگو نے اور پھر اس کے باپ نے شانتی کو بہت مارا پیٹا تھا اور اس کے ساتھ گھر میں ایسا سلوک شروع کیا تھا جیسے وہ کوئی ناپسندیدہ شخصیت ہو۔ نرداس نے رامو کے ذریعے شانتی کو پیغام دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ کہیں بھی نہیں

جائے گا۔

نرداس نے اے ایس آئی کو بتایا کہ اس کا ایک فوٹو شانتی کے پاس تھا۔ شانتی نے دیکھا کہ نرداس نے اسے کورا جواب دے دیا ہے تو شانتی نے اس فوٹو کے پیچھے نرداس کو پیغام لکھ کر بھیجا جس میں یہ لکھا کہ تم بے وفا نکلے، ساری دنیا بے وفا ہے، میں اس دنیا سے جا رہی ہوں۔

اے ایس آئی نے پوچھا کہ اسے یہ پیغام کب ملا تھا۔ نرداس نے بتایا کہ دو روز پہلے ملا تھا۔ اے ایس آئی بہت خوش ہوا کہ شانتی کی یہ تحریر مل گئی ہے اور یہ ایک ثبوت ہے کہ وہ خود گئی ہے اور غالباً خودکشی کی نیت سے گئی ہے۔ اے ایس آئی نے نرداس سے کہا کہ یہ فوٹو اسے دے دے۔

''فوٹو میں نے پھاڑ کر جلا دی تھی'' ـــــ نرداس نے یہ جواب دے کر اے ایس آئی کو مایوس کر دیا۔ اس نے کہا ـــــ ''یہ فوٹو کوئی دیکھ لیتا تو میری شامت آ جاتی''۔

میں نے اے ایس آئی سے مشورہ کیا کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ کیا شانتی کے باپ کو یہ بتا دینا چاہئے کہ نرداس نے یہ بیان دیا ہے؟...... اور کیا رامو کو تھانے بلانا چاہئے؟...... ہم دونوں کچھ دیر اس مسئلے پر تبادلۂ خیالات اور صلاح مشورہ کرتے رہے اور آخر اس فیصلے پر پہنچے کہ شانتی کے باپ کو اصل صورتِ حال بتا ہی دی جائے۔ میں جو بہتر سمجھتا وہ کر سکتا تھا لیکن مجھے توقع یہ تھی کہ شانتی کا باپ یہ تسلیم ہی نہیں کرے گا کہ نرداس نے جو کہا وہ صحیح کہا ہے۔ اے ایس آئی نے کہا کہ وہ تو یہی ظاہر کرے گا کہ اس کی بیٹی بڑے اچھے کردار والی ہے اور اسے جبراً اغوا کیا گیا ہے۔

میں نے نرداس کے باپ کو بلا کر گھر بھیج دیا اور اس کے جانے کے بعد شانتی کے باپ کو اپنے دفتر بلایا۔ اے ایس آئی کو اپنے پاس ہی بٹھائے رکھا۔

''آپ نرداس کو دیکھنے اس کے گھر گئے تھے'' ـــــ اس جاگیردار نے اپنے مخصوص رعب دار لہجے میں اے ایس آئی سے کہا ـــــ ''وہ آپ کو گھر نہیں ملا ہوگا۔ وہ میری بیٹی کہیں لے گیا ہے''۔

''جناب رائے صاحب!'' ـــــ اے ایس آئی نے کہا ـــــ ''نرداس تین دنوں سے گھر میں پڑا ہے اور اسے بڑا تیز بخار ہے۔ میں اس ڈاکٹر سے بھی مل آیا ہوں جو اس کا

علاج کر رہا ہے اور نرداس سے بھی ملا ہوں اور اس نے کچھ اور ہی بیان دیا ہے۔ بخار سے وہ ایسا نڈھال پڑا ہے کہ اس سے اچھی طرح بولا بھی نہیں جاتا''۔

''انہیں نرداس کا بیان سنا دو'' ـــــ میں نے اے ایس آئی سے کہا۔

اس جاگیردار کا پورا نام رائے سندر داس پنڈت تھا اور رائے کہلاتا تھا۔ اے ایس آئی نے اسے نرداس کا پورا بیان سنا دیا اور اس میں اس عورت کا بھی پورا تفصیلی ذکر کیا جس کا نام راموتھا اور ان کے گھر میں وہ جایا کرتی تھی۔ میں رائے کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا۔ جوں جوں اے ایس آئی بیان سناتا گیا، رائے کے چہرے پر غصے کا تاثر پیدا ہوا اور پھر بڑھتا گیا۔ اتفاق سے اے ایس آئی ہندو تھا اور وہ بھی پنڈت تھا۔ میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا کہ یہ شخص مانے گا نہیں اور میں اپنی تھانیداری کا پورا پورا استعمال کروں گا۔

''وہ ملیچھ بکواس کرتا ہے'' ـــــ رائے سندر داس بولا ـــــ ''یہ اس کے باپ کی فریب کاری ہے کہ بیٹے کو لٹا کر کہہ دیا ہے کہ یہ بخار سے مر رہا ہے''۔

''رائے صاحب!'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''آپ پولیس سٹیشن میں بیٹھے ہیں جہاں میرا حکم چلتا ہے۔ ہم پر رعب جھاڑنے کی اور حکم چلانے کی جرأت نہ کریں۔ میرے اس اے ایس آئی نے نرداس کا بیان لیا ہے، اس عورت کے ساتھ اس کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں اس عورت کو یہاں بلواتا ہوں اور وہ آپ کے سامنے بیان دے گی۔ اگر نرداس نے جھوٹ بولا ہے اور یہ عورت بھی اگر جھوٹ بولے گی تو میں دونوں کو حوالات میں بند کر دوں گا۔ ابھی تو مجھے آپ کے گھر جا کر وہ کمرہ دیکھنا ہے جس میں شانتی سوئی تھی۔ وہاں جا کر میں کوئی رائے دے سکوں گا کہ اس کمرے میں سے جبراً لڑکی کو اٹھا کر لے جانا کسی انسان کے لیے ممکن بھی تھا یا نہیں''۔

میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اسے اس عورت کا نام بتا کر کہا کہ وہ جہاں بھی ملے اسے تھانے لے آئے۔

''میرا خیال ہے یوں کریں'' ـــــ جاگیردار نے کہا ـــــ ''آپ کو میرے گھر تو جانا ہی ہے، اس عورت کا وہیں گھر میں بیان لے لیں گے''۔

''بیان تھانے میں ہی لیا جائے گا'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''آپ اس عورت کے

آنے تک باہر بیٹھیں''۔

اس کا مشورہ ٹھیک تھا لیکن میں نے اس لیے نہ مانا کہ ایک تو میں اس کا کوئی مشورہ نہیں ماننا چاہتا تھا اور دوسری وجہ یہ کہ تھانے میں بیان لینا اچھا رہتا تھا کیونکہ تھانے کا رعب اور دہشت بیان دینے والے پر وہ اثر کرتی ہے جو ہم پیدا کرنا چاہتے ہیں...... میں نے دیکھا کہ یہ شخص میرے پاس ہی بیٹھنا چاہتا تھا، شاید باہر انتظار کرنے میں اپنی توہین سمجھتا تھا۔ اس نے نرداس کی کوئی بات شروع کر دی۔ میں نے اسے ٹوک دیا اور یہ تسلیم کر لینے پر آمادہ کرنے کے لیے بات شروع کر دی کہ شانتی خود گئی ہے اور اسے اغوا نہیں کیا گیا اور نرداس کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔

''ذرا سوچیں رائے صاحب!'' ___ میں نے کہا ___ ''اگر اس چھوٹی سی ذات کی عورت نے آپ کے منہ پر سچی بات کہہ دی تو آپ کی کیا عزت رہ جائے گی!''

''اگر اس کمین عورت نے میرے سامنے کوئی ایسی ویسی بات کی تو میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا'' ___ جاگیردار نے کہا ___ ''میرے گھر دونالی بندوق ہے''۔

''آپ مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں اپنے اختیار کا کلی طور پر استعمال کروں'' ___ میں نے کہا ___ ''قانون نے مجھے اختیار دے رکھا ہے کہ جس شخص نے کسی ملزم، مشتبہ یا گواہ کو کوئی خطرہ ہو تو اس شخص کی نیک چلنی کی ضمانت لے لوں...... اگر میں نے محسوس کیا کہ یہ عورت آپ کے ڈر سے صحیح بیان نہیں دے رہی تو میں آپ کی ضمانت طلب کروں گا اور یہ آپ کے لیے اچھا نہیں ہوگا...... بہر حال آپ باہر تشریف رکھیں، آپ کی جب ضرورت پڑے گی بلوالوں گا''۔

میں کہانی سے ہٹ کر ایسی باتیں بھی کہنا چاہتا ہوں جو قارئین کرام کے لئے سودمند ہو سکتی ہیں۔ غور فرمائیں، خوشامد پسندی انسان کی شخصیت اور کردار کو ریت کی ڈھیری بنا دیتی ہے۔ اس جاگیردار کے پاس اتنی دولت تھی جس کا شمار وہ خود بھی نہیں کر سکتا تھا۔ عام لوگوں کے لئے جنہیں ہم عوام کہا کرتے ہیں، یہ شخص بڑی ہی اونچی سوشل پوزیشن رکھتا تھا لیکن فطرتاً انگریزوں کا غلام تھا اور خوشامد میں ان کے آگے سجدہ کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا تھا۔ اس فطرت نے اس کے کردار میں اور شخصیت میں ایسی کمزوری پیدا کر دی تھی کہ اس میں خود اعتمادی رہی ہی نہیں تھی۔ مجھ پر رعب گانٹھتا تھا اور جب میں آگے سے اس کے

رعب کو پھوکا فائر سمجھ کر کوئی بات کرتا تھا تو وہ یکلخت نرم پڑ جاتا اور مجھے رحم طلب نگاہوں سے دیکھنے لگتا تھا۔ میں نے اس کی یہ کمزوری بھانپ لی اور دو چار اور باتیں کہہ کر اسے مغلوب کر لیا۔ وہ آہستہ آہستہ کرسی سے اٹھا اور جھکا جھکا سا چلتا میرے دفتر سے نکل گیا۔

یہاں میں اللہ کے فرمان کا حوالہ دوں گا، اللہ نے فرمایا ہے کہ اس کی ذاتِ باری کے سوا کسی کے آگے مت جھکو۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی یہ فرمان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے بھی جھکنا گناہ ہے۔ رکوع و سجود کے لائق صرف اللہ کی ذات ہے۔

راموآ گئی۔ ادھیڑ عمر غریب سی عورت خوف زدگی کے عالم میں میرے دفتر میں داخل ہوئی۔ ہیڈ کانسٹیبل اسے میرے قریب لے آیا اور میرے اشارے پر اسے کرسی پر بٹھا دیا۔ وہ بیچاری کرسی پر بیٹھنے سے یوں ڈر رہی تھی جیسے وہ بیٹھے گی اور میں کرسی میں بجلی کا کرنٹ چھوڑ دوں گا اور وہ مر جائے گی۔ وہ اپنے آپ کو اتنی عزت کے قابل سمجھتی ہی نہیں تھی۔ ہندو چھوٹی ذات اور اچھوت کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کیا کرتے ہیں۔ میں نے بڑے پیار سے کہا کہ وہ آرام سے بیٹھے اور بالکل نہ ڈرے نہ دل پر کوئی گھبراہٹ رکھے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ جاگیردار کو اندر بھیج دے۔

جاگیردار آیا اور اسے میں نے ساتھ والی کرسی پر بٹھا دیا اور دیکھا کہ وہ گھور گھور کر اس عورت کو دیکھتا اور کبھی مجھے دیکھنے لگتا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ شخص اس میں اپنی توہین سمجھ رہا ہے کہ گھٹیا درجے کی ایک عورت کو اس کی برابری میں بٹھایا گیا ہے۔ میں نے ادھر ذرا سی بھی توجہ نہ دی۔

صحیح طریقہ تو یہ تھا کہ میں اس عورت سے الگ بیان لیتا اور اس کے بعد اس رائے صاحب کو بلاتا اور اس بیان کو ذہن میں رکھ کر اس کے ساتھ سوال و جواب کرتا لیکن مجھے خیال آ گیا کہ یہ شخص یہ نہ کہے کہ میں نے اس عورت کو ذرا دھمکا کر یا کوئی لالچ دے کر اس سے اپنی ضرورت کا بیان لے لیا ہے۔

''راموا'' ___ میں نے اس عورت سے کہا ___ ''تم جانتی ہو رائے صاحب کی بیٹی لاپتہ ہوگئی ہے۔ ہم اسے ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ تمہارے ساتھ اس کی کچھ رازداری کی باتیں ہوتی رہتی تھیں اور وہ نرداس کو تمہاری زبانی پیغام دیتی رہتی تھی۔

اس میں تمہارا کوئی قصور نہیں نہ تم پر کوئی الزام آئے گا...... رائے صاحب بہت پریشان ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ شانتی کو کوئی گھر سے زبردستی اٹھا کر لے گیا ہے''۔۔۔ میں نے رائے سے کہا۔۔۔ ''رائے صاحب، آپ بھی رامو سے کہیں کہ یہ صحیح بات بتا دے، بیچاری آپ سے ڈرتی بات نہیں کر رہی''۔

جاگیردار نے اسے کہہ تو دیا کہ وہ اصل بات بتا دے لیکن اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ چاہتا ہے کہ اصل بات سامنے نہ آئے۔ مختصراً یوں سمجھ لیں کہ کچھ میں نے اور کچھ اس کے آقا جاگیردار نے اس عورت کا خوف رفع کر کے بولنے پر تیار کر لیا۔

''شانتی دیوی کو کوئی زبردستی نہیں لے گیا''۔۔۔ رامو نے جھجکتے ہوئے کہا۔۔۔ ''نہ کوئی ایسی جرأت کر سکتا ہے، کوئی کرے تو رائے صاحب اس کے پورے خاندان کو تباہ کر کے رکھ دیں''۔

اس جاگیردار نے نوکرانی کو ذرا رعب دار آواز میں کہا کہ وہ اتنے یقین کے ساتھ کس طرح کہہ سکتی ہے کہ شانتی کو کوئی زبردستی اپنے ساتھ نہیں لے گیا...... میں نے اس شخص کو ذرا رعب سے کہا کہ وہ اس تفتیش میں دخل اندازی نہ کرے اور یہ صرف میرا کام ہے کہ میں کچھ پوچھوں یا نہ پوچھوں۔ پھر میں نے رامو کی حوصلہ افزائی کی۔ جاگیردار چپ ہو گیا تو آہستہ آہستہ اس عورت نے ساری بات کھول دی۔

اے ایس آئی کو نرداس نے جو بیان دیا تھا اس کی تصدیق ہو گئی۔ رامو نے بتایا کہ آخری پیغام نرداس کی فوٹو کے پیچھے شانتی نے لکھا کر بھیجا تھا۔ رامو پڑھی لکھی تو نہیں تھی کہ وہ پیغام پڑھ لیتی۔ شانتی نے اسے ایسی باتیں کہی تھیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ شانتی کسی بھی رات گھر سے نکل جائے گی اور خودکشی کر لے گی۔

''شانتی دیوی تو صرف مرنے کی باتیں کرتی تھی''۔۔۔ رامو نے کہا۔۔۔ ''میں اسے کہتی تھی کہ بھگوان کا دیا کم تو نہیں، تم راج کماری ہو، اور کچھ دن گزرے تو تمہاری شادی ہو جائے گی پھر سارے دکھ درد ختم ہو جائیں گے۔ میں اسے نرداس سے ہٹانے کے لیے بہت کچھ کہتی رہتی تھی لیکن اس کا دماغ ایک ہی جگہ اٹک گیا تھا''۔

میں نے اس سے کچھ باتیں پوچھیں اور ایک آدھ بات جاگیردار نے بھی پوچھی۔ اس سے جو ذرا سا شک رہ گیا تھا وہ بھی رفع ہو گیا۔ رامو نے آخر میں بتایا کہ آخری دن یعنی

گزشتہ روز شانتی نے اسے ایک جوڑا کپڑوں کا دیا اور کچھ پیسے بھی دیئے تھے اور اس سے کہا تھا کہ کل اس کی لاش مل جائے گی۔ رامو یہ سن کر رو پڑی تھی اور اس نے ایک بار پھر شانتی سے اپنا ارادہ بدل لینے کو کہا تھا لیکن شانتی نے اسے کہا کہ اگر اس نے اس کے مرنے سے پہلے کسی کو بتا دیا تو اس کی بدروح اسے یعنی رامو کو چین سے جینے نہیں دے گی...... ہندو بڑی ہی بُری طرح توہم پرست ہوتے ہیں، یہ عورت بدروح کا نام سن کر ڈر گئی اور اس نے کسی کو بھی نہ بتایا کہ شانتی کا کیا ارادہ ہے۔

''تم نے پوچھا نہیں کہ لاش کہاں سے ملے گی؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''نہیں مہاراج!''۔۔۔ رامو نے جواب دیا۔۔۔ ''میں تو اپنے ہوش و حواس میں ہی نہیں رہی تھی۔ یہ خیال بھی آیا کہ شانتی ایسا قدم نہیں اٹھائے گی، یہ صرف مایوسی کا اثر ہے جو رات تک شاید اتر جائے''۔

''دیکھ ملیچھ عورت!''۔۔۔ جاگیردار نے اپنے مخصوص تحکمانہ لہجے میں کہا۔۔۔ ''اگر تیری یہ بات غلط نکلی تو......''

مجھے آج تک وہ وقت اور وہ منظر اچھی طرح یاد ہے۔ میں نے جاگیردار کو اس سے آگے بولنے نہ دیا اور رامو سے کہا کہ وہ نڈر ہو کر گھر چلی جائے اور اگر رائے صاحب یا کوئی اور اسے اس بات پر پریشان کرتا ہے کہ اس نے صحیح بیان دیا ہے تو وہ سیدھی میرے پاس تھانے آ جائے اور مجھے بتائے پھر دیکھے کہ میں اس شخص کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہوں۔

وہ چلی گئی اور میں نے جاگیردار کو ایک بار پھر خبردار کیا کہ وہ اس عورت کے ساتھ کوئی بات نہ کرے اور اگر اس کے ہاتھوں اس عورت کو اس پاداش میں کوئی تکلیف پہنچائی گئی کہ اس نے بیان دیا تھا تو پھر میں مجبور ہو جاؤں گا کہ قانونی کارروائی کروں۔

میرا ذہن تو صاف ہو گیا تھا۔ میں اٹھا، سٹاف کے تین چار آدمی ساتھ لئے اور جاگیردار کے ساتھ اس کے گھر کو چل پڑا۔ میں راستے میں سوچتا گیا کہ خودکشی کا ایک طریقہ تو زہر تھا جو شانتی کو کہیں سے نہیں ملا ہو گا۔ اس قصبے میں خودکشی کے دو اور ذریعے موجود تھے۔ دریائے گنگا کوئی ایک میل دور سے گزرتا تھا۔ شانتی رات کو وہاں سے بے خوف و خطر پہنچ سکتی تھی اور پھر وہ دریا میں کود جاتی۔ دوسرا ذریعہ ریلوے لائن تھی۔ یہ قصبہ برانچ لائن پر تھا، ریلوے سٹیشن بھی تھا۔ رات کو ایک ریل گاڑی یہاں سے گزرتی تھی۔

اگر شانتی نے ریل گاڑی کے آگے پٹڑی پر لیٹ کر خودکشی کی ہوتی تو علی الصبح ہی تھانے اطلاع پہنچ جاتی۔ اب تو گیارہ بج چکے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ شانتی نے پٹڑی پر خودکشی نہیں کی اور وہ یقیناً دریا میں کود گئی ہوگی۔ صبح ہونے تک اس کی لاش بہت دور پہنچ چکی ہوگی اور اگر کسی نے لاش نکال بھی لی تو کسی اور تھانے میں اطلاع جائے گی۔

جاگیردار کی حویلی تھی تو پرانے ٹائپ کی لیکن اس پرانے قصبے میں محل لگتی تھی۔ میں نے اسے باہر سے دیکھا تو یقین آ گیا کہ باہر سے کوئی حویلی میں داخل نہیں ہو سکتا۔ یہ میں اس لیے سوچ رہا تھا کہ ذہن میں رکھا جاتا کہ ایک یا دو تین آدمی اندر گئے اور سوئی ہوئی لڑکی کو اٹھا لائے۔ تو یہ ممکن ہی نہیں تھا۔

جاگیردار مجھے اندر لے جا کر اس کمرے میں لے گیا جس میں شانتی سویا کرتی تھی بلکہ دن بھر اسی کمرے میں رہتی تھی۔ صحیح معنوں میں امیرانہ بلکہ شاہانہ کمرہ تھا۔ میں مڈل کلاس کا فرد تھا، مجھے یہ کمرہ بہت ہی زیادہ خوبصورت اور بڑے قیمتی فرنیچر اور دیگر اشیاء سے سجا سجایا لگتا تھا۔ ایک پلنگ تھا جس پر بستر بچھا تھا اور پلنگ پوش بڑا ہی دلکش تھا۔ اس پر دو تکیے اوپر تلے رکھے تھے۔

میں نے کچھ سوچ کر یا غالباً ایسے ہی اوپر والے تکیے پر ہاتھ پھیرا، مخمل اور ریشم جیسا ملائم لگا۔ میں نے اوپر والا تکیہ اٹھا کر پلنگ پر پھینکا پھر دوسرا تکیہ اٹھایا تو اس کے نیچے ایک کاغذ پڑا نظر آیا جس پر ہندی کی تحریر لکھی ہوئی تھی۔ میں ہندی لکھ پڑھ سکتا تھا۔ میں نے یہ تحریر پڑھی اور خاموشی سے کاغذ شانتی کے باپ کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے بھی تحریر پڑھی اور میں اس کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھتا رہا۔

آج اتنی مدت گزر جانے کے بعد مجھے اس تحریر کے صحیح الفاظ تو یاد نہیں رہے لیکن یہ اچھی طرح یاد ہے کہ شانتی نے اپنے جذبات اور احساسات کا اظہار کس طرح کیا تھا۔ اس نے اپنے باپ اور بھائی جگن ناتھ سے مخاطب ہو کر لکھا تھا کہ لڑکیاں بھی بھگوان پیدا کرتا ہے اور لڑکوں کو بھی بھگوان ہی دنیا میں بھیجتا ہے لیکن انسان لڑکے سے محبت اور لڑکی سے نفرت کرتا ہے۔ ہمارے گھر میں صرف ایک لڑکا پیدا ہوا اور باقی سب لڑکیاں۔ اس لڑکے یعنی جگن ناتھ نے گھٹیا اور غریب لڑکیوں کو پیسے دے کر خراب کیا اور بدکاری کرتا رہا۔ میں نے سچی محبت کی اور مجھے مجرم ٹھہرایا گیا اور پھر مجھے اچھوت بنا کر الگ کمرے میں قید کر دیا

گیا۔ میں نے کوئی بدی نہیں کی، کنواری رہی اور کنواری ہی دنیا سے جا رہی ہوں۔ جس لڑکی کو اپنے ماں باپ سے محبت کی بجائے حقارت ملے اس لڑکی کو واپس بھگوان کے پاس چلے جانا چاہیے۔ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا، میری لاش مل جائے تو جہاں لاش ملے وہیں جلا دینا...... اس کے نیچے لکھا تھا شانتی۔

میں نے پہلی بار اس جاگیردار باپ کی آنکھوں میں آنسو دیکھے اور اس کے ہاتھ سے یہ کاغذ لے لیا اور اس سے پوچھا کہ یہ تحریر شانتی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے یا اس میں کوئی شک ہے؟...... اس نے اس طرح اوپر نیچے سر ہلایا جیسے تسلیم کیا ہو کہ یہ تحریر شانتی کی ہی ہے۔

میں نے وہیں جاگیردار کا بیان لکھ کر اس کے دستخط لے لئے اور اس طرح کسی چیز کی برآمدگی پر جو کاغذی کارروائی ہوتی ہے وہ مکمل کی اور باہر نکل آیا۔ میرا کام ختم ہو گیا تھا۔ جاگیردار نے لکھ دیا تھا کہ اس کی بیٹی خود گئی ہے اور خودکشی کے ارادے سے گئی ہے لیکن میں نے اسے یہ نہ کہا کہ اب میری چھٹی ہو گئی ہے کیونکہ وہ بہت ہی مغموم ہو گیا تھا۔ مجھے اس پر ذرا سا بھی رحم نہیں آنا چاہئے تھا کہ اس کی بیٹی اسے یہ صدمہ دے گئی تھی کیونکہ اس صدمے کا ذمہ دار بلکہ مجرم یہ خود تھا پھر بھی اس کے پاس رکا رہا اور کہا کہ اگر اسے میری کسی خدمت اور میرے تعاون کی ضرورت ہو تو مجھے بتائے۔

''آپ کیا مدد کریں گے!''—— اس نے دبی دبی آواز میں کہا ذرا رک رک کر کہا—— ''لاش مل جاتی تو اچھا تھا، میں لاش کہاں ڈھونڈتا پھروں گا''۔

''رائے صاحب!''—— میں نے کہا—— ''آپ کی بیٹی ریلوے لائن پر گاڑی تلے آ جاتی تو اب تک لاش آپ کے گھر پہنچ چکی ہوتی۔ اس نے دریا میں کود کر جان دی ہو گی...... میں یہ کر سکتا ہوں اور تھانے جاتے ہی یہ کروں گا کہ ارد گرد کے تھانوں میں اطلاع بھجوا دیتا ہوں کہ اس حلئے کی لڑکی کی لاش ملے تو میرے تھانے میں فوراً اطلاع بھجوا دیں''۔

میں نے تھانے پہنچتے ہی جس طرح کسی گمشدہ شخص، مرد یا عورت کا اشتہار شور وغوغا دیا جاتا ہے، ایسی ہی تحریر لکھی اور ڈی ایس پی کو اس وقوعہ کی اطلاع دے کر اجازت طلب کی کہ میں چند ایک تھانوں کو یہ اطلاع بھجوا دوں۔ ڈی ایس پی نے اجازت دے دی

دوسرے تھانوں کو اطلاعیں بھجوانے کا انتظام ڈی ایس پی کے آفس میں ہوا کرتا تھا اور اس دور میں سرخ فیتے کا رواج ہی نہیں تھا۔ کارروائی جو کرنی ہوتی تھی وہ فوری طور پر کی جاتی تھی۔ انگریز افسر خود دیکھا کرتے تھے کہ مطلوبہ کارروائی ہوگئی ہے۔

مجھے یاد نہیں کہ میں نے خود اپنی کسی کہانی میں لکھا تھا یا غالباً کسی اور انسپکٹر صاحب نے اپنی تفتیشی کہانی میں لکھا تھا کہ پولیس والے آسمان سے اترے ہوئے فرشتے نہیں ہوتے، جن اور بھوت بھی نہیں ہوتے نہ ان کے ہاتھوں میں کوئی ایسا جادو یا طلسم ہوتا ہے کہ انہیں ملزم نظر آجاتے ہوں اور وہ انہیں پکڑ لیتے ہوں۔ یہ کمال پولیس کے مخبروں کا ہوتا ہے۔ لوگ تو جانتے ہی نہیں کہ ان کے درمیان پولیس کے کتنے مخبر موجود رہتے ہیں اور میں نے یہاں تک دیکھا ہے کہ ایک بیٹا اپنے باپ کے خلاف بھی مخبری کر دیتا ہے۔ ہر اس تھانیدار کو ایک کامیاب تھانیدار کہا جاتا ہے جس کا مخبری کا نظام پورے علاقے میں اور گھر گھر تک پھیلا ہوا ہو۔ اس کے علاوہ پولیس چوکنی اور چوکس رہتی تھی۔ ٹال مٹول کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ ایسے تو ہوتا ہی نہیں تھا کہ کوئی قتل ہو جاتا تو دو تھانوں کے تھانیدار اس مسئلے میں الجھ جاتے کہ یہ لاش میرے تھانے کے علاقے میں نہیں پڑی ہوئی بلکہ ملحقہ تھانے کے علاقے میں ہے آپ نے پاکستان میں ایسی کئی خبریں پڑھی ہوں گی کہ مقتول کی لاش شہر میں ایک سڑک پر پڑی ہے اور اسے اس لیے نہیں اٹھایا جا رہا کہ دو تھانیداروں میں یہ تنازعہ چل پڑا ہے کہ لاش کس کے علاقے میں پائی گئی ہے۔

سات آٹھ دن گزر گئے۔ کہیں سے بھی لاش کی برآمدگی کی اطلاع نہ ملی۔ میں آپ کو یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ جب اس طرح کسی کی گمشدگی کی اطلاع دوسرے تھانوں کو دی جاتی ہے تو گم ہو جانے والے کا مکمل حلیہ، عمر، قد، پہنے ہوئے کپڑے اور نام وغیرہ بھی ساتھ لکھا جاتا ہے۔ پولیس والوں کو لکھا ہوا حلیہ صرف پولیس والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ حلیہ ایسا لکھا جاتا ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے ایک واضح تصویر آجاتی ہے۔ میں نے لاش برآمد کرانی تھی، اس کا مکمل حلیہ، پہنے ہوئے کپڑے، چہرے کا رنگ اور عمر وغیرہ لکھی تھی اور ساتھ نام شانتی بھی لکھ دیا تھا۔

آٹھویں نویں دن ساتھ والے تھانے سے ایک ہیڈ کانسٹیبل یہ اطلاع لایا کہ لاش تو نہیں ملی لیکن ایک گاؤں میں شانتی نام کی ایک لڑکی کا سراغ ملا ہے جس کا حلیہ بالکل ویسا

ہے جو میں نے لکھا تھا۔

میں نے اسے فرض شناسی کی ایک بڑی اچھی مثال سمجھ کر ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اپنے سب انسپکٹر کا میری طرف سے شکریہ ادا کرے۔ یہ بات ماننے والی تھی ہی نہیں کہ شانتی زندہ مل گئی ہے لیکن ہیڈ کانسٹیبل نے جو مزید بات سنائی اس سے میں شک میں پڑ گیا اور ارادہ کر لیا کہ اس لڑکی کو جا کر دیکھ لیا جائے۔ بات یہ تھی کہ ایک جواں سال آدمی آٹھ نو دن پہلے اس لڑکی کو اس گاؤں میں لے گیا تھا اور چار پانچ دنوں بعد اس کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے یہ بھی بتایا کہ اس لڑکی کو چھپا کر نہیں رکھا گیا بلکہ گاؤں کی عورتیں اس کے گھر اسے دیکھنے جاتی رہی تھیں اور ایک مخبر نے تھانے اطلاع دی تھی کہ یہ کوئی مشکوک معاملہ ہے۔

معاملہ مشکوک اس طرح تھا کہ یہ جواں سال آدمی ایک پیشہ ور ڈاکو کے گینگ کا آدمی تھا۔ اس ڈاکو کا نام پولیس کے ریکارڈ میں کمال الدین عرف کمالا لکھا ہوا تھا۔ کمالا اپنے علاقے کی ہر دلعزیز شخصیت تھا۔ اس زمانے میں ڈاکو آج کی طرح نہیں ہوتے تھے بلکہ انہوں نے معاشرے میں اپنی باعزت حیثیت بنا رکھی ہوتی تھی۔ کمالے کے متعلق مشہور تھا کہ غریبوں کی بہت مدد کرتا تھا۔ ڈکیتی کی وارداتیں اپنے گاؤں یا اردگرد کے دیہات میں نہیں کرتا تھا بلکہ دور جا کر واردات کرتا اور اتنا ہوشیار تھا کہ پکڑا نہیں جاتا تھا۔

یہ تو میں نے بڑی ہی مختصر بات کی ہے، ہیڈ کانسٹیبل نے بڑی تفصیل سے بات سنائی تھی اور میں نے اس سے بہت کچھ پوچھا تھا۔ چونکہ وہ پرانا ہیڈ کانسٹیبل تھا اس لیے وہ جانتا تھا کہ یہ اطلاع ایک تھانیدار کو کس طرح دینی ہے اور کس طرح اسے مشکوک بنانا ہے۔ دراصل اس ہیڈ کانسٹیبل نے میرا کام آسان کر دیا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ میں اچانک اس گاؤں میں جا پہنچوں اور اس لڑکی کو دیکھوں۔

کوئی عام آدمی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ یہ لڑکی رائے سندر داس کی بیٹی شانتی ہو گی۔ یقین مجھے بھی نہیں آ رہا تھا لیکن پولیس والے زیادہ بہتر جانتے ہیں کہ ایسے ایسے واقعات اور اتفاقات ہو جاتے ہیں جنہیں معجزہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ مجھے ہیڈ کانسٹیبل نے قائل کر لیا تھا کہ میں اس لڑکی کو دیکھوں اور اس کی شناخت گاؤں میں کروانے کا بندوبست ساتھ لاؤں۔

یہاں پھر کہوں گا کہ یہ اس دور کی پولیس کی کارگردگی تھی۔ میرا کام ختم ہو چکا تھا، وہ اس طرح ثابت ہو گیا تھا کہ گمشدہ لڑکی خود گئی اور خودکشی کے ارادے سے گئی ہے۔

انگریزوں نے ہمیں ٹریننگ ہی ایسی دی تھی کہ ہر پولیس آفیسر اپنے فرض کو پورا کرنا اپنا دین اور دھرم سمجھتا تھا۔ پھر ذاتی کردار بھی کوئی اثر رکھتا ہے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ چلا جائے اور میں کل اس کے تھانے پہنچ جاؤں گا۔

میں نے اسی وقت جاگیردار کو بلوایا اور اسے بتایا کہ کل سورج نکلنے سے خاصا پہلے میرے پاس پہنچ جائے اور دو تانگوں کا بندوبست بھی کرتا لائے۔ میں نے اسے کہا کہ یہ محض شک والی بات ہے لیکن ہو سکتا ہے کہ لڑکی اس کی بیٹی ہی ہو۔ اسے شناخت کے لیے ساتھ لے جانا تھا۔ وہ گاؤں وہاں سے چار میل سے کچھ زیادہ دور ہی تھا اور وہاں تک بڑی اچھی پگڈنڈی جاتی تھی جس پر تانگے چلتے تھے۔ یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ وہ میرے ملحقہ تھانے کا علاقہ تھا۔

اگلی صبح جاگیردار سندر داس دو بڑی اچھی قسم کے تانگے لے کر تھانے پہنچ گیا۔ میں ایک ہیڈ کانسٹیبل اور پانچ کانسٹیبلوں کے ساتھ اس کا منتظر تھا۔ اس کے آتے ہی ہم سب تانگوں میں سوار ہوئے اور چل پڑے۔ میں نے دونوں تانگہ بانوں سے کہا کہ بہت جلدی ہمیں پہنچانا ہے۔ دونوں کے گھوڑے بڑے اچھے تھے۔ انہوں نے بڑی اچھی رفتار پر ہمیں اس علاقے کے تھانے میں پہنچا دیا۔

وہاں ایک ہندو ایس ایچ او تھا۔ اس نے اپنے طور پر انکوائری کر لی تھی اور کہا کہ اسے یہ لڑکی مشکوک نظر آئی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ لڑکی دیہاتی نہیں شہری لگتی ہے۔ اس ہیڈ کانسٹیبل نے جسے میرے پاس بھیجا گیا تھا، اس گاؤں جا کر اس لڑکی کو دیکھا تھا۔ چونکہ وہ آدمی جو لڑکی کو لایا اور اس کے ساتھ شادی کی تھی، ایک ڈاکو کے گینگ کا آدمی تھا اس لیے اس نے پولیس کے ساتھ سلام دعا رکھی ہوئی تھی۔ اس ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ بھی اس نے رسمی سے مراسم پیدا کر رکھے تھے۔ ہندو ایس ایچ او نے اسی ہیڈ کانسٹیبل کو میرے ساتھ بھیج دیا۔ وہ گاؤں تھانے والے گاؤں سے دو اڑھائی میل دور تھا جہاں تک تانگے جا سکتے تھے۔

ہم تانگوں میں سوار ہوئے اور زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ ہم اس گاؤں میں جا پہنچے۔ یہ کوئی بڑا گاؤں نہیں تھا، چند ایک ہی گھر تھے لیکن کوئی اتنے تھوڑے بھی نہیں تھے کہ

اسے چھوٹا سا گاؤں کہا جاتا۔ گاؤں کا نمبردار دوڑتا باہر آیا، چوکیدار بھی آ گیا اور پھر تو ہر گھر کے تمام افراد تماشا دیکھنے نکل آئے کہ پولیس آئی ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل مجھے سیدھا اس گھر میں لے گیا جہاں وہ آدمی اپنی مشکوک دلہن کے ساتھ رہتا تھا۔ شانتی کا باپ ساتھ تھا۔

دروازہ کھلا ہوا تھا۔ ہم دستک دیئے بغیر اندر چلے گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے صحن میں جا کر آواز دی ۔۔۔ ’’شرفو بھائی، باہر آؤ، تمہارے مہمان آئے ہیں‘‘۔

ایک جوان سال آدمی کمرے سے نکلا اور اس کے چہرے پر گھبراہٹ آ گئی جیسے وہ بوکھلا گیا یا خوف زدہ ہو گیا ہو۔ اس کی عمر چوبیس پچیس سال لگتی تھی۔ رنگ تو اس کا سانولا تھا لیکن چہرے کے خدوخال اور قد کاٹھ سے خوبرو تھا۔ اس کے پیچھے ایک نوجوان لڑکی دروازے میں آئی اور وہیں رک گئی۔ میں نے اس کے چہرے پر حیرت اور خوف کا تاثر دیکھا۔

’’یہ ہے میری بیٹی شانتی!‘‘ ۔۔۔ رائے سندر داس نے بے اختیار کہا ۔۔۔ ’’ہے بھگوان، یہ تو زندہ مل گئی ہے‘‘۔

کیا آپ اسے معجزہ نہیں کہیں گے؟...... لیکن میں معجزہ نہیں کہوں گا، میں نے اپنی سروس میں اس قسم کے متعدد معجزے دیکھے ہیں۔ تفتیشوں کے دوران ایسے ہی حیران کن واقعات سامنے آتے ہیں۔

میں نے شرفو اور شانتی کو آگے آنے کو کہا۔ میں نے اپنی اس کارروائی کو قانون کے مطابق کرنے کے لیے نمبردار اور ایک معزز آدمی کو ساتھ لے لیا تھا۔ شرفو سے کہا کہ وہ صحن میں چارپائیاں رکھ دے۔ پولیس گارڈ کو باہر بھیج دیا۔ چارپائیاں آئیں تو ہم سب بیٹھ گئے اور شرفو اور شانتی کو بھی بٹھا لیا۔ شانتی کے باپ کی رعونت کا یہ عالم تھا کہ اس نے اپنی بیٹی کو گلے لگانا تو دور کی بات ہے اس کے سر پر ہاتھ بھی نہ پھیرا۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر کوئی اچھا تاثر نہیں تھا۔ اس کے ذہن میں غالباً یہ شک ہوگا کہ شانتی اس آدمی کے ساتھ گھر سے بھاگ آئی ہے۔ مجھے بھی یہی شک تھا لیکن ان کے بیان اپنے تھانے میں لا کر لینے تھے۔

’’شانتی!‘‘ ۔۔۔ میں نے کہا ۔۔۔ ’’تمہیں زندہ دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ یہ

بتاؤ کہ تمہیں یہاں زبردستی لایا گیا ہے یا خود آئی ہو؟''

''میں خود آئی ہوں''۔۔۔ شانتی نے ذرا دبی دبی آواز میں جواب دیا۔۔۔ ''مجھے کوئی زبردستی نہیں لایا نہ مجھ پر جبر کیا گیا ہے اور میں اب شانتی نہیں آصفہ ہوں۔ میں مسلمان ہوگئی ہوں اور اس (شرفو) کے ساتھ شادی کر لی ہے''۔

میں اس سے یہی الفاظ کہلوانا چاہتا تھا جو اس نے میری توقع کے بالکل خلاف کہہ دیئے۔ میں اسے اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہوں کہ اللہ کی مدد شامل حال تھی...... شرفو کا پورا نام شرف الدین تھا یعنی وہ مسلمان تھا۔ میں حیران تھا کہ شانتی اتنے دور گاؤں میں ایک دیہاتی اور وہ بھی مسلمان کے ساتھ کس طرح آ گئی ہے۔

''شرفو!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تمہیں شانتی یعنی آصفہ کے ساتھ میرے تھانے چلنا ہوگا۔ میں تمہیں ہتھکڑی نہیں لگواؤں گا لیکن اپنے آپ کو میری حراست میں سمجھو، تم دونوں کے بیان وہاں جا کر لوں گا''۔

''میں یہ بتا دیتی ہوں''۔۔۔ شانتی نے کہا۔۔۔ ''میں شرفو کے ساتھ رہوں گی، اپنے گھر نہیں جاؤں گی''۔

میں نے دیکھا کہ شانتی جتنی خوبصورت تھی اس سے کہیں زیادہ جرأت مند اور پُر اعتماد تھی۔ میرے پوچھنے پر شرفو نے بتایا کہ وہ شانتی کو کسی مجسٹریٹ کے پاس نہیں لے گیا تھا۔ اگر یہ دونوں کسی مجسٹریٹ کی کورٹ میں جا کر بیان دیتے کہ شانتی بالغ ہے اور یہ اپنی مرضی سے آئی ہے اور بغیر جبر کے اس نے اپنا مذہب تبدیل کر لیا اور شرفو کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ تو ان کے لیے بہت اچھا ہوتا۔ اگر انہوں نے یہ قانونی تقاضا پورا کر لیا ہوتا تو میں انہیں حراست میں لے ہی نہیں سکتا تھا۔ اس قانونی کارروائی کے بغیر صورت کچھ اور بن گئی تھی بلکہ شانتی کے جاگیردار باپ نے صورت کچھ اور بنا دی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ اس کی بیٹی پر جبر کیا گیا ہے اور وہ شرفو کے خلاف پرچہ کروائے گا۔ یہ تو میں نے اسی وقت محسوس کر لیا تھا کہ کوئی ہندو یہ برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ ایک ہندو لڑکی مسلمان ہو جائے۔

میں نے شانتی کی برآمدگی کی کاغذی کارروائی کی اور جو تحریر لکھی اس پر شانتی کے دستخط لئے، شرفو نے بھی دستخط کئے پھر نمبردار کا انگوٹھا لگوایا کیونکہ وہ دستخط نہیں کر سکتا تھا اور پھر معزز آدمی کے دستخط لئے۔ پھر میں ان دونوں کو تانگے میں بٹھا کر وہاں سے رخصت

ہوا۔

میرے لیے اگلی کارروائی بڑی آسان تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ان دونوں کو مجسٹریٹ کی عدالت میں پیش کر کے بیان دلوا دوں گا اور کیس وہیں ختم ہو جائے گا مگر شانتی کے باپ نے میرے لیے مشکل پیدا کر دی۔ وہ کہتا تھا کہ شرفو کے خلاف میں اغوا کا پرچہ کروں۔

میں نے اسے سمجھانے کی بہت کوشش کی۔ کئی ایک دلائل دیئے لیکن وہ تو شرفو کو پھانسی کے تختے پر چڑھانے کی باتیں کرتا تھا۔ اپنی بیٹی کو بھی وہ معاف نہیں کر رہا تھا۔

کوئی اور ہوتا تو میں جبر سے نہیں عقلی دلائل دے کر اور قانونی پوزیشن سمجھا کر اسے قائل کر لیتا لیکن یہ شخص اثر ورسوخ والا بہت بڑا جاگیردار تھا اور اس کی دوسری خطرناک حیثیت یہ تھی کہ ہندو تھا اور اس کی بیٹی نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ وہ شہر کے سرکردہ ہندوؤں کو ساتھ ملا کر میرے لیے کوئی اور مصیبت کھڑی کر سکتا تھا۔

تھانے پہنچے تو شانتی کے باپ نے کہا کہ وہ شانتی کو اپنے ساتھ گھر لے جائے گا اور میں شرفو کو حوالات میں بند کروں۔ اب میں نے اپنی اتھارٹی استعمال کرنی شروع کر دی۔ میں نے اسے کہا کہ قانون کی نگاہ میں دونوں ملزم ہیں۔ اگر شانتی بے گناہ اور مظلوم ہے تو بھی مجھے اس کے بیان لینے ہیں اور میں اسے کسی کے زیر اثر نہیں چھوڑ سکتا تا کہ میں صحیح صورتِ حال معلوم کرنے کے لیے اس سے آزادنہ بیان لے سکوں۔ یہ جاگیردار اتنا ڈھیٹ آدمی تھا کہ کہنے لگا شانتی کا بیان اس کی موجودگی میں لیا جائے۔

''رائے سندر داس جی!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''اس وقت تک آپ کے اشاروں پر چلتا رہا ہوں اور آپ مجھے قانون کے دائرے سے باہر لے گئے ہیں۔ میں ڈی ایس پی صاحب کو اطلاع دے دیتا ہوں کہ آپ مجھے تفتیش نہیں کرنے دے رہے اور آپ کیا چاہتے ہیں پھر ڈی ایس پی صاحب جو حکم دیں گے میں اس پر عمل کروں گا لیکن آپ کو یہ بتا دوں کہ میں اطلاع اس طرح دوں گا کہ آپ تفتیش میں زبردستی اپنے مفاد کے مطابق دخل اندازی کر رہے ہیں''۔

میں نے اسے اور بھی بہت کچھ کہا اور ایسا ڈرایا کہ اسے اپنے آگے جھکا لیا۔ پھر میں نے اسے کہا کہ وہ تھانے کی حدود سے باہر چلا جائے اور انتظار کرنا چاہتا ہے تو وہیں کرے،

ساتھ ہی اسے یقین دلا دیا کہ میں شرفو کے خلاف اغوا کے الزام میں ایف آئی آر تحریر کر رہا ہوں اور اسے گرفتار سمجھا جائے۔

یہ تفصیل میں اس خیال سے پیش کر رہا ہوں کہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہو سکے کہ ہندو کی ذہنیت کیا ہے اور ہندو کے دل میں مسلمانوں کی عداوت کس حد تک اتری ہوئی ہے۔

میں نے اس ہندو جاگیردار کو یہ بھی بتایا تھا کہ بنے گا کچھ بھی نہیں اور اس کی بہت بدنامی ہو گی اور ہو سکتا ہے یہ خبر اخباروں تک بھی پہنچ جائے۔ مجھے معلوم تھا کہ ایک اخبار کا نامہ نگار اس قصبے میں موجود تھا لیکن یہ ہندو جاگیردار اپنی عزت اور آبرو قربان کر کے بھی ایک مسلمان کو نقصان پہنچانے پر تلا ہوا تھا۔

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ میں شانتی کو مسلمان ہونے کے باوجود اس کہانی میں شانتی ہی لکھ رہا ہوں۔ وہ دراصل اس مقام پر آصفہ بن چکی تھی لیکن کہانی میں پہلے شانتی نام آتا رہا ہے اس لیے میں شانتی ہی لکھتا جا رہا ہوں تا کہ پڑھنے والوں کو کوئی الجھاؤ نہ ہو۔

میں نے شرفو اور شانتی کے بیان بڑی تسلی سے لیے اور دونوں پر بہت جرح کی تا کہ میرے سامنے وقوعہ کی مکمل اور واضح تصویر آ جائے۔ اگر میں نے ان دونوں کے بیانات الگ الگ تحریر کئے تو یہ کہانی بہت طویل ہو جائے گی۔ میں اپنے انداز سے یہ وقوعہ سنا دیتا ہوں۔

شانتی نرداس کو اس طرح چاہتی تھی جسے ٹوٹ کر چاہنا کہتے ہیں یعنی وہ اس پر دل و جان سے فدا تھی۔ اس نے اپنے مستقبل کے خواب نرداس کی محبت پر تعمیر کر رکھے تھے اور اسے مکمل یقین تھا کہ نرداس اسے اپنے ساتھ کہیں لے جائے گا اور وہ اپنی نئی زندگی بنا لیں گے۔ شانتی نے صاف الفاظ میں کہا کہ وہ گھر سے کچھ زیور اور خاصی رقم چوری کر کے لے جا رہی تھی لیکن حالات نے ایسی کروٹ بدلی کہ اس کے خواب ٹوٹ پھوٹ گئے۔ نرداس قتل ہونے سے بچ گیا۔ اب تو شانتی انتقاماً بھی گھر سے بھاگ جانے پر تل گئی لیکن اسے گھر میں قید کر دیا گیا۔

وہ اپنے باپ اور بھائی کے خلاف اتنی زیادہ بھڑک اٹھی کہ اس کا بس چلتا تو ان دونوں کو قتل کروا دیتی یا خود زہر دے دیتی۔ یہ پہلے بیان کر چکا ہوں کہ گھر میں شانتی کو اچھوت کا درجہ دے دیا گیا تھا اور اسے مارا پیٹا بھی گیا تھا۔

اس نے نرداس کے ساتھ رابطہ پیدا کرنے کے لیے اس غریب عورت رامو کو ہاتھ میں لے لیا اور اسے نقد انعام دیتی رہی۔ رامو پیغام لے جاتی اور جواب لاتی رہی اور جس طرح پہلے میں نے سنایا ہے کہ نرداس نے اسے ٹکا سا جواب دے دیا اور شانتی کی دنیا اندھیر ہو گئی۔ اب تو وہ یہی کر سکتی تھی کہ اپنے وجود کو اس دنیا سے اٹھا دے چنانچہ اس نے آخری رقعہ لکھا اور آدھی رات سے کچھ پہلے گھر سے نکل گئی۔

اس نے دریا میں کود جانے کی سوچی ہی نہیں۔ اس کے ذہن میں ریلوے لائن تھی اور اسے معلوم تھا کہ اس وقت ایک ریل گاڑی آتی ہے۔ قصبہ گہری نیند اور گہرے سکوت میں ڈوبا ہوا تھا۔ شانتی چھپتی چھپاتی قصبے کے ایک طرف سے باہر نکلی اور ریلوے لائن پر جا رکی۔ وہاں سے ریلوے سٹیشن دور تھا۔ وہ جہاں پہنچی تھی وہ ویران علاقہ تھا۔

کچھ ہی دیر بعد انجن کی روشنی نظر آنے لگی۔ شانتی کی زندگی اتنی ہی رہ گئی تھی جتنی دیر میں ریل گاڑی اس تک پہنچتی تھی۔ گاڑی تیزی سے چلی آ رہی تھی اور شانتی ابھی پیچھے کھڑی تھی۔

گاڑی قریب آئی تو شانتی پٹڑی کے قریب ہو گئی۔ رات چاندنی تھی۔ گاڑی اور قریب آ گئی تو شانتی بالکل پٹڑی کے ساتھ ہو گئی۔ اس میں اور گاڑی کے انجن میں چند قدموں کا فاصلہ رہ گیا تھا کہ پیچھے سے کسی نے شانتی کو اپنے بازوؤں میں دبوچ کر پیچھے گھسیٹ لیا۔ ریل گاڑی اپنی رفتار سے آگے نکل گئی۔

شرفو نے اپنے بیان میں یہ واقعہ سنایا تھا کہ وہ کسی گاؤں سے واپس اپنے گاؤں کو چلا جا رہا تھا۔ وہ پٹڑی سے ابھی کچھ دور ہی تھا کہ چاندنی میں اسے ایک عورت نظر آئی جو پٹڑی سے ہٹ کر پتھروں والی جگہ سے نیچے کھڑی تھی۔ اس کی شرفو کی طرف پیٹھ تھی۔ ریل گاڑی قریب آئی تو اس عورت کو پیچھے ہٹ آنا چاہئے تھا لیکن وہ آگے کو ہو گئی۔ گاڑی اور قریب آئی تو یہ عورت اور آگے ہو گئی۔

شرفو اور تیز چل پڑا۔ اس میں ذرا سا بھی شک نہیں تھا کہ یہ عورت خودکشی کرنا چاہتی ہے ورنہ اسے پیچھے آ جانا چاہئے تھا۔ شرفو نے چند قدم دوڑنے کی رفتار سے اٹھائے اور لڑکی کو اس وقت پکڑ لیا جب انجن اس تک پہنچ چکا تھا۔ پھر گاڑی نکل گئی تو شرفو نے شانتی کو چھوڑا۔

شانتی نے گھوم کر شرفو کی طرف دیکھا تو اس پر برس پڑی۔ ساتھ ہی وہ رونے لگی۔ وہ کہہ رہی تھی کہ شرفو نے اسے مرنے سے بچا کر اس پر بہت ظلم کیا ہے۔ شرفو دیکھ رہا تھا کہ یہ شہری لڑکی ہے اور بہت ہی خوبصورت ہے اور نوجوان بھی ہے۔ شرفو نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ کوئی شریف آدمی نہیں لیکن وہ کوئی پیدائشی غنڈہ اور بدمعاش یا جرائم پیشہ نہ تھا۔ اس کے دل میں انسانی ہمدردی کے جذبات ابھر آئے تھے اور یہی شریفانہ جذبات اس کے ذہن پر غالب آگئے۔ اس نے مسرت سی محسوس کی کہ ایک لڑکی کو اس نے موت کے منہ سے نکال لیا ہے۔

شرفو تھا تو جرائم پیشہ لائن کا آدمی لیکن خاصا ذہین معلوم ہوتا تھا۔ اس حقیقت کو صرف پولیس والے ہی جانتے ہیں کہ جرائم پیشہ لوگ اوسط درجہ انسان کی نسبت زیادہ ذہین ہوتے ہیں۔ اسے فوراً احساس ہو گیا کہ یہ لڑکی اس پر شک کرے گی کہ اس نے اسے بُری نیت سے بچایا ہے یا اس کے حسن اور جوانی کو دیکھ کر اس کی نیت خراب ہو جائے گی۔

''ایک بات سن لے لڑکی!'' ___ شرفو نے کہا ___ ''میں نے تمہیں کسی بُری نیت سے نہیں بچایا نہ ہی تمہیں دیکھ کر میری نیت خراب ہوگی۔ تم یقیناً اس شہر کی لڑکی ہو۔ چلو، میں تمہیں تمہارے گھر پہنچا دیتا ہوں...... خدا کے واسطے مجھ پر کوئی شک نہ کرنا''۔

''تم مسلمان معلوم ہوتے ہو'' ___ شانتی نے کہا ___ ''تم نے خدا کا نام لیا ہے''۔

''اور تم؟''

''میں ہندو ہوں'' ___ شانتی نے کہا ___ ''مجھے گھر پہنچانے کی بجائے مجھ پر یہ نیکی کرو کہ میرا گلا گھونٹ دو۔ میں اپنے گھر نہیں جاؤں گی''۔

کچھ اور باتیں کہہ سن کر شرفو نے اس پر اپنا اعتماد جما لیا اور اسے آمادہ کر لیا کہ وہ بتائے کہ وہ کیوں خودکشی کر رہی تھی۔ شانتی نے اسے ساری بات کھل کر بتا دی اور کہا کہ جو اس کی محبت کے دعوے کرتا اور قربانی دینے کی باتیں کرتا تھا وہ بے وفا نکلا اور ماں باپ کی طرف سے ایسی پھٹکار ملی جیسے وہ اسے زندہ دیکھنا ہی نہیں چاہتے۔

شرفو نے اسے کہا کہ یہاں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں، آؤ ذرا آگے چل کر بیٹھ جاتے ہیں اور پھر میں تمہیں اپنی بات سناؤں گا۔ شانتی کسمپرسی کی حالت میں تھی اور اس کے جذبات میں طوفان آگیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ پٹڑی کراس کر کے آگے ایک درخت کے

نیچے جا بیٹھی۔ شانتی نے شرفو کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ اس کا باپ اس علاقے کا بہت بڑا جاگیردار ہے اور اس کا اثر و رسوخ انگریز افسروں تک چلتا ہے۔ شرفو نے کہا کہ وہ اس کے باپ کو جانتا ہے، وہ بڑا مشہور جاگیردار ہے۔

شرفو نے شانتی سے کہا کہ دنیا یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی اور زندگی کا انجام خودکشی نہیں ہونا چاہئے۔ اس نے شانتی کو اپنی کہانی سنائی۔ شرفو نے یہی کہانی مجھے بیان دیتے ہوئے سنائی تھی اور کہا تھا کہ میں انکوائری کر لوں اور اس کا ایک ایک لفظ سچا ثابت ہوگا۔ میں آپ کو اپنے الفاظ میں شرفو کی یہ کہانی مختصراً سناتا ہوں۔ شرفو نے شانتی کو یہ کہانی سنانے سے پہلے کہا کہ جس طرح شانتی اپنے جاگیردار باپ کی ستائی ہوئی ہے اس طرح شرفو بھی ایک ہندو جاگیردار کے ہاتھوں دھتکارا ہوا آدمی ہے۔

شرفو متوسط طبقے سے ذرا کم درجے کے خاندان کا فرد تھا۔ باپ چھوٹی سی دکان داری کرتا تھا۔ اس کی دکان اس کے اپنے گاؤں میں تھی۔ شرفو بچپن سے ہی دماغی لحاظ سے اور جسمانی لحاظ سے بھی چست اور چالاک لڑکا تھا۔ اس نے چند جماعتیں پڑھ لی تھیں اور مسجد میں قرآن بھی پڑھا تھا۔ اس کی عمر باپ کا ہاتھ بٹاتے اور کھیلتے کودتے گزر رہی تھی اور اس کی عمر انیس بیس سال ہو گئی۔

شرفو کے باپ کی دوستی ایک سرکردہ ہندو کے ساتھ تھی۔ ایک کم درجہ شخص کی دوستی ایک سرکردہ فرد کے ساتھ نہیں ہو سکتی تھی اور یہ فرق بھی تھا کہ شرفو کا باپ مسلمان تھا اور اس کا دوست ہندو تھا لیکن شرفو کے باپ نے اس سرکردہ ہندو کے دو تین ایسے کام کئے تھے کہ اس نے شرفو کے باپ کو اپنا دوست کہنا شروع کر دیا۔ اس ہندو نے دیکھا کہ شرفو اپنے باپ کی دکان میں ہاتھ بٹاتا ہے تو اس نے محسوس کیا کہ شرفو کا الگ ذریعہ معاش بنایا جا سکتا ہے۔ اس نے ذریعہ معاش یہ بنایا کہ شرفو کو رائے سندر داس جیسے ہی ایک جاگیردار کے ہاں ملازم رکھوا دیا۔

یہ ملازمت کچھ اس طرح تھی کہ وہ جاگیردار کے گھر کچھ کام کاج کرتا تھا اور کھیتوں میں کام کرنے والے مزارعین پر بھی نگرانی کرتا اور ان کا کچھ حساب کتاب رکھتا تھا۔ میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ شرفو بڑا ذہین اور چست و چالاک نوجوان تھا اس لیے جاگیردار نے اسے اپنے ملازمین اور مزارعین میں ذرا اونچا مقام دے دیا تھا۔

اس جاگیردار کی ایک بڑی بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی۔ بہت ہی شوخ اور ناچنے کودنے والی لڑکی تھی۔ وہ شرفو پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئی۔ شرفو سے وہ ذاتی کام لینے لگی۔ وہ تو مہاراجوں کا خاندان تھا جس میں ہندوؤں والی ذہنی گھٹن نہیں تھی اور کوئی اخلاقی پابندیاں بھی نہیں تھیں۔ اس لڑکی نے آہستہ آہستہ شرفو کو اپنا دوست بنا لیا۔ شرفو نے بتایا کہ اس لڑکی میں شرم و حجاب والی کوئی بات نہیں تھی۔

لڑکی کی شادی ہو گئی۔ وہ ایک بڑا گاؤں تھا۔ شادی اسی گاؤں ہوئی اور ایسے آدمی کے ساتھ ہوئی جو بہت ہی بدصورت اور بھدے جسم کا آدمی تھا۔ اس کا قد تو کوئی تھا ہی نہیں۔ بمشکل پانچ فٹ اور ایک دو انچ ہوگا۔ پیٹ بہت بڑھا ہوا اور پلپلے جسم کا جوان آدمی تھا۔ اس کے مقابلے میں لڑکی بہت خوبصورت تو نہیں تھی لیکن اچھی شکل و صورت والی اور گوری چٹی تھی۔

شادی کے بعد جب وہ اپنے سسرال سے آئی تو بہت ہی نالاں اور شاکی تھی۔ یہ خاوند اسے نہ صرف یہ کہ اچھا نہیں لگا بلکہ اس کے دل میں خاوند کے خلاف نفرت پیدا ہو گئی تھی۔ شرفو کو اس نے صاف لفظوں میں بتا دیا کہ اس خاوند کے ساتھ وہ زندگی نہیں گزار سکتی اور اگر گزارنی ہی پڑی تو وہ دوستی کسی اور کے ساتھ لگا لے گی۔

اس لڑکی کے الفاظ کچھ اس طرح تھے کہ جسم اور رنگ روپ سے بھینسا لگتا ہے لیکن بھینسا تو طاقت کی علامت ہوتا ہے۔ اس شخص میں طاقت تو ہے ہی نہیں، یوں لگتا ہے جیسے اس کے جسم میں پانی بھرا ہوا ہو۔

اس لڑکی نے یہ جو کہا تھا کہ وہ کسی اور کے ساتھ دوستی لگا لے گی، اس سے اس کی مراد پیار محبت والی دوستی نہیں تھی بلکہ جسمانی تسکین تھی۔ اس نے شرفو کو ہی دوست بنا لیا۔ وہ سسرال میں دو چار دن ہی گزارتی اور ایک دو دنوں کے لیے اپنے ماں باپ کے ہاں آ جاتی تھی۔ اس کے سسرال اسی گاؤں میں تھے اور ان کا گھر کوئی زیادہ دور نہیں تھا۔ اپنے ماں باپ کے ہاں آ کر وہ شرفو کو بلا لیتی اور اس کے ساتھ نہایت بیہودہ باتیں اور حرکتیں کرتی تھی۔ شرفو ڈرتا بھی تھا اور یہ بھی کہتا تھا کہ وہ اس کے باپ کا نمک کھاتا ہے اور وہ نمک حرامی نہیں کرے گا لیکن شرفو کو اس لڑکی نے دھمکیاں دینی شروع کر دیں کہ وہ اسے صرف نوکری سے ہی نہیں نکلوائے گی بلکہ اس پر یہ الزام لگائے گی کہ شرفو نے اس کی عزت پر حملہ کیا

ہے۔

شرفو مجبوری کے تحت اس کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا اور لڑکی نے اسے چلا لیا۔ شرفو کو وہ پیسے دیتی رہتی تھی۔ اس کا اصل خاوند تو وہ تھا جس کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی لیکن عملاً اور در پردہ اس نے شرفو کو اپنا خاوند بنا لیا تھا۔

یہ تو بڑا ہی پرانا ڈرامہ ہے جو زمانہ قدیم سے ان خاندانوں میں کھیلا جا رہا ہے اور کھیلا جاتا رہے گا جن خاندانوں میں بے انداز دولت آ جاتی ہے۔ ان خاندانوں سے عزت و آبرو رخصت ہو جاتی ہے۔ شہزادیاں اپنے غلاموں کے ساتھ یہی کھیل کھیلتی رہی ہیں اور اب امیر کبیر گھرانوں کی بالغ لڑکیاں اپنے ڈرائیوروں کے ساتھ بھاگ نکلتی ہیں یا انہیں کھلونا بنائے رکھتی ہیں۔ شرفو کا ایسی ہی ایک راجکماری کے ہاتھوں میں کھلونا بن جانا کوئی حیران کر دینے والی بات نہیں تھی۔

ڈیڑھ پونے دو سال بعد جاگیردار کی اس بیٹی نے ایک بچے کو جنم دیا۔ ماں تو گوری چٹی تھی لیکن بچے کا رنگ شرفو کی طرح سانولا تھا۔ بچے کے نقش و نگار نکھرے تو صاف پتہ چلتا تھا کہ یہ شرفو کا بچہ ہے۔ چار پانچ مہینوں بعد عورتوں نے کہنا بھی شروع کر دیا کہ بچہ تو بالکل شرفو پر گیا ہے۔ یہاں سے شرفو کی بدبختی شروع ہو گئی۔

بچے کی پیدائش سے چند مہینے پہلے ہی لڑکی کے خاوند نے شک و شبہ شروع کر دیا تھا کہ اس کی بیوی اسے دھوکہ دے رہی ہے اور غالباً اس کا یہ ملازم شرفو اس کام میں ملوث ہے۔ یہ شک ابھرنے لگا تو لڑکی کے گھر تک پہنچا۔ لڑکی نے شرفو کو بتایا تھا کہ اس کے گھر والے شک کرنے لگے ہیں لیکن لڑکی نے شرفو کو حوصلہ دیا کہ اس سے کوئی پوچھے تو دلیری سے جواب دے کہ یہ سب بکواس ہے لیکن بچے نے پیدا ہو کر پردے ہی اٹھا دیئے۔

ایک دن لڑکی کے باپ نے شرفو اور اس لڑکی کو عین موقع پر پکڑ لیا۔ لڑکی کا باپ، میرے خیال میں، ان پر نظر رکھے ہوئے تھا اور انہیں موقع پر پکڑنے کی کوشش میں تھا۔ ایسا موقع پیدا ہو گیا اور لڑکی کو صرف لعن طعن کی گئی لیکن شرفو کی زندگی خطرے میں پڑ گئی۔ اُسے اس قدر مارا پیٹا گیا کہ وہ بے ہوش ہو گیا۔

ہوش میں آیا تو اس کے کانوں میں یہ الفاظ پڑے کہ آج ہی رات اسے غائب کر دو اور اس کی لاش کا نشان بھی نہ ملے۔ شرفو کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔ وہ اپنے گھر چلا گیا

اور اگلے روز جاگیردار نے دو آدمی ساتھ لا کر شرفو کے باپ کی بھی پٹائی کروا دی اور کہا کہ لڑکا اس کے حوالے کیا جائے۔

شرفو نے اپنی پٹائی اور بے عزتی تو برداشت کر لی تھی، باپ کی پٹائی اس سے برداشت نہ ہو سکی لیکن وہ اتنے بڑے جاگیردار پر جوابی حملہ کرنے کے قابل نہ تھا۔ حملہ تو دور کی بات ہے وہ اپنے اور اپنے خاندان کے دفاع کے قابل بھی نہیں تھا۔ دو دوستوں نے اسے کہا کہ وہ یہاں سے بھاگ جائے ورنہ جاگیردار یا اس کی بیٹی کا خاوند اسے مروا دے گا۔ میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہ ہندوؤں کی اکثریت کا علاقہ تھا اور مسلمانوں کی وہاں کوئی حیثیت نہیں تھی۔ کسی مسلمان کو قتل کر کے پھینک دینا ہندوؤں کے لیے کوئی بڑی بات نہیں تھی۔

شرفو کبھی گاؤں سے باہر نہیں نکلا تھا وہ جاتا تو جاتا کہاں لیکن ظلم و تشدد اور پھر جان کے خطرے کو دیکھتے ہوئے وہ بھاگ نکلا۔ پانچ چھ میل دور ایک گاؤں سے گزرا تو وہیں بیٹھ گیا۔ اسے ایک مسلمان ملا جس سے اسے پتہ چلا کہ اس گاؤں میں زیادہ تر آبادی مسلمان کسانوں کی ہے۔ شرفو نے اسے وہ سب سنا ڈالی جو اس پر بیتی تھی۔ اس دوران گاؤں کے تین چار آدمی وہاں آن بیٹھے اور سب نے شرفو کا رونا سنا اور وہ مشتعل ہو گئے لیکن ان کا اشتعال ہندوؤں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔ وہ اکٹھے بیٹھ کر اور اِدھر اُدھر دیکھ کر ہندوؤں کو برا بھلا کہہ سکتے تھے جو انہوں نے کہا اور دل کا غبار نکال لیا۔

اتنے میں ایک اور آدمی آ گیا۔ اسے انہوں نے بتایا کہ یہ لڑکا فلاں گاؤں سے بھاگ آیا ہے اور بھاگنے کی وجہ کیا ہے۔ شرفو کے آنسو بہے جا رہے تھے اور وہ کہتا تھا کہ وہ جائے کہاں!...... اس آدمی نے جو ابھی آیا تھا، کچھ بھی نہ کہا، جھک کر شرفو کا بازو پکڑا اور اسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ایک گھر میں لے جا کر ایک ادھیڑ عمر آدمی کے پاس بٹھا دیا اور کہا کہ اس کی کہانی سنو۔ شرفو نے اسے بھی وہ سنا دی جو اس پر بیتی تھی۔ اس شخص نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا، مت گھبرا بچے، تو اب میری پناہ میں ہے۔

اس طرح شرفو کا تعارف کمالے ڈاکو سے ہوا اور کمالے نے اسے اپنی پناہ میں لے لیا۔ شرفو نے مجھے بیان دیتے ہوئے بتایا کہ کمالے نے اس کے ساتھ کچھ ایسی باتیں کیں جیسے وہ اندازہ کرنا چاہتا ہو کہ شرفو عقل اور ہوش کے لحاظ سے کتنے پانی میں ہے۔ شرفو تھا ہی

ذہین اور ہوشیار اور بہت ہی سمارٹ نوجوان تھا۔ کمالا جہاندیدہ آدمی تھا، سمجھ گیا کہ یہ نوجوان اس کے کام آ سکتا ہے اور اسے پناہ میں لے کر کچھ فائدہ ہی ہو گا۔

کمالا ڈاکو سلطانہ ڈاکو اور اس قسم کے تاریخی حیثیت والے ڈاکوؤں کی سطح کا آدمی نہیں تھا لیکن بڑا استاد قسم کا ڈاکو تھا اور دور دور تک اس کا نام جانا پہچانا جاتا تھا۔ شرفو کو جب کمالے کی اصلیت معلوم ہوئی تو وہ گھبرایا نہیں بلکہ خوش ہوا کہ وہ ٹھیک ٹھکانے پر پہنچ گیا ہے۔ شرفو جب مجھے بیان دے رہا تھا، اس سے تقریباً تین سال پہلے وہ کمالے کے پاس پہنچا تھا۔ کمالے کے ہاں پہلی شام اس نے جو کھانا کھایا وہ اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں کھایا تھا۔ کمالے کے تین چار آدمی بھی کھانے پر ساتھ تھے اور سب سے شرفو کا تعارف ہوا۔ کمالے کی بیوی ایک خوبصورت عورت تھی جو سراپا پیار اور شفقت تھی۔ شرفو وہیں کا ہو کے رہ گیا۔ ان تین سالوں میں شرفو نے ڈکیتی کی پانچ وارداتوں میں شمولیت کی تھی اور کمالے نے اسے اپنے گینگ کے لیے ہر لحاظ سے فٹ پایا تھا۔

تھانیدار کی حیثیت سے مجھے چاہئے تھا کہ میں اس سے ان وارداتوں کی تفصیلات پوچھتا۔ ان میں سے بعض وارداتیں عدم پتہ قرار دے دی گئی تھیں یعنی کوئی سراغ نہیں ملا تھا کہ یہ وارداتیں کس نے کی ہیں۔ میں اپنے نمبر بنانے کے لیے ان وارداتوں کے متعلق شرفو سے بیان لے کر ان ملزموں کو گرفتار کرا سکتا تھا لیکن میں نے شرفو سے ایسی کوئی بات نہ پوچھی۔ اس کی بجائے میں نے اسے یہ کہا کہ وہ جب مجسٹریٹ کو اپنا بیان دے گا تو یہ بات بیان میں ہرگز شامل نہ کرے کہ وہ گھر سے بھاگا تھا یا کیوں بھاگا تھا اور وہ کمالے ڈاکو کے ساتھ رہا ہے۔ میں نے اس پر یہ پردہ صرف اس لیے ڈالا تھا کہ یہ کیس ہندو مسلم کشیدگی کا کیس بن گیا تھا۔ ایک مسلمان کی حیثیت سے میں شرفو کو بچانا اور ہندوؤں کو ذلیل کرانا چاہتا تھا۔ رائے سندر داس کو تو میں نے عدالت میں خراب کرنے کا عہد کر لیا تھا۔

شرفو نے یہ ساری بات شانتی کو ریلوے لائن سے کچھ دور بیٹھ کر بڑے جذباتی انداز سے سنائی اور اسے کہا کہ اب وہ اپنی دنیا کا شہزادہ ہے۔ اس نے شانتی سے نہ کہا کہ وہ اس کے ساتھ چلی چلے۔ شانتی نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ شرفو نے اسے ایسی ترغیب دی ہی نہیں تھی کہ وہ اس کے ساتھ چلے اور وہ اسے عیش کروائے گا۔ شانتی نے یہ کہا تھا کہ وہ شرفو کی اس ساری داستان سے متاثر ہو گئی تھی اور جب بات اس کے باپ جیسے ایک جاگیردار

کی سامنے آئی تو شانتی کے جذبات مشتعل ہو گئے۔

شرفو شانتی کو دراصل یہ بتا رہا تھا کہ مر جانا کوئی حل نہیں اور نہ کوئی بہادری ہے، بہادری یہ ہے کہ انسان اپنے دشمنوں کو زندہ رہ کر دکھائے۔

شانتی نے اسے کہا کہ وہ تو مرد ہے اور مرد کئی راستے نکال سکتا ہے اور خطرے بھی مول لے سکتا ہے لیکن ایک عورت میں اتنی ہمت نہیں ہوتی اور عورت جب اس کی طرح اکیلی اور بے وسیلہ ہو تو وہ سوائے مرنے کے کچھ بھی نہیں کر سکتی۔ اس طرح ان کے درمیان باتیں ہوتی رہیں اور شرفو اسے قائل کرتا رہا کہ وہ اپنے گھر چلی جائے۔

شانتی نے اپنے بیان میں مجھے کہا کہ وہ شرفو کے کردار سے بہت متاثر ہوئی۔ وہ تو ڈاکوؤں کا ساتھی تھا اور اس نے صاف کہا تھا کہ وہ کوئی شریف آدمی نہیں۔ ایسے بدکردار آدمی کو ایک ایسی نوجوان اور حسین لڑکی مل گئی تھی جو اپنی حفاظت کرنے کے قابل نہیں تھی، اس شخص سے کچھ اور ہی توقع تھی لیکن وہ تو اتنی توجہ دے ہی نہیں رہا تھا کہ شانتی کو اگر وہاں خراب نہ کرے تو ورغلا اور بہلا پھسلا کر ساتھ لے جائے۔ شرفو کوئی بوڑھا آدمی تو نہیں تھا، پچیس سال کے لگ بھگ تو اس کی کل عمر تھی۔ شانتی ہچکیاں لے لے کر رونے لگی اور اس نے اپنے آپ کو شرفو کے حوالے کر دیا۔

''اگر میرے ساتھ چلنا چاہتی ہو تو دو شرطیں ہیں''___ شرفو نے شانتی سے کہا___ ''تمہیں اسلام قبول کرنا پڑے گا اور پھر ہماری باقاعدہ شادی ہو گی اور تم باقی عمر میرا ساتھ نبھاؤ گی۔ میں تمہیں کوئی خواب نہیں دکھا رہا۔ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ شہزادیوں جیسی زندگی گزارو گی''۔

اختصار کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے میں ان دونوں کے بیانات کو یہاں پر ختم کرتا ہوں کہ شانتی شرفو کے ساتھ چلی گئی اور شرفو اسے وہاں سے سیدھا کمالے کے گاؤں لے گیا۔ دونوں نے کمالے کو یہ ساری بات سنائی۔ یہ نہ سمجھیں کہ اتنی خوبصورت لڑکی دیکھ کر کمالے کی نیت خراب ہو گئی ہو گی۔ شرفو کو یہ لڑکی مفت اور بلاتردد مل گئی تھی اور کمالا شرفو کا استاد ہی نہیں بلکہ روحانی باپ تھا۔ وہ شرفو سے کہہ سکتا تھا کہ ایک دو دن لڑکی کو اس کے پاس رہنے دے لیکن کمالے نے لڑکی سے پوچھ کر یہ یقین کر لیا کہ لڑکی اپنی رضا و رغبت سے شرفو کے ساتھ آئی ہے۔ پھر اس سے پوچھا کہ وہ اپنی مرضی اور آزادی سے اسلام قبول کرنا

چاہتی ہے یا کسمپرسی اور خوف زدگی کے عالم میں؟

شانتی نے اسے بتایا کہ شرفو نے اسے ایسی کوئی ترغیب اور کوئی لالچ نہیں دیا نہ اسے خوف زدہ کیا تھا۔ اس نے صاف کہہ دیا کہ وہ مسلمان ہو جانے میں ہی تسکین اور اطمینان سمجھتی ہے اور وہ اپنی مرضی سے شرفو کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہے۔ کمالے نے شانتی کو اپنی بیوی کے حوالے کر دیا۔

دو دنوں بعد کمالے نے گاؤں کے مولوی کو اپنے گھر بلایا اور تین چار معزز آدمی بھی اکٹھے کئے اور سب سے پہلے شانتی کو مولوی نے حلقہ بگوش اسلام کیا اور اس کے بعد اس کا نکاح شرفو کے ساتھ پڑھوا دیا۔ ان دونوں کو اس نے اپنے گھر نہ رکھا بلکہ اس گاؤں میں بھیج دیا جس گاؤں سے یہ دونوں پکڑے گئے تھے۔

شانتی جب اپنا بیان دے چکی تو میں نے اپنی دلچسپی کی خاطر اس سے پوچھا تھا کہ وہ اس نئی زندگی کو کیسا محسوس کر رہی ہے۔ وہ امیرانہ ٹھاٹھ باٹھ میں جنی پلی اور جوان ہوئی تھی لیکن اسے اس سے بالکل الٹ زندگی ملی۔ جرائم پیشہ خاوند اور دیہاتی ماحول۔ شانتی نے کہا کہ معلوم نہیں کیا وجہ ہے کہ وہ اسی دیہاتی ماحول میں خوش ہے اور اسے اپنی وہ امیرانہ زندگی یاد آتی ہی نہیں جس کا میں نے حوالہ دیا تھا۔ پھر اس نے کہا کہ وہ اپنے آپ میں تلخی سی کبھی کبھی ضرور محسوس کرتی ہے کہ اسے دھتکارا گیا تھا۔ شرفو کی وہ بہت تعریفیں کرتی تھی۔ شرفو نے اسے جسمانی طور پر ہی نہیں بلکہ جذباتی طور پر بھی بڑی خوبصورت پناہ دی تھی۔

میں نے جب دیکھا کہ ان دونوں کے الگ الگ لیے ہوئے بیانات ایک دوسرے کی تصدیق کرتے ہیں تو میں نے دونوں کو اکٹھا بٹھایا اور انہیں کچھ ہدایات دیں اور بڑی اچھی طرح سمجھا دیا کہ کورٹ میں کیا ہو گا اور وہ کیا کریں...... کوئی تھانیدار اس طرح نہیں کرتا لیکن مجھے ان دونوں کے ساتھ ذاتی دلچسپی تھی۔ دوسری بات یہ کہ میں شانتی کے باپ کو عدالت میں شرمسار کروانا چاہتا تھا۔

شرفو کو میں نے حوالات میں بند کر دیا اور شانتی کو روکے رکھا۔ قصبے کے ایک معزز مسلمان کو تھانے بلوایا۔ اسے میں اچھی طرح جانتا تھا اور وہ کبھی کبھار تھانے سلام دعا کے لیے آیا بھی کرتا تھا۔ میں نے باقاعدہ تحریر لکھ کر اور اس کے دستخط کروا کے شانتی کو اس کے حوالے کر دیا کہ اسے وہ اپنے گھر رکھے اور جب میں اطلاع دوں اسے مجسٹریٹ کی

عدالت میں حاضر کرے۔ قانون میں اس کارروائی کا خاص طریقہ لکھا تھا اور میں نے اس کے عین مطابق یہ کارروائی کی تھی۔

مجھے بتایا گیا کہ شرفو کا چچا آیا بیٹھا ہے۔ میں نے اسے بلا لیا۔ اس نے کہا کہ شرفو اس کا بھتیجا ہے اور وہ اس اطلاع پر آیا ہے کہ شرفو کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ میں نے اس سے دو چار باتیں پوچھیں تو پتہ چل گیا کہ یہ شخص شرفو کا چچا نہیں بلکہ کمالے ڈاکو کے گینگ کا آدمی ہے۔ میں نے اس پر ظاہر نہ ہونے دیا کہ میں اس کی اصلیت جانتا ہوں اور وہ شرفو کا چچا نہیں۔ میں کچھ خوش بھی ہوا کہ شرفو کا کوئی وارث آ گیا ہے جو اس کے لیے مددگار ثابت ہو گا۔ میں نے اس شخص سے کہا کہ کل علاقہ مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچ جائے اور کوئی معمولی سا ہی وکیل کر کے ضمانت کروا لے۔ اسے یہ کہہ دیا کہ شرفو کے خلاف کوئی جرم ثابت نہیں ہو گا اور دوسری پیشی پر وہ رہا ہو جائے گا۔

میں نے پیچھے ایک اور ضروری دستاویز کا ذکر نہیں کیا، وہ یہاں کرتا ہوں۔ یہ تھا شرفو اور شانتی کا نکاح نامہ۔ یہ میں نے اس کے گھر سے لے کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ یہ صحیح اور قانونی نکاح کا کاغذ تھا۔

اس قصبے میں درجہ اول مجسٹریٹ نہیں ہوا کرتا تھا۔ مجسٹریٹوں کی عدالتیں اور سیشن کورٹ اٹھارہ انیس میل دور شہر میں تھیں...... آپ نے آج کل کورٹوں میں دیکھا ہو گا کہ کئی کئی مہینے مقدموں کے چالان عدالتوں میں پیش نہیں کیے جاتے۔ ہمارے وقتوں میں چالان نہایت جلدی پیش کرنا پڑتا تھا پھر بھی کچھ دن لگ جایا کرتے تھے لیکن میں نے اتنی تیزی دکھائی کہ اسی روز ایف آئی آر کے مطابق شرفو کا چالان تیار کر لیا اور اگلے ہی روز شرفو اور شانتی کو ساتھ لے کر کورٹ میں پیش کر دیا اور چالان بھی مجسٹریٹ کے آگے رکھ دیا۔ میں اے ایس آئی کو بھیج سکتا تھا کیونکہ پہلی پیشی پر عموماً کوئی کارروائی نہیں ہوا کرتی لیکن میں خود گیا تاکہ مجسٹریٹ کو صحیح صورتِ حال بتا سکوں اور ایسی صورتِ حال پیدا کر دوں کہ مجسٹریٹ جلدی سے جلدی اس کیس کو نمٹا دے۔

میں نے مجسٹریٹ کو کیس کی نوعیت بتائی اور پھر نکاح نامہ پیش کر کے کہا کہ میں نکاح پڑھنے والے مولوی کو اور دونوں گواہوں کو پیش کروں گا۔ مجسٹریٹ نے شرفو اور شانتی سے پوچھا کہ وہ بیان دینے کے لیے تیار ہیں؟...... شانتی فوراً بولی کہ وہ ابھی بیان دینے کے

لیے تیار ہے۔ مجسٹریٹ اسے اپنے چیمبر میں لے گیا اور اپنے طریقے کے مطابق بیان لیا۔ پھر اس نے شرفو کا بیان لیا۔

اس نے ایک ہفتے کی اگلی پیشی کی تاریخ دے دی۔ وہ آدمی جو تھانے میں شرفو کا چچا بن کر آیا تھا، اپنے وکیل کے ساتھ عدالت میں موجود تھا۔ وکیل نے ضمانت کی درخواست پیش کی اور میں نے اس کی مخالفت نہ کی بلکہ ایسے اشارے دیئے کہ ضمانت ہو جانی چاہئے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مجسٹریٹ کا ذہن بالکل صاف تھا اور اس کیس میں کوئی الجھاؤ تھا ہی نہیں۔ شرفو کی ضمانت ہو گئی اور شانتی نے صاف کہہ دیا کہ وہ اپنے باپ کے ساتھ نہیں جائے گی بلکہ اپنے خاوند کے ساتھ جائے گی۔ مجسٹریٹ نے اسے شرفو کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی۔ شانتی کا باپ عدالت میں موجود تھا۔ اس کے منہ سے کوئی بات نکلی ہی نہیں۔

اگلی پیشی پر میں نے نکاح خواں اور دو گواہوں کو جنہوں نے نکاح نامے پر دستخط کیے تھے، عدالت میں پیش کر دیا۔ ایک ہی دن تینوں کی گواہیاں بھگت گئیں اور مجسٹریٹ نے فیصلے کے لیے تین دنوں کی تاریخ دے دی۔ اس روز شانتی کا باپ کچھ بولا لیکن مجسٹریٹ نے اسے زیادہ نہ بولنے دیا اور کہا کہ اس کی بیٹی بالغ ہے اور وہ عدالت میں بیان دے چکی ہے کہ اسے کسی نے اغوا نہیں کیا اور اپنی مرضی سے گھر سے نکلی تھی اور اپنی رضا اور رغبت سے مسلمان ہوئی اور شرفو کے ساتھ شادی کر لی۔

استغاثہ کا واحد گواہ شانتی کا باپ تھا۔ اگلی پیشی پر مجسٹریٹ نے شرفو کو بری کر دیا اور فیصلے میں لکھا کہ لڑکی اپنی مرضی سے گئی تھی اور وہ بالغ ہے اور اپنے متعلق خود فیصلے کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ شانتی کا باپ منہ لٹکائے ہوئے وہاں سے غائب ہو گیا۔ شرفو اور شانتی نے میرا بہت شکریہ ادا کیا۔ میں نے انہیں اتنا ہی کہا کہ اپنے آپ کو ہندوؤں سے بچا کر رکھنا۔

اب تو میں صحیح معنوں میں خوش تھا کہ شانتی کا کیس ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے اور مجھے زیادہ خوشی اس بات پر تھی کہ ہندوؤں کو بہت بری شکست ہوئی تھی لیکن میری خوشی چند دن ہی رہی۔ ایک صبح شانتی کا باپ بہت ہی بری جذباتی حالت میں تھانے آیا میں ابھی تھانے نہیں پہنچا تھا۔ وہ مجھے گھر سے بلوانا چاہتا تھا لیکن میرے سٹاف کے آدمیوں نے اسے کہا کہ وہ آنے ہی والے ہیں، انتظار کریں۔

میں تھانے کے احاطے میں داخل ہوا تو اسے برآمدے میں بنچ پر بیٹھے دیکھا۔ دھچکا سا لگا کہ یہ پھر کیوں آ گیا ہے!...... مجھے یہی توقع تھی کہ کوئی اور ڈرامہ تیار کر کے لایا ہے اور یہ مجھے خوار کر کے ہی رہے گا۔ میں ذرا تیز قدم اٹھاتا اس تک پہنچا۔ وہ اٹھ کر اور ذرا آگے ہو کر مجھے ملا۔ اس کا انداز اور چہرہ بتا رہا تھا کہ اس پر کوئی نئی مصیبت نازل ہوئی ہے۔

''میں تو لٹ گیا راؤ صاحب!''—— اس نے بڑی ہی مغموم اور ہاری ہوئی آواز میں کہا—— ''رات میرے گھر ایسا ڈاکہ پڑا ہے کہ گھر کا صفایا ہو گیا ہے''۔

یہ سن کر سب سے پہلے تو مجھے خوشی ہوئی کہ اس شخص کے گھر کا صفایا ہوا ہے۔ دوسرا خیال یہ آیا کہ یہ یقیناً انتقامی واردات ہے اور یہ شانتی نے کروائی ہوگی۔ پھر بھی میں نے ظاہری طور پر بہت ہی افسوس اور ہمدردی کا اظہار کیا اور اسے اپنے دفتر میں لے جا کر بٹھایا۔

اس نے اس واردات کی تفصیل یہ سنائی کہ آدھی رات کے وقت اس کے گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کی آنکھ کھل گئی، اسے اٹھنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ نوکر ڈیوڑھی میں سویا کرتا تھا اور ضرورت پڑنے پر دروازہ نوکر ہی کھولتا تھا۔ یہ جاگیردار کچھ حیران ہوا کہ آدھی رات کے وقت کون آ سکتا ہے۔ اتنے میں اسے باتوں کی آوازیں آنے لگیں اور اس نے محسوس کیا کہ یہ ایک آدمی نہیں بلکہ زیادہ ہیں۔ یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں کہ یہ ڈاکو ہوں گے۔ البتہ یہ سوچا کہ یہ جو کوئی بھی ہیں وہ صحن میں کیوں آ گئے ہیں اور نوکر نے انہیں بیٹھنے والے کمرے میں کیوں نہیں بٹھایا۔

وہ خود اٹھا اور دروازہ کھول کر باہر نکلا تو اس کے منہ پر ٹارچ کی روشنی پڑی۔ آنے والوں میں سے ایک نے نوکر سے کہا، لائٹ جلاؤ۔ نوکر نے لائٹ آن کر دی۔ تب جاگیردار نے دیکھا وہ چار آدمی تھے ان کے چہرے اور سر صافوں میں لپٹے ہوئے تھے۔ ان کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں ریوالور تھا اور باقی تینوں کے پاس خنجر تھے۔ ریوالور والے نے آگے بڑھ کر جاگیردار کا بازو پکڑ لیا۔

''گھر میں جو کوئی بھی ہے سب کو جگا کر ایک کمرے میں اکٹھا کر دو''—— اس ڈاکو نے کہا—— ''کسی نے اونچی آواز نکالی تو یہ ریوالور دیکھ لو۔ بغیر اطلاع ریوالور فائر ہوگا''۔

دوسرے تین آدمی برآمدے میں کمروں کے دروازے دیکھ رہے تھے۔ ایک نے

اپنے ساتھی سے کہا کہ یہ ہے وہ دروازہ...... مختصراً واقعہ یوں ہوا کہ جاگیردار نے گھر کے افراد کو جگا کر ایک کمرے میں اکٹھا کر لیا اور ڈاکو اندر آ گئے۔ نوکر کو بھی انہوں نے گھر کے افراد میں کھڑا کر دیا اور سب سے کہا کہ کوئی بھی منہ سے آواز نہ نکالے، ہم کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، اگر مرنے کا ارادہ ہے تو شور مچا لو۔

وہ ہندو تھے جو ڈاکوؤں سے ایسے ڈرے کہ شانتی کی ماں تو چکرا کر گر پڑی۔ ہندوؤں کی جگہ کوئی اور ہوتا تو بھی ڈاکوؤں کی دہشت ایسی ہوتی ہے کہ وہ ڈر کر ہونٹ سی لیتا۔ جاگیردار سندر داس نے مجھے بتایا کہ یہ چاروں اسی کمرے میں گئے جہاں ٹرنک اور اٹیچی کیس وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ ان میں سے کسی نے بھی اسے یہ نہیں کہا کہ ٹرنکوں کی چابیاں دے دو یا سیف خود ہی کھول کر مال ہمارے حوالے کر دو یا یہ کہ بتاؤ مال کہاں ہے۔ اس کی بجائے وہ چاروں اس کمرے میں گئے جیسے وہ اس گھر سے اچھی طرح واقف تھے۔

اس کمرے میں ان کی آوازیں آتی رہیں۔ سندر داس نے بتایا کہ اسے ایک آواز یہ سنائی دی—— ''سبز رنگ والا صندوق دیکھو اور باہر نکال لو''۔

پھر وہ آدمی اس کمرے میں آیا جس میں گھر کے افراد اکٹھے کھڑے کانپ رہے تھے۔ اس نے ایک دیواری الماری کھولی اور اس کے ایک شیلف میں سے کپڑے باہر پھینکے اور ان کے پیچھے رکھا ہوا چابیوں کا گچھا نکالا اور پھر ٹرنکوں والے کمرے میں چلا گیا۔ ان کی باتوں سے صاف پتہ چلتا تھا کہ انہیں معلوم تھا کہ زیورات، رقم اور قیمتی کپڑے کون کون سے ٹرنک میں ہیں اور انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ چابیاں کہاں رکھی ہیں۔ وہ گچھا ایک ڈاکو بغیر ڈھونڈے صحیح جگہ سے نکال کر لے گیا۔

''چمڑے والا بڑا اٹیچی کیس کھولو''—— اس کمرے سے یہ آواز باہر آئی—— ''وہ سارے کپڑے نکال کر سبز صندوق مین ڈال لو۔ تم جانتے ہو میں کون سے کپڑے کہہ رہا ہوں''۔

اس طرح ڈاکو پندرہ منٹ کے اندر اندر ایک صندوق ذرا بڑا اور ایک صندوق چھوٹا اٹھا کر گھر سے نکل گئے۔ جاتے جاتے ریوالور والا ڈاکو رک گیا اور اس نے گھر والوں سے کہا کہ کم از کم آدھا گھنٹہ وہ شور نہ کریں۔ اگر ان مین کسی نے اونچی آواز بھی نکالی تو آج

نہیں تو کل یا پرسوں تک مارا جائے گا۔ جاگیردار سندر داس نے مجھے بتایا کہ انہی صندوقوں میں اس کی ساری دولت تھی، سارے زیورات انہی میں تھے اور رقم بھی انہی میں تھی۔

''ایک بات بتائیں رائے صاحب!'' ــــ میں نے پوچھا ــــ ''وہ جو آپ نے آواز سنی تھی کہ چمڑے کے اٹیچی کیس سے کپڑے نکال لو، کیا وہ کوئی خاص کپڑے تھے؟ بہت ہی قیمتی کپڑے ہوں گے!''

''وہ شانتی کا اٹیچی کیس تھا'' ــــ سندر داس نے حقارت آمیز لہجے میں کہا ــــ ''اسے نئے سے نئے اور ایک سے بڑھ کر ایک قیمتی کپڑا خریدنے کا بہت شوق تھا۔ اس اٹیچی کیس میں اسی کی بڑی قیمتی ساڑھیاں اور سوٹ سلے ہوئے بھی تھے اور ان سلے کپڑے بھی''۔

میں فوراً سمجھ گیا بلکہ یوں کہیں کہ میرے شک کی تصدیق ہوگئی کہ یہ واردات شانتی نے کروائی ہے لیکن میں سندر داس کے موٹے مغز پر حیران ہوا کہ اسے یہ شک نہ ہوا کہ اس کی اپنی بیٹی نے گھر بھیدی کا کام کیا ہے۔ عام ذہن کا آدمی بھی سوچ سکتا ہے کہ ڈاکو آئے اور بغیر کسی کی رہنمائی کے اسی کمرے میں گئے جس میں ٹرنک رکھے تھے اور ان میں سے کسی نے کہا تھا کہ سبز رنگ والا ٹرنک الگ کر کے اٹھا لو۔ پھر انہوں نے یہ پوچھے بغیر کہ چابیاں کہاں ہیں، خود ہی الماری سے کپڑوں کے پیچھے سے چابیاں نکال لیں۔

ڈکیتی کی کامیاب وارداتیں گھر بھیدی کے بغیر ممکن نہیں ہوتیں۔ ممکن تب ہی ہوتی ہیں کہ ڈاکو گھر والوں کو ڈرا دھمکا کر چابیاں لیتے ہیں اور ان ہی سے پوچھتے ہیں کہ مال کہاں رکھا ہے۔ اس ڈکیتی میں بھی یقیناً گھر بھیدی شامل تھا اور وہ صرف شانتی ہو سکتی تھی۔ میں نے سندر داس کو ایسا اشارہ دیا ہی نہیں کہ یہ اس کی اپنی بیٹی نے اس پر جوابی حملہ کیا ہے اور یہ واردات کمالے ڈاکو کے گینگ کی ہے اور ان چاروں میں شرفو بھی ہوگا۔

میں نے محرر ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر ایف آئی آر تحریر کرائی اور سندر داس کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ میں نے نوکر سے، گھر کے افراد سے اور سندر داس سے پوچھا کہ کسی نے ڈاکوؤں میں سے کسی کی شناخت کی ہوگی۔ سب نے کہا کہ ان کے چہرے ڈھانپے ہوئے تھے۔ وہ صرف یہ بتا سکے کہ انہوں نے کپڑے کس قسم کے پہن رکھے تھے اور رنگ کیا کیا تھے۔

میں واردات والے کمرے میں گیا اور ٹرنک دیکھے۔ چابیوں کا گچھا فرش پر پڑا تھا اور چمڑے والا اٹیچی کیس بھی فرش پر پڑا اور کھلا ہوا تھا۔ اس میں سے کچھ کپڑے فرش پر بکھرے ہوئے تھے اور یہ سب استعمال شدہ ذرا پرانے کپڑے تھے۔ سندر داس کی بیوی نے بتایا کہ جو کپڑے گئے ہیں وہ سب نئے اور قیمتی تھے۔ میں نے یہ اٹیچی کیس اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس پر مجھے توقع تھی کہ کھولنے والے ڈاکو کی انگلیوں کے نشانات موجود ہوں گے۔ اتفاق سے اس اٹیچی کیس پر ہلکی ہلکی گرد پڑی ہوئی تھی، اس پر مجھے صاف نشان نظر آئے۔ نظر نہ آتے تو بھی ہر تھانے میں ایسا انتظام موجود ہوتا ہے کہ آنکھوں سے نظر نہ آنے والے نشانات ایک خاص کاغذ پر منتقل کر لیے جاتے ہیں۔

میں نے وہاں اور جو کچھ دیکھنا تھا وہ دیکھا اور جاگیردار کی بیٹھک میں بیٹھ کر جو کارروائی تحریری یا زبانی کرنی تھی وہ کی اور کھوجی کو ساتھ لے کر باہر نکلا۔ اس زمانے میں کھوجی بہت ہی مددگار ثابت ہوتے تھے۔ وہ تو ایسے ماہر تھے کہ ملزموں کے ٹھکانوں تک پہنچا دیتے تھے۔ آج کل تو کھوجی ناپیدا ہی ہو گئے ہیں۔ میرے علاقے کا کھوجی بہت ہی قابل اور تیز نگاہ آدمی تھا۔ میں جاگیردار کے گھر سے نکلا تو مجھے کچھ سوجھ نہیں رہی تھی کہ کس طرف جاؤں جہاں مجھے کوئی کھرا مل جائے۔ سندر داس کی گلی سے ایک اور گلی ملتی تھی جو ذرا آگے جا کر کھیتوں میں پہنچا دیتی تھی۔ میں نے سوچا کہ قصبے سے نکلنے کا قریبی راستہ یہی ہے۔ دو تین عقل مند سے آدمیوں نے میری مشکل ذرا آسان کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ کھیتوں میں انہوں نے فصل روندی ہوئی دیکھی ہے اور صاف پتہ چلتا ہے کہ اس فصل میں سے چار پانچ آدمی گزرے ہیں۔

میں کھیتوں والی گلی میں سے گزر کر کھیتوں میں گیا۔ وہ آدمی ٹھیک کہتے تھے۔ فصل بمشکل دو یا زیادہ سے زیادہ اڑھائی فٹ اوپر اٹھی تھی۔ یہ گندم کی فصل تھی۔ گلی کی سطح ذرا اونچی اور کھیت ذرا نیچے تھے۔ گلی کے سرے پر کھڑے ہو کر صاف نظر آتا تھا کہ ان کھیتوں میں سے کچھ آدمی گزرے ہیں۔ وہ ڈاکو ہی ہو سکتے تھے۔ عام لوگ مینڈھوں پر چلا کرتے ہیں۔

کھوجی پہلے کھیت کے اندر چلا گیا اور فصل میں جھک کر دیکھتا اگلی مینڈھ تک جا پہنچا۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے بلایا اور میں اس کے پاس چلا گیا۔ اس نے کھرے

دیکھ لئے تھے۔ سمجھنے والی بات یہ تھی کہ یہ ڈاکو ہی ہو سکتے تھے، انہیں بھاگنے کی جلدی تھی اس لیے مینڈھوں پر نہ گئے۔ اس کی بجائے فصل میں سے گزرتے تو راستہ چھوٹا ہو جاتا۔

کھیتوں سے آگے ہندوؤں کا مرگھٹ تھا۔ وہاں بھی بجھے بجھے سے کھرے نظر آئے اور اس طرح کھوجی مجھے خاصی دور تک لے گیا۔ آگے ایک ندی آ گئی اور اس کنارے وہ کھرے پھر نظر آئے جو لکڑی کے پل کی طرف جا رہے تھے اور پل تک ختم ہو گئے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ڈاکو پل سے گزر کر آگے گئے ہیں۔

پل کے پار چلے گئے۔ وہاں سے ایک چوڑی پگڈنڈی گزرتی تھی جس سے تانگے اور بیل گاڑیاں وغیرہ گزرتی تھیں۔ پگڈنڈی کے کنارے کچھ جگہ خالی تھی یعنی وہاں کوئی فصل یا سبزہ یا درخت نہیں تھا۔ وہاں جو زمین پر نشانات تھے وہ واضح تھے۔ ایک تانگہ رکا تھا اور انسانی نقوش پایا کھرے ایک دوسرے میں گڈمڈ تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ یہاں کوئی تانگہ پہلے سے کھڑا تھا یا ہو سکتا ہے روکا گیا ہو اور ڈاکو تانگے میں سوار ہوئے اور چلے گئے۔ اس سے آگے جانا کوئی فائدے مند نہیں تھا۔ اتنا پتہ چل گیا کہ ڈاکو کس رخ کو گئے ہیں۔

میں ایک بات کھوجیوں کے متعلق کہنا چاہوں گا۔ کھوجی ایسے کمالات دکھاتے تھے کہ اس فن کو نہ جاننے والے لوگ حیرت زدہ ہو جاتے تھے۔ وہ ایسے راز سناتے تھے جیسے زمین نے انہیں اپنی زبان سے یہ بات بتائی ہو۔ اس واردات کی تفتیش میں میرے ساتھ جو کھوجی تھا، اس نے ندی کے پل تک دو جگہوں پر مجھے کھرے دکھا کر کہا کہ یہ جس آدمی کا کھرا ہے، اس وقت بڑا ٹرنک اس آدمی کے سر پر ہے اور یہ دوسرا کھرا ہے اس کے سر پر چھوٹا ٹرنک ہے۔ آگے جا کر اس نے دو کھرے دکھائے اور کہا کہ بڑے ٹرنک والا پیچھے رہ گیا اور چھوٹے ٹرنک والا دائیں طرف گیا ہے۔

کھوجی دراصل کھرے دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ اس شخص نے کوئی وزن اٹھا رکھا ہے۔ شاید آپ یقین نہ کریں لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک بار ایک عورت کا کھرا اٹھاتے ہوئے ایک کھوجی نے مجھے کہا تھا کہ اس عورت کے پیٹ میں بچہ ہے۔ آخر وہ عورت پکڑی گئی تھی، پتہ چلا کہ وہ سات ماہ کی حاملہ تھی...... یہ کھوجی بالکل جانگلی اور ان پڑھ ہوتے تھے۔ انگریزوں نے تو انہیں بے ساختہ خراج تحسین پیش کیا تھا۔ پنجاب میں ضلع ساہیوال (پہلے منٹگمری) کے کھوجی اور بہاولپور کے صحرا کے کھوجی سارے ہندوستان میں خصوصی شہرت

رکھتے تھے۔

میں اتنا جان گیا کہ ڈاکو میرے ساتھ والے تھانے کے علاقے کے کسی گاؤں کے ہیں۔ یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ پورا شک کمالے ڈاکو پر تھا اور گھر بھیدی کا کام شانتی نے کیا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ میں شانتی کی مدد کرنا چاہتا تھا لیکن یہ تو میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ڈکیتی کی اتنی بڑی واردات کو گول کر دوں۔ یہ بھی دیکھیں کہ ڈکیتی کس کے گھر میں ہوئی تھی۔ اگر میں ذرا سی بھی کوتاہی کرتا تو یہ شخص میرے بالائی انگریز افسروں کے پاس جا کر مجھے الٹا لٹکا دینے کا حکم لے آتا۔

میں اگلی صبح سویرے سویرے چل پڑا اور ساتھ والے علاقے کے تھانے میں چلا گیا۔ پہلے بتایا کہ وہاں کا ایس ایچ او ایک ہندو سب انسپکٹر تھا۔ اسے ساری واردات سنائی اور کہا کہ مجھے شک ہے کہ ملزم اس کے علاقے میں ہیں اور یہ واردات کمالے کی ہے۔ اس ہندو سب انسپکٹر نے اسی وقت اپنے پانچ چھ کانسٹیبلوں اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو تیار کیا۔ میرے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبل تھے۔ ہم تانگے پر گئے تھے۔ ہندو سب انسپکٹر نے کہا کہ ابھی چلو، کمالے کے گاؤں پر چھاپہ مارتے ہیں۔

ہم گئے۔ کمالے کا گاؤں تقریباً تین میل دور تھا۔ وہاں پہنچے تو کانسٹیبلوں کو گاؤں کے اردگرد کھڑا کر دیا اور کمالے کے گھر جا دھمکے۔

کمالا گھر میں مل گیا۔ اس کی خانہ تلاشی لی۔ کھرلی پر بھینس بندھی تھی۔ کھرلی بھی کھنگال ڈالی۔ وہاں سے کچھ بھی نہ ملا لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ یہ واردات کمالے نے نہیں کی۔

یہ ہندو سب انسپکٹر کمالے کے دو ساتھیوں سے واقف تھا۔ ان میں ایک اسی گاؤں میں رہتا تھا۔ وہ بھی گھر مل گیا اور اسے بھی پکڑ لیا اور دونوں کو تھانے لے آئے۔ ہندو سب انسپکٹر نے دونوں کو میرے حوالے کیا اور میں انہیں اپنے تھانے لے آیا۔

میں نے "حکایت" میں کسی انسپکٹر صاحب کی ایک کہانی میں بڑی اچھی بات پڑھی تھی۔ انہوں نے بالکل صحیح لکھا تھا کہ قتل کی واردات کا کوئی بھی سراغ نہ ملے یعنی یہ اندھا قتل ہو تو بھی قاتل کو پکڑا جا سکتا ہے۔ صرف یہ پتہ چل جائے کہ قتل کا باعث کیا تھا لیکن ڈکیتی اور چوری کی وارداتوں کی تفتیش انتہائی مشکل ہوتی ہے، بڑے تجربہ کار منجھے ہوئے

انسپکٹر بھی ہار جاتے ہیں۔ انگریز کسی پولیس آفیسر کو ترقی دیتے وقت یہ دیکھتے تھے کہ اس نے ڈکیتی اور چوری کی کتنی وارداتوں کی تفتیش کی ہے۔ میں اب اسی مشکل تفتیش میں پھنس گیا تھا۔ سراغ تو صحیح ملا تھا لیکن جن دو ملزموں کو میں پکڑ لایا تھا ان کے خلاف کوئی شہادت نہیں تھی اور ان کے گھروں سے کچھ بھی نہیں برآمد ہوا تھا۔ ہمارے پاس اس قسم کے مشتبہوں یا ملزموں کے لیے ایک ہی طریقہ ہوتا تھا جسے پولیس کی زبان میں تھرڈ ڈگری یعنی تشدد یا ایذا رسانی کہتے ہیں۔

میں نے کمالے کو اپنے پاس بٹھا کر کہا کہ مجھے یقین ہے کہ یہ واردات اس نے خود کی ہے یا اپنے ساتھیوں سے کروائی ہے اور مجھے یہ بھی یقین ہے کہ گھر بھیدی شانتی تھی۔ کمالا اتنا ڈھیٹ اور پختہ کار ڈاکو تھا کہ میری اس بات کے جواب میں اس کے ہونٹوں پر طنزیہ مسکراہٹ آ گئی۔ مجھے یہی توقع تھی کہ وہ صرف باتوں سے نہیں ماننے لگا۔

اس کے ساتھی کو الگ بٹھا کر سمجھایا کہ وہ مان جائے اور میں اسے وعدہ معاف گواہ بنا لوں گا لیکن اس نے بے گناہی اور مظلومیت کی ایسی ایکٹنگ کی کہ میں تھانیدار نہ ہوتا، کوئی عام شہری ہوتا تو مجھے اس پر رحم آ جاتا اور میری جیب میں جتنے پیسے ہوتے وہ میں اسے دے دیتا۔ میں اچھی طرح سمجھتا تھا کہ یہ شخص ایکٹنگ کر رہا ہے۔

میں نے دونوں کو اے ایس آئی اور ایک پرانے ہیڈ کانسٹیبل کے حوالے کر دیا۔ دونوں تھرڈ ڈگری کے ماہر تسلیم کئے جاتے تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ فوراً ہی انتہا تک نہ پہنچیں بلکہ پہلے تھوڑا تھوڑا تشدد کریں اور اس کے بعد آخری سٹیج والی ایذا رسانی تک پہنچ جائیں۔

میں آپ کو ایک اور دلچسپ بات سناتا ہوں۔ ان وقتوں میں ڈکیتی ایک باقاعدہ پیشہ تھا جس طرح قفل شکنی، نقب زنی اور چوری وغیرہ الگ الگ پیشے تھے۔ کوئی جرائم پیشہ جب بوڑھا ہو جاتا تو وہ اپنی اولاد کو اسی لائن پر ٹریننگ دیتا تھا اور فخر سے کہا جاتا تھا کہ بیٹا باپ کا نام روشن کرے گا۔ ان جرائم پیشہ لوگوں کو معلوم تھا کہ کبھی پکڑے گئے تو پولیس تشدد کی انتہا کر دے گی، چنانچہ جہاں یہ لوگ جرائم کی ٹریننگ حاصل کرتے تھے وہاں اپنے جسموں کو بھی پتھر بنا لیتے تھے۔ یہ اس طرح کہ اپنے جسموں پر وہ تشدد کرواتے اور انتہا درجے کی ایذائیں برداشت کرنے کی پریکٹس کرتے رہتے تھے۔ آپ کو شاید معلوم ہو کہ نامی گرامی

باکسر باکسنگ کی ٹریننگ تو حاصل کرتے ہی ہیں لیکن اتنی ہی ضروری ٹریننگ یہ ہوتی ہے کہ اپنے جسم کو زیادہ سے زیادہ اور شدید سے شدید تر ضربیں برداشت کرنے کے قابل بنانے یعنی پٹائی برداشت کرنے کی مشق کرتے ہیں۔ اس طرح ان کے جسم پتھر بن جاتے تھے۔

میں نے کمالے اور اس کے ساتھی کو دیکھا کہ وہ بڑے ہی مضبوط پتھر ثابت ہو رہے تھے۔ نہ انہیں بھوک کی پرواہ تھی نہ پیاس کی۔ میں نے اس دوران کمالے کو الگ بٹھا کر کہا بھی کہ دیکھو بھائی، مجھے گناہگار نہ کرو اور مان جاؤ۔ اس نے مسکرا کر کہا کہ آپ اپنی زور آزمائی کر لیں۔ وہ تو ہو ہی رہی تھی جو میں نے جاری رکھوائی اور سات آٹھ دن گزر گئے۔

آپ اس وقت کی پولیس کی فرض شناسی اور قانون سے وفاداری ملاحظہ فرمائیے...... ملحقہ تھانے کا ایک ہیڈ کانسٹیبل میرے پاس آیا۔ اسے ہندو ایس ایچ او نے بھیجا تھا اور مجھے وہاں بلوایا تھا۔ پیغام میں یہ بھی تھا کہ امید ہے مال برآمد ہو جائے گا اس لیے میں کسی ایسے شخص کو ساتھ لاؤں جو مال کی شناخت کر سکے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ رائے سندر داس یا اس کے گھر کا کوئی آدمی ساتھ ہونا چاہیئے۔

میں نے اس تھانے کے ہیڈ کانسٹیبل کو بصد شکریہ رخصت کر دیا اور سندر داس کو بلوا لیا۔ وہ آیا تو اسی کے تانگے پر میں نے ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور تانگے میں روانہ ہو گئے۔

میں آپ کو یہیں بتا دیتا ہوں کہ یہ چھاپہ کیوں مارا جا رہا تھا اور اس تھانے کا ہیڈ کانسٹیبل مجھے کیا بات سنا گیا تھا۔ ایک اور گاؤں میں ایک آدمی رہتا تھا جس کی عمر چالیس سال سے کچھ زیادہ تھی۔ سب جانتے تھے کہ اس کا دوستانہ کمالے ڈاکو کے ساتھ تھا۔ کمالے اور اس شخص کے گاؤں میں اڑھائی تین میل کا فاصلہ تھا اور دونوں ایک دوسرے کے گاؤں جاتے رہتے تھے۔

یہ شخص مسلمان تھا، رحیما کہلاتا تھا اور اس کا پورا نام عبدالرحیم خان تھا۔ جرائم پیشہ بالکل نہیں تھا لیکن اچھی شہرت والا بھی نہیں تھا۔ اس کے اخلاق اور کردار کا اندازہ اسی سے ہو جاتا تھا کہ وہ ایک ڈاکو کا بڑا گہرا دوست تھا۔ شرابی کبابی بھی تھا اور اعلیٰ درجے کا جوا بھی کھیلا کرتا تھا۔ اس نے ایک مہینہ یا ڈیڑھ مہینہ پہلے پرانی بیوی کی موجودگی میں اٹھارہ انیس سال کی ایک خوبصورت لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تھی۔ لڑکی غریب سے گھرانے کی تھی اور

ظاہر ہے کہ رحیمے نے اس شادی کے عوض لڑکی کے باپ کو کیش دیا تھا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا کہ یہ نئی نویلی دلہن اس شادی پر بہت ہی خوش تھی۔ اگر یہ دیہاتی لڑکی رحیمے جیسے خاوند کے ساتھ خوش تھی تو تصور میں لایا جا سکتا تھا کہ اس لڑکی کا کردار اور فطرت کیا ہوگی۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا تھا کہ مخبروں نے تھانے میں بتایا کہ اس لڑکی کو رحیمے نے بڑے ہی قیمتی اور ریشمی کپڑے پہنانے شروع کر دیئے ہیں اور لڑکی گاؤں کے گھر گھر جا کر اپنی نمائش کرتی ہے۔ جس چیز نے مخبر کو یا گاؤں والوں کو شک میں ڈالا وہ دو چیزیں تھیں۔ اس کے گلے میں ایک سونے کی زنجیر تھی جس کے ساتھ پان کے پتے کی شکل کا چھوٹا سا ہیرا یا کوئی بڑا ہی قیمتی اور چمک دار پتھر تھا اور دوسری چیز ایک انگوٹھی تھی جو کوئی امیر کبیر عورت ہی خرید یا بنوا سکتی تھی ایک تو یہ وزنی تھی دوسرے اس کی شکل وصورت بڑی دلکش تھی اور اس میں بھی ہیرا یا کوئی قیمتی پتھر جڑا ہوا تھا۔ دیہات میں کوئی کتنا ہی امیر کیوں نہ ہوتا، انگوٹھیوں کا ڈیزائن سب کا ایک ہی جیسا ہوتا تھا۔

اس گاؤں کے نمبردار کو، مخبر کو اور دو چار اور آدمیوں کو یہ شک ہو گیا تھا کہ رحیمے کے گھر چوری کا مال آیا ہے۔ کسی نے کمالے کے ایک ساتھی کو رحیمے کے گھر آتے جاتے دیکھا اور ڈکیتی کی واردات انہی دنوں ہوئی تھی۔

اس شک کو رحیمے کی پہلی بیوی نے یقین میں بدل دیا۔ اس عورت میں ایک نقص تو یہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ پرانی ہو گئی تھی اور شکل وصورت سے کچھ ایسی ویسی تھی۔ رحیما اس کے ساتھ بڑا ہی برا سلوک کرتا تھا۔ اب اس نے ایک نوجوان لڑکی کے ساتھ شادی کر لی تو پہلی بیوی کی اگر کچھ حیثیت تھی تو وہ بھی ختم ہو گئی۔ اس نے یہ انتقامی کارروائی کی کہ کسی ایک عورت کو بتا دیا کہ ایک رات یہاں کہیں سے کوئی مال آیا تھا۔ مال دو ٹرنک بتائے گئے۔

اس پہلی بیوی نے اس عورت سے کہا کہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ اس نے یہ راز فاش کیا ہے ورنہ رحیما اسے مار مار کر جان سے ہی مار ڈالے گا...... ہیڈ کانسٹیبل مجھے یہ بات بتا کر گیا تھا۔

میں شانتی کے باپ سندر داس کے ساتھ اس تھانے میں پہنچ گیا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ عصر کی نماز کا وقت ہو گیا تھا۔ ہندو تھانیدار تو جیسے میرے انتظار میں ہی تھا۔ اس نے چار پانچ کانسٹیبل ساتھ لیے اور ہم سب رحیمے کے گاؤں کو روانہ ہو گئے۔ گاؤں دور نہیں تھا،

بمشکل دو میل کا فاصلہ تھا۔

دستور کے مطابق کانسٹیبلوں کو گاؤں کے ارد گرد پھیلا دیا کہ کوئی شخص گاؤں سے باہر نہ جا سکے۔ ہم رحیمے کے گھر کے دروازے کو پاؤں سے زور سے ٹھوکر مار کر اندر چلے گئے۔ رحیما صحن میں چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ دو تھانیداروں کو دیکھ کر وہ گیند کی طرح اچھلا اور کھڑا ہو گیا۔ اس کے چہرے کا رنگ لاش کی طرح ہو گیا اور مجھے شک ہوا کہ اس کا سر ڈول رہا ہے اور یہ بے ہوش ہو کر گر پڑے گا۔

رحیمے کی بڑی ہی خوبصورت اور نوجوان بیوی بھی صحن میں کچھ کر رہی تھی اور خوف زدگی کے عالم میں ہمیں دیکھنے لگی۔ ہندو سب انسپکٹر نے اس لڑکی کو اپنے پاس بلایا۔ اس کے گلے میں سونے کی زنجیر تھی اور انگلی میں بڑی ہی قیمتی انگوٹھی تھی۔

سب انسپکٹر نے اس سے پوچھا کہ یہ دونوں چیزیں کہاں سے لائی ہے یعنی یہ کہ یہ اسے ماں باپ نے دی ہیں یا رحیمے نے...... لڑکی نے رحیمے کی طرف دیکھ کر کہا کہ انہوں نے دیئے ہیں۔

”رحیمے!“ — سب انسپکٹر نے کہا — ”مجھے اس سنار کا اتہ پتہ بتا دو جس سے تم نے یہ دونوں چیزیں بنوائی یا بنی بنائی خریدی ہیں۔ میں ابھی اسے یہاں بلوا لیتا ہوں اور اگر وہ دور ہے تو میں وہاں تک جا کر تصدیق کروں گا“۔

رحیما جرائم پیشہ تو تھا نہیں کہ اپنے تجربے کے مطابق کوئی فریب کارانہ بات کرتا۔ وہ آنکھیں پھاڑے ہندو انسپکٹر کو دیکھتا ہی رہا اور اس کے منہ سے کوئی بات نکلی ہی نہیں۔ میں جان گیا کہ یہ چوری کا مال ہے۔ میں نے اس کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر اسے زور سے کمرے کی طرف گھمایا پھر ذرا پیچھے ہٹ کر اس کی کمر میں سیدھی لات اتنی زور سے ماری کہ وہ آگے کو جا کر چارپائی سے ٹکرایا اور زمین پر گر پڑا۔ ہندو سب انسپکٹر کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی۔ رحیما اٹھ رہا تھا کہ سب انسپکٹر نے اس کی پیٹھ پر بڑی ہی زور سے بید مارا اور رحیما پیٹ کے بل پھر زمین سے جا لگا۔ اب ہم نے اسے اٹھنے کی مہلت دے دی۔

”مال کی نشاندہی فوراً کر دو“ — میں نے کہا — ”ہم کسی پکے ثبوت اور شہادت کی بنا پر یہاں پہنچے ہیں“۔

”ذرا دیر نہ کرو“ — ہندو سب انسپکٹر نے کہا — ”فوراً ہمیں مال تک لے جاؤ

ورنہ سارے گاؤں کے سامنے ننگا کر کے تمہاری پٹائی ہوگی''۔

وہ سر جھکائے ہوئے ایک طرف چل پڑا۔ ایک کمرے کے باہر زنجیر چڑھی ہوئی اور تالا لگا ہوا تھا۔ وہ ایک اور کمرے میں گیا اور چابی لا کر تالا کھول دیا۔ اندر گئے تو وہاں بھوسا اور چارہ وغیرہ رکھے ہوئے تھے۔ کیا اس نے بھوسے اور چارے کو اتنا قیمتی سمجھا تھا کہ کمرے کو مقفل رکھا ہوا تھا؟

ہم نے گاؤں کے دو آدمیوں کو ساتھ لے لیا تھا کہ وہ برآمدگی کے گواہ بنیں۔ رحیمے نے بھوسے کی طرف اشارہ کیا۔ ہندو سب انسپکٹر نے اسے کہا کہ خود مال نکال کر ہمارے سامنے رکھ دے۔

رحیمے نے ہاتھوں سے بھوسا ہٹانا شروع کیا تو کچھ دیر بعد دو ٹرنک سامنے آ گئے۔ اس نے ٹرنک گھسیٹ کر ہمارے آگے رکھ دیئے۔ ان میں ایک ٹرنک سبز رنگ کا تھا اور دوسرے کا رنگ کچھ اور تھا۔

رائے سندر داس ہمارے ساتھ تھا۔ اس نے فوراً دونوں ٹرنک پہچان لیے اور جب ٹرنک کھولے تو اس میں جو زیورات تھے اور جو نقدی تھی وہ بھی اس نے پہچان لی۔ اس وقت ہم نے اس کی توجہ رحیمے کی نوجوان بیوی کی طرف کی اور اس کے گلے کی زنجیر اور انگلی کی انگوٹھی دکھا کر پوچھا کہ ان دونوں چیزوں کو بھی وہ پہچانتا ہے؟

''یہ دونوں چیزیں تو میں نے پہلے ہی پہچان لی تھیں''۔۔۔۔ سندر داس نے کہا۔۔۔۔ ''میں آپ کو اس سنار کا نام اور ایڈریس بھی بتا دیتا ہوں جس سے یہ دونوں چیزیں میں نے شانتی کی شادی کے لیے خود بنوائی تھیں''۔

چونکہ مال رحیمے کے قبضے سے برآمد ہوا تھا اس لیے سارا الزام اسی پر آتا تھا۔ اس نے ہم دونوں تھانیداروں کو الگ کر کے اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنا لیں اور وہ باقی ملزموں کو بلکہ اصل ملزموں کو گرفتار کروا دے گا۔ اس نے صاف بتا دیا کہ یہ واردات کمالے نے کی ہے اور مال سیدھا اس کے گھر میں آیا تھا جو اس نے بھوسے کے نیچے چھپا دیا تھا۔ اس مال کی تقسیم ڈیڑھ دو مہینے بعد ہونی تھی۔

ضابطہ فوجداری اور قانون شہادت کے تحت ہم نے جو کاغذی اور دیگر کارروائی کرنی تھی وہ کی اور رحیمے کو ہتھکڑی لگا کر اور مال تانگے میں رکھوا کر میں وہاں سے رخصت ہونے

لگا۔ ہندو سب انسپکٹر کو میں نے گلے لگا کر دل کی گہرائیوں سے شکریہ ادا کیا اور وہاں سے چل پڑا۔

برآمدگیوں اور نشاندہیوں کے سلسلے میں پولیس کو کچھ لمبی چوڑی کارروائیاں کرنی ہوتی ہیں۔ میں وہ ساری بیان کر کے کہانی کو بدمزہ نہیں کرنا چاہتا۔ میرے تھانے میں آ کر رحیمے نے کمالے کے تین ساتھیوں کی بھی نشاندہی کر دی جو ڈاکہ زنی کے اصل مجرم تھے۔ رحیمے کو میں نے وعدہ معاف گواہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ رحیمے سے میں نے اقبالی بیان لے لیا اور اب اسے یہ بیان قلم بند کروانے کے لیے مجسٹریٹ کے پاس بھیجنا تھا۔

کمالے کو اپنے پاس بلایا۔ اس کی حالت کوئی اچھی نہیں تھی لیکن اتنے دن اس نے بڑی ہمت اور حوصلے سے بڑا ہی سخت ٹارچر برداشت کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ اس کا جگری یار وعدہ معاف گواہ بن گیا ہے۔ اسے دونوں ٹرنک بھی دکھائے۔ پھر اسے کہا کہ اس کے لیے بہتر یہی ہے کہ اقبالی بیان دے دے تاکہ وعدہ معاف گواہ کا جھنجھٹ ختم ہو جائے۔

کمالا صرف ڈاکو ہی نہیں تھا بلکہ قانون سے بھی کچھ واقفیت رکھتا تھا اور یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس قسم کی صورتِ حال میں اس کی کون سی چال بہتر اور کارآمد ہوگی۔ میں نے اس کے ساتھ دوستانہ باتیں کیں۔ رحیمے کی نشاندہیوں کے مطابق شرفو اس واردات میں شامل نہیں تھا جس کی مجھے خوشی ہوئی۔ رحیما شرفو کو بہت ہی اچھی طرح جانتا تھا بلکہ ان کے دوستانہ مراسم بھی تھے۔

چونکہ شرفو کا اس واردات میں نام نہیں آتا تھا اس لیے کمالے سے میں نے کہا کہ اپنی تفتیش میں شانتی کا میں اشارہ بھی نہیں دوں گا کہ اس نے گھر بھیدی کا کام کیا تھا نہ اس میں شرفو کا ذکر آئے گا...... کمالا گہری سوچ میں چلا گیا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ ہتھیار ڈالنے پر آ گیا ہے۔ وہ خود بھی سمجھتا تھا کہ اس قسم کی صورتِ حال میں اقبالی بیان دے دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔ میں اسے دوسرے پہلو کی طرف لے گیا وہ اس طرح کہ اسے کہا کہ مجھے بہت خوشی ہے کہ اس نے ایک ہندو لڑکی کو مسلمان کرا کے شرفو کے ساتھ بیاہ دیا ہے اور یہ ہندوؤں پر بہت بڑی چوٹ ہے۔ میں نے کمالے سے ہمدردی کا اظہار بھی کیا اور کہا کہ میں دل سے اسے چاہتا ہوں لیکن قانون نے اور اس تھانیداری نے مجبور کر رکھا ہے۔

کمالا منجھا ہوا استاد تھا اور میں بھی اچھا خاصا تجربہ رکھتا تھا۔ میرا واسطہ ایسے ہی جرائم پیشہ لوگوں کے ساتھ رہتا تھا اس لیے میں ان لوگوں کی نفسیات سمجھتا تھا۔ اپنے تجربے کے مطابق کمالے کو اقبالی بیان پر راضی کر لیا۔ اسے کہا کہ وہ مجھے شانتی کی بات سنا دے لیکن یہ اقبالی بیان میں شامل نہ کرے نہ میں کورٹ میں شانتی کو پیش کروں گا۔

اس نے بتایا کہ شانتی اپنے باپ کے خلاف اس قدر بھڑکی ہوئی تھی کہ وہ کہتی تھی کہ اس کے باپ کو اور اس کے بھائی کو قتل کر دیا جائے۔ کمالے نے اسے سمجھا بجھا کر ایسی عداوت دل سے نکال دی۔ کمالا ان دونوں کو قتل کرا سکتا تھا لیکن کمالے نے اسے بتایا کہ وہ بڑا پرانا ڈاکو ہے لیکن اس کے ہاتھوں ابھی تک ایک آدمی بھی قتل نہیں ہوا نہ ہی وہ کسی کو قتل کرنا چاہتا ہے۔ اس نے شانتی کو یہ بھی بتایا کہ وہ راہ جاتے لوگوں کو لوٹنے والا آدمی نہیں نہ ہی وہ متوسط طبقے کے گھروں میں ڈاکے ڈالتا ہے اور لوٹ مار کے مال میں سے غریبوں کا حصہ الگ کر دیتا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اب تک وہ ایسی دس گیارہ لڑکیوں کی شادیاں کروا چکا ہے جن کی شادیاں صرف اس لیے رکی ہوئی تھیں کہ ان کے والدین کے پاس جہیز پورا کرنے کے لیے پیسے نہیں تھے۔

کمالے نے مجھے بتایا کہ شانتی اپنے باپ پر کوئی نہ کوئی ضرب ضرور لگانا چاہتی تھی۔ اس نے آخر کمالے کو ڈکیتی کی اس واردات پر راضی کر لیا۔ شانتی نے اسے زمین پر انگلیوں سے اپنے گھر کا نقشہ بنا کر سمجھایا کہ کون سے کمرے میں ٹرنک صندوق وغیرہ رکھے ہیں اور مال کون کون سے صندوق میں ہے۔ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کمالے نے بتایا کہ شانتی نے خاص طور پر کہا تھا کہ چمڑے کے اٹیچی کیس میں اس کے کچھ سلے ہوئے اور کچھ اَن سلے کپڑے پڑے ہیں اور زیورات کی بھی دو تین چیزیں رکھی ہیں وہ ضرور نکال لائیں۔ میں نے چمڑے کے اٹیچی کیس کا خاص طور پر اس کہانی میں ذکر کیا ہے۔

کمالے نے بتایا کہ شانتی نے یہ بھی کہا تھا کہ اس کے گھر میں دو نالی بندوق ہے اور اگر اس کا بھائی جگن ناتھ مزاحمت کرے یا ذرا سا بھی ہلے بولے اسے گولی مار دینا......

کمالے نے یہ واردات اپنے تین ساتھیوں کے ساتھ خود کی تھی۔ گھر میں داخل ہونے کا جو طریقہ اختیار کیا تھا کہ وہ کمالے نے ہی سوچا تھا۔

اب ہماری باتیں دوستانہ انداز میں ہو رہی تھیں اور چونکہ ذکر شانتی کا آ گیا تھا اس

لیے شرفو کا ذکر بھی آیا۔ کمالے نے بڑے شگفتہ لہجے میں بتایا کہ شرفو اس واردات میں شامل ہونا چاہتا تھا۔ کہتا تھا کہ اس گھر میں شانتی کی جو بے عزتی اور خواری ہوئی ہے اس کا انتقام وہ خود لے گا لیکن کمالا عقل والا آدمی تھا۔ اس نے شرفو سے کہا کہ نئی نئی تمہاری شادی ہوئی ہے اور یہ بھی سوچ لو کہ لڑکی کا کوئی اور ٹھکانہ نہیں، اگر تم پکڑے گئے تو شانتی کا کیا بنے گا!...... اس کے باوجود شرفو واردات کے لیے جانے کی ضد کر رہا تھا۔ آخر کمالے نے اسے ڈانٹ دیا اور ایک استاد کی حیثیت سے حکم دیا کہ وہ اپنے گھر بیٹھا رہے۔ کمالے نے دراصل شانتی کا بھلا سوچا تھا۔ وہ خطرہ اب آ ہی گیا تھا۔ اگر شرفو پکڑا جاتا تو شانتی پھر بے آسرا اور بے گھر ہو جاتی۔ اندازہ کیجئے کمالے کے کردار کا حالانکہ وہ ڈاکو تھا۔

کمالے نے بھی اقبالی بیان دے دیا اور مجسٹریٹ کے سامنے جا کر بیان قلم بند بھی کرا دیا۔ اس کے تینوں ساتھی گرفتار کر لیے۔ مقدمہ چلا اور آخر سب کو چار چار سال سزائے قید دی گئی۔ اگر کمالے کی ہسٹری کورٹ میں پیش کر دی جاتی تو اسے زیادہ سزا مل جاتی لیکن اسے ایک تو اقبالی بیان نے فائدہ دیا اور پھر میں نے اپنے بیان میں کہا ہی نہیں کہ کمالا پیشہ ور ڈاکو ہے اور متعدد وارداتیں کر چکا ہے۔

اس طرح میرا یہ کیس ختم ہو گیا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا کہ رائے سندر داس کا گیا ہوا مال اسے واپس مل گیا تھا جس کا مجھے کچھ افسوس سا تھا لیکن یہ افسوس یہ سوچ کر خوشی میں بدل جاتا تھا کہ اس کی بیٹی اس کے منہ پر تھوک کر ایک جرائم پیشہ آدمی کی بیوی جا بنی اور اس نے اسلام قبول کر لیا تھا اور اس زندگی میں وہ پوری طرح خوش تھی۔

***

بنگال کے بچھو

جرم وسزا کی تحقیقاتی کہانیاں آپ نے بہت پڑھ لی ہوں گی اور پڑھتے ہی رہتے ہوں گے۔ آپ جان گئے ہوں گے کہ چوری، ڈکیتی، رہزنی، جیب تراشی جیسی وارداتوں کا مقصد صرف لوٹنا ہوتا ہے، البتہ قتل ایسی واردات ہے جس کے متعدد باعث اور مقاصد ہوتے ہیں۔ اسی لئے تفتیش کرنے والا پولیس آفیسر سب سے پہلے قتل کا باعث معلوم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ معلوم ہو جائے تو تفتیش کی کامیابی سہل ہو جاتی ہے۔

یہ تو تفتیش اور تحقیقات کے اسرار و رموز ہیں۔ ان پر مزید تبصرے سے گریز کروں گا۔ مجھے کہنا یہ ہے کہ آپ جان گئے ہوں گے کہ اپنے ملک میں کس نوع کے جرائم کا ارتکاب ہوتا ہے اور ہر جرم کا خفیہ پس منظر کیا ہوتا ہے۔ میں دو وارداتوں کی کہانی سناؤں گا جن میں ایک واردات اغوا کی ہے اور دوسری قتل کی۔ آپ نے ان دونوں وارداتوں کی طرح کی ایک نہیں کئی کہانیاں پڑھی ہوں گی لیکن میں جو وارداتیں سنا رہا ہوں ان کا پس منظر آپ کو حیرت میں ڈال دے گا اور شاید آپ کو یہ اشارہ بھی مل جائے کہ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے میں کیسے کیسے عوامل کارفرما تھے۔

میں نے اپنی پہلی کہانی میں پٹنہ (صوبہ بہار بھارت) سے اپنے خاندان کی ہجرت کے متعلق لکھا تھا۔ میں ڈھاکہ چلا گیا اور اپنے خاندان کو وہیں آباد کر دیا۔ وہاں تو ہر طرف ہندو چھائے ہوئے تھے۔ ٹریڈ اور انڈسٹری، اہم سرکاری محکمے، پولیس اور عدالتیں وغیرہ ہندوؤں کی مٹھی میں تھیں۔ بڑے بڑے ٹھیکے ہندوؤں کے پاس تھے۔ مسلمانوں کے ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی ٹھیکیداریاں تھیں اور سرکاری محکموں میں اگر مسلمان سرکاری عہدوں پر فائز تھے تو وہ چھوٹے چھوٹے عہدے تھے۔ بنگالی مسلمانوں کی اکثریت دیہات میں زراعت پیشہ اور شہروں میں مزدوری پیشہ تھی۔

آزادی کے وقت ہندو آبادی کی ایک بڑی تعداد مشرقی پاکستان سے ہندوستان چلی گئی لیکن جو ہندو مشرقی پاکستان میں رہ گئے تھے ان کی تعداد اچھی خاصی تھی۔ انہوں نے تجارتی منڈیاں اور ٹھیکیداریاں اپنے قبضے میں رکھیں۔

1948ء میں مجھے راجشاہی کے پولیس سٹیشن کا چارج لینے کے لیے بھیج دیا گیا۔ وہاں کوئی زیادہ کام نہیں تھا۔ وقت اور ملک کے حالات ایسے تھے جن میں جرائم کا ارتکاب بہت ہی کم ہوتا تھا لیکن دسمبر 1948ء میں ایک مسلمان بنگالی لڑکی کے اغوا کی واردات ہو گئی۔

پولیس سٹیشن جو اشخاص رپورٹ لے کر آئے، ان میں لڑکی کا باپ تھا۔ اس کے لباس اور حلئے کو دیکھ کر کوئی شک نہیں رہتا تھا کہ غربت اور محنت مزدوری میں عمر گزر رہی ہے۔ اس کی عمر 55 سال سے زیادہ تھی۔ دوسرا شخص لاپتہ لڑکی کا بڑا بھائی تھا۔ اس کا حلیہ اور لباس باپ سے بہتر تھا۔ ان دونوں کے ساتھ ایک تیسرا شخص بھی تھا جو ہندو تھا۔ یہ لڑکی کے بھائی کی عمر کا معلوم ہوتا تھا...... 27/28 سال...... امیرانہ لباس میں ملبوس تھا۔ تعارف یوں ہوا کہ پٹ سن کا تاجر اور اپنے باپ سے الگ کاروبار کرتا ہے۔ لاپتہ لڑکی کا باپ اس ہندو کی ایجنسی میں ملازم تھا۔

لاپتہ لڑکی کا نام عائشہ تھا۔ عمر 19/20 سال بتائی گئی۔ بچے پیدا کرنا بنگالیوں کی ہابی ہے۔ کھانے کو ملے نہ ملے، ڈھاکہ اور دوسرے بڑے شہروں کی فٹ پاتھوں پر پورے پورے خاندانوں کی صورت پڑے ہیں اور فٹ پاتھوں پر ہی بچے پیدا کئے چلے جا رہے ہیں۔ گمشدہ لڑکی عائشہ کے نو (غالباً دس) بہنیں اور بھائی تھے۔ عائشہ دوسرے نمبر پر تھی اور پہلے نمبر پر یہ بھائی تھا جو پولیس سٹیشن میں میرے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کا نام بدرالحق اور ہندو کا نام شرما موجمدار تھا۔ یہ سارے نام میری ڈائری میں لکھے ہوئے ہیں۔ کیس چونکہ اہم تھا اس لئے اس کے واضح اشارے ڈائری میں محفوظ کر لئے تھے۔

ان تینوں کو معلوم نہیں تھا کہ لڑکی کس طرح لاپتہ ہوئی۔ یہ بھی حتم و یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ لڑکی کو اغوا کیا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ لڑکی صبح باہر نکلی پھر واپس نہیں آئی۔ وہ ایک روز پہلے نکلی تھی۔ اگر یہ دسمبر 1948ء کی بجائے دسمبر 1947ء ہوتا تو یہ شک بعید از قیاس نہ تھا کہ لڑکی کو ہندوؤں نے اغوا کیا۔ اگست 1947ء اور اس کے بعد آنے والے چند مہینوں کے دوران مشرقی پاکستان میں ویسے ہی ہندو مسلم فسادات چلتے رہے تھے جیسے

ہندوستان کے متعدد صوبوں، خصوصیت سے، مشرقی پنجاب، کشمیر اور بہار میں ہو رہے تھے۔ مشرقی پاکستان میں ہندو ہندوستان کو بھاگ گئے تو تھے لیکن طاقتور ہندو بھی تھے جو بھاگے نہیں بلکہ انہوں نے مسلمانوں کے اس اکثریتی صوبے مشرقی پاکستان میں مسلمانوں کا خون بہایا تھا اور جہاں موقع ملا کسی مسلمان لڑکی کو اغوا کر کے ہندوستان لے گئے۔

اس ابتدائی عرصے میں دونوں ملکوں میں شہری امن اور قانون رہا ہی نہیں تھا۔ ہم پولیس والے ہی جانتے ہیں کہ ہم نے امن و امان کیسے کیسے جتنوں سے بحال کیا اور کس طرح قانون کی بالادستی بحال کی تھی۔ قائداعظمؒ مارچ 1948ء میں گورنر جنرل کی حیثیت سے مشرقی پاکستان آئے تھے۔ پولیس اور فوج کی انٹیلی جنس کے لیے راتوں کی نیندیں حرام ہو گئی تھیں۔

اس کے بعد مشرقی پاکستان میں فرقہ واریت کی وارداتیں ختم ہو گئی تھیں۔ بدیں وجہ میں نے یہ شک ذہن سے نکال دیا کہ عائشہ کو کسی ہندو نے مسلمان لڑکی سمجھ کر اغوا کر لیا ہو گا۔ میں نے اس کے باپ اور بھائی سے دو باتیں دریافت کیں۔ ایک یہ کہ کسی کے ساتھ دشمنی ہو گی اور دوسری یہ کہ کسی سے محبت ہو گی اور اس کے ساتھ شادی کرنے کے لئے اس کے پاس چلی گئی ہو گی۔

اس کے باپ اور بھائی نے دشمنی کا شک فوراً ہی رفع کر دیا۔ باپ نے کہا کہ ہم غریب لوگ کسی سے کہاں دشمنی مول لے سکتے ہیں۔ ہندو شرما موجمدار جوان کے ساتھ آیا تھا ابھی خاموش بیٹھا تھا۔ دشمنی کی بات ہو چکی تو ہندو نے اپنی گفتگو شروع کی۔

''یہ بے چارے پوری بات کہتے ڈرتے ہیں''۔۔۔ موجمدار نے کہا۔۔۔ ''یہ تو آپ کے پاس بھی نہیں آ رہے تھے۔ بابا (عائشہ کے باپ) نے مجھے بتایا کہ بڑی لڑکی کل صبح گھر سے نکلی تھی، آج صبح تک واپس نہیں آئی۔ بابا نے میرے خاندان کی بہت خدمت کی ہے۔ یہ رو رہا تھا۔ بہت شریف، دیانتدار اور وفادار آدمی ہے۔ میں نے اسے کہا اپنے بڑے بیٹے کو ساتھ لو اور پولیس سٹیشن جا کر رپورٹ لکھواؤ۔ یہ پولیس کے نام سے ہی ڈر گیا۔ میرے اصرار پر یہ اس بیٹے بدر کو ساتھ لے آیا۔ دونوں نے مجھے کہا کہ میں ان کے ساتھ چلوں۔ میں آ گیا۔ یہ آپ کو پوری بات نہیں بتا رہے۔ وہ مجھ سے سن لیں''۔

اس ہندو نے جو تفصیلی بیان دیا وہ میرے الفاظ میں اس طرح تھا کہ ان لوگوں کی کسی

کے ساتھ دشمنی نہیں تھی لیکن دو افراد ایسے تھے جن پر شک کرنے کا جواز موجود تھا۔ پنجاب کا رہنے والا ایک جواں سال آدمی عائشہ کے ساتھ شادی کا خواہشمند تھا۔ میری ڈائری میں اس کا نام عبدالخالق لکھا ہوا ہے۔ آزادی سے پہلے اس کا باپ بنگال پولیس میں ہیڈ کانسٹیبل ہوا کرتا تھا۔ عبدالخالق یہیں مشرقی بنگال میں پرورش پا کر جوان ہوا۔ تھوڑی سی تعلیم حاصل کر کے اس نے ایک ہندو ٹھیکیدار کی نوکری کر لی اور جب کچھ تجربہ حاصل ہو گیا تو اس ہندو سے الگ ہو کر چھوٹے پیمانے کی ٹھیکیداری شروع کر دی۔ واردات کے وقت اس کی عمر 27/28 سال تھی اور ابھی تک اس نے شادی نہیں کی تھی۔

اس کا باپ اپنے بیوی بچوں کے ساتھ پنجاب چلا گیا۔ وہ ریٹائر ہو گیا تھا۔ عبدالخالق کو بنگال اتنا اچھا لگا کہ یہیں کا ہو کر رہ گیا۔ یہیں رہنے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کا سپلائی اور ٹھیکیداری کا کاروبار چل نکلا تھا اور روز بروز ترقی کر رہا تھا۔ یہ بھی ذہن میں رکھ لیں کہ عائشہ کا بڑا بھائی بدر عبدالخالق کا ملازم تھا اور کچھ پڑھا لکھا بھی تھا۔ اس کے متعلق یہ باتیں جو میں سپردِ قلم کر رہا ہوں بدر نے بتائی تھیں اور کچھ موجمدار نے۔

موجمدار نے تفصیلات سناتے ہوئے بتایا کہ عائشہ کے باپ نے عبدالخالق سے وعدہ کر لیا تھا کہ وہ عائشہ کے ساتھ اس کی بات پکی کر دے گا۔ موجمدار کو پتہ چلا تو اس نے عائشہ کے باپ کو بتایا کہ عبدالخالق کو اپنی بیٹی نہ دے۔ جواز یہ پیش کیا کہ عبدالخالق شرابی کبابی آدمی ہے۔ علاوہ ازیں بنگالی بھی نہیں۔ یہ کسی بھی وقت یہاں سے اپنے وطن چلا جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ عائشہ کو یہیں چھوڑ جائے اور اگر ساتھ لے بھی گیا تو میں جانتا ہوں کہ پنجاب کے لوگ بنگال کی لڑکیوں کو بالکل پسند نہیں کرتے اس لئے وہاں جا کر وہ بہت پریشان ہو گی۔

میں زیادہ تفصیلات میں نہیں جا رہا، یہ نوٹ کر لیں کہ اس ہندو نے عبدالخالق کے خلاف ایسی زہرناک باتیں کیں کہ عائشہ کے باپ نے عبدالخالق کو بیٹی دینے سے صاف انکار کر دیا...... میں نے عائشہ کے باپ سے پوچھا کہ موجمدار کا یہ بیان کس حد تک سچ ہے۔ اس نے اس بیان کی تصدیق کر دی۔

''اب ایک بات صاف صاف بتاؤ''۔۔۔ میں نے باپ سے پوچھا۔۔۔ ''تم نے عبدالخالق کو بیٹی دینے سے انکار کر دیا تو اس کے بعد اس کا رویہ کیا تھا؟ کیا اس نے کبھی

تمہیں کوئی دھمکی دی تھی؟"

"اس نے دھمکی نہیں دی تھی" —— باپ نے جواب دیا —— "ناراض ہوتا تھا اور دو تین بار اس نے کہا تھا کہ مجھے ناراض نہ کرو ورنہ پچھتاؤ گے"۔

"تم اس کے ملازم ہو" —— میں نے بدر سے پوچھا —— "عبدالخالق کا تمہارے ساتھ رویہ کیسا تھا؟ کیا اس نے کبھی تمہیں ایسی دھمکی دی تھی کہ اسے تمہاری بہن نہ ملی تو وہ تمہیں نوکری سے نکال دے گا؟"

"میں آپ کو صحیح بات بتاتا ہوں" —— بدر نے جواب دیا —— "میرے ساتھ عبدالخالق صاحب کا رویہ بہت اچھا تھا، البتہ یہ کہتا تھا کہ اپنے باپ کو راضی کرو۔ میں تو راضی ہی راضی تھا لیکن میرا باپ نہیں مانتا تھا"۔

میری نگاہ میں عبدالخالق مشتبہ تھا اس لئے میں نے عائشہ کے باپ اور بھائی سے ایسی پوچھ گچھ شروع کر دی جسے ہم اپنی زبان میں بال کی کھال اتارنا کہا کرتے ہیں۔ یہاں ان تفصیلات کا ذکر مناسب نہیں لگتا، میں یہ بتا دیتا ہوں کہ اس تھکا دینے والے سوال و جواب کے سلسلے میں مجھے حاصل کیا ہوا۔

ایک یہ کہ عائشہ عام بنگالی لڑکیوں کی نسبت خوبصورت تھی۔ بنگال لڑکیاں سانولے رنگ کی ہوتی ہیں، آنکھیں موٹی اور ان میں عجیب سی کشش ہوتی ہے اور بال لمبے۔ ان میں بعض کے رنگ سانولے کی بجائے گندمی ہوتے ہیں اور اس رنگ کو خوبصورت لڑکیوں کا رنگ کہا جاتا ہے۔ بنگالی لڑکیوں کے قد چھوٹے رہ جاتے ہیں لیکن عائشہ کے متعلق پتہ چلا کہ عائشہ کا قد بنگال کے اوسط قد سے کچھ زیادہ تھا۔

پھر یہ پتہ چلا کہ عائشہ غریب گھرانوں کی لڑکیوں کی طرح مری مٹی فطرت کی لڑکی نہیں تھی، بلکہ اس میں ایک خاص قسم کی جرأت اور خود اعتمادی تھی۔

میں نے خصوصیت سے یہ دیکھا کہ موجمدار ان لوگوں کا مشیر اور ترجمان بنا ہوا تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے ان کے فیصلے یہی شخص کرتا ہے۔ عائشہ کے باپ کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے عائشہ کے متعلق اس کے فیصلے میں دوغلا پن ہے۔ وہ عائشہ کا ہاتھ عبدالخالق کے ہاتھ میں دینا چاہتا بھی تھا اور گریزاں بھی تھا۔ مجھے موجمدار کی ان مسلمانوں کے گھریلو معاملات میں مداخلت اچھی نہ لگی لیکن یہ میرا مسئلہ نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ عائشہ کا باپ بڑے عرصے

سے اس کا ملازم ہے اس لئے وہ اسے خوش رکھنے کی کوشش میں ہے۔

اس تفصیلی اور گہری پوچھ گچھ میں مجھے ایک مشتبہ اور ملا۔ وہ بہار کا ایک نوجوان مہاجر تھا۔ یہ تجارت پیشہ لوگ تھے۔ صوبہ بہار سے ہجرت کر کے مشرقی پاکستان آ گئے اور راجشاہی میں اپنا کاروبار چلا لیا۔ انہوں نے چاول کی آڑھت (ایجنسی) قائم کر لی تھی۔ اس بہاری کا نام نہ میرے ذہن میں محفوظ رہا نہ ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔ میں اسے بہاری ہی لکھوں گا۔

بدر اور موجمدار نے بتایا کہ یہ بہاری عائشہ کے پیچھے پڑا رہتا تھا اور اس کے ساتھ دوستی یا جائز ناجائز تعلقات پیدا کرنے کی کوشش میں رہتا تھا۔ وہ تو عائشہ کے گھر کے اردگرد بھی گھوم پھر جاتا تھا۔ عائشہ نے پریشان ہو کر بدر کو بتایا اور بدر نے عبدالخالق کو بتایا۔ بدر کی حیثیت اتنی کمزور تھی کہ وہ اس بہاری کے منہ نہیں آ سکتا تھا۔ یہ کام عبدالخالق نے کر دیا۔ اس نے ایک روز اس بہاری کو پکڑ لیا اور اسے ڈرا دھمکا کر ان حرکتوں سے باز آنے کو کہا۔ اس کے بعد اس بہاری نوجوان نے عائشہ کا پیچھا چھوڑ دیا۔

پتہ چلا کہ عائشہ کے باپ کو بھی اس بہاری کی بے ہودہ حرکتوں کا علم ہو گیا تھا اور اس نے موجمدار کو بتایا تھا۔ موجمدار نے بھی بہاری کو کچھ دھمکیاں دی تھیں۔

صوبہ بہار کے مہاجر مشرقی پاکستان کے بڑے شہروں میں منڈی پر چھاتے چلے جا رہے تھے۔ عائشہ کے خاندان جیسے بنگالی خاندان پہلے کی طرح نوکریاں اور محنت مزدوری ہی کرتے رہے۔ دوسری طرف عبدالخالق کے پاس جسمانی طاقت بھی تھی اور اس کا کاروبار بھی منفعت بخش تھا۔ میں نے ایسی بات کبھی سوچی بھی نہیں کہ پنجابیوں بہاریوں نے بنگالیوں کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ بنگالی پنجابیوں اور بہاریوں کے مقابلے میں کمزور لوگ تھے۔ اگر عبدالخالق نے لڑکی کو اس کی مرضی سے اس کے گھر سے نکال لیا اور اسے کہیں شادی کی نیت سے چھپا لیا تھا اور بہاری نے عائشہ کو انتقاماً کہیں باہر سے اغوا کر کے کہیں رکھ لیا تھا تو یہ ان دونوں کا انفرادی فعل تھا۔ ایسا انفرادی فعل کوئی بنگالی بھی کر سکتا تھا لہٰذا یوں کہنا کہ پنجابی اور بہاری بنگالیوں کے ساتھ بُرا سلوک کرتے تھے تو یہ بالکل غلط اور بے بنیاد الزام ہے۔

میں نے عائشہ کے باپ کے نام سے ابتدائی رپورٹ لکھ لی اور اس کا حلیہ وغیرہ بھی

تحریر کر لیا اور انہیں بھیج دیا۔ میں نے ان لوگوں سے عبدالخالق اور مذکورہ بہاری کے ایڈریس لے لئے تھے۔ پہلے میں نے ایک کانسٹیبل کو بھیج کر عبدالخالق کو بلوایا۔ گٹھے ہوئے جسم کا یہ پنجابی جوان دیکھنے میں دل کو اچھا لگتا تھا۔ رنگ گندمی، چہرے پر صحت اور تندرستی کی چمک دمک اور چہرے کے نقوش جاذب نظر تھے۔

اس سے پوچھا کہ وہ عائشہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس نے بلا توقف کہا کہ وہ عائشہ کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور اس کی شادی عائشہ کے ساتھ ہی ہوگی۔

''کیسے ہوگی؟''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''عائشہ کے باپ نے انکار کر دیا ہے اور اب عائشہ لاپتہ ہی ہوگئی ہے''۔

''باپ کا انکار عارضی ہے''۔۔۔ عبدالخالق نے کہا۔۔۔ ''اس کا بیٹا بدر اسے منوا لے گا۔ میں جانتا ہوں کہ عائشہ کا باپ ایک ہندو تاجر شرما موجمدار کے ہاں ملازم ہے۔ یہ ہندو نہیں چاہتا کہ عائشہ کی شادی میرے ساتھ ہو''۔

''کوئی وجہ؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''کیا ایسا تو نہیں کہ اس ہندو کی عائشہ پر بُری نظر ہو۔ عائشہ کا باپ اس کا ملازم ہے۔ ہوسکتا ہے موجمدار نے باپ کو لالچ دیا ہو کہ وہ عائشہ کو بڑی اچھی تنخواہ پر ملازم رکھ لے گا''۔

''آپ شاید بہار سے آئے ہیں''۔۔۔ عبدالخالق نے کہا۔۔۔ ''کیا آپ بنگالی مسلمانوں کو نہیں جانتے؟ بنگال کی مسلمان عورت جان دے دے گی کسی لالچ یا دھمکی سے کسی کے آگے جھکے گی نہیں۔ آپ شاید ہندوستان میں ہوں گے جب یہاں کے مسلمان آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ ان کے جذبۂ جہاد نے مجھے حیران کر دیا تھا۔ عائشہ عورتوں کے ہر جلوس میں شامل ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی وہ بھاگ دوڑ کرتی رہتی تھی''۔

جھوٹ اور سچ کا اندازہ ہو ہی جاتا ہے بشرطیکہ تفتیشی افسر چہرہ شناسی اور انسان شناسی کا تجربہ رکھتا ہو۔ مجھے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ عبدالخالق جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ عائشہ کے باپ کے انکار کے بعد اس نے کبھی عائشہ سے کہا ہوگا کہ اس کا باپ نہ مانا تو عائشہ گھر سے بھاگ آئے۔

''کہا تھا''۔۔۔ عبدالخالق نے جواب دیا۔۔۔ ''اس نے کہا کہ مجھ سے ایسی توقع نہ رکھنا، میں اپنے بوڑھے باپ اور بڑے بھائی کو ایسا کوئی صدمہ نہیں پہنچاؤں گی اور ان کی

عزت اور غیرت پر جتنی بڑی قربانی دے سکتی ہوں دوں گی...... میں تو پہلے ہی اس کی محبت میں دیوانہ ہوا جا رہا تھا، اس کی یہ بات سن کر میں اس کا مرید ہوگیا''۔

''اب تو وہ لاپتہ ہوگئی ہے''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تم نے غور کیا کہ وہ کیسے لاپتہ ہوئی؟''

''اسے یقیناً اغوا کیا گیا ہے''۔۔۔ عبدالخالق نے جواب دیا۔۔۔ ''وہ خود کہیں نہیں جا سکتی''۔

''تمہیں کسی پر شک تو ہوگا!''

میں نے دانستہ بہاری نوجوان کا اشارہ نہ دیا جو عائشہ کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ عبدالخالق نے خود ہی اس کا ذکر کیا اور کہا کہ اسے جب اس بہاری کی بدتمیزی کا پتہ چلا تو اس نے ایک روز بہاری کو پکڑا اور اسے کہا کہ دیکھو اب ہم سب پاکستانی ہیں اور ہمارا کردار پکے مسلمانوں جیسا ہونا چاہئے۔ یہ گناہ ہوگا کہ میں مسلمان ہوتے ہوئے ایک مسلمان پر ہاتھ اٹھاؤں۔ عبدالخالق نے یہ بھی بتایا کہ اس نے بہاری سے کہا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کر رہا ہے اور وہ اسی لمحے سے اس لڑکی کا خیال دل سے نکال دے۔ بہاری نوجوان نے عبدالخالق سے معذرت کی اور کہا وہ آئندہ اسے کم از کم اس لڑکی کے پیچھے پھرتے نہیں دیکھے گا۔

''کیا اس بہاری نے اپنا وعدہ پورا کیا تھا؟''

''پوری طرح وعدہ پورا کیا تھا''۔۔۔ عبدالخالق نے جواب دیا۔۔۔ ''عائشہ نے بھی بتایا تھا اور اس کے بھائی بدر نے بھی کہ اب انہیں اس بہاری کی طرف سے کوئی شکایت نہیں رہی...... میں اپنی جاسوسی کر رہا ہوں۔ کوئی سراغ ملا تو فوراً آپ کو بتاؤں گا''۔

اسے میں نے فوراً تو نہیں چھوڑ دیا۔ سوال و جواب کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا کہ یہ صحت مند پنجابی جوان پریشان ہوگیا اور آخر میں آ کر اس کی زبان ہکلانے لگی۔ میں مطمئن ہوگیا کہ لڑکی کی گمشدگی میں اس شخص کا ہاتھ نہیں۔ اسے رخصت کر دیا اور ایک کانسٹیبل کو اس بہاری کا ایڈریس سمجھا کر بھیجا کہ اسے ساتھ لے آئے۔

یہ دبلا پتلا سا نوجوان جب میرے سامنے آیا تو صاف پتہ چل رہا تھا کہ اس پر رعشہ طاری ہے اور میں نے ذرا بارعب لہجے میں بات کی تو یہ بے ہوش ہو جائے گا۔ اسے نارمل

حالت میں لانے کے لیے میں نے بتایا کہ میں بھی صوبہ بہار کا مہاجر ہوں اور میں اسے کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا اور اگر اس نے جھوٹ بولا تو پھر میں کوئی ضمانت نہیں دے سکوں گا۔

عائشہ کا ذکر چلا تو میں نے ایسا انداز اختیار کیا جیسے مجھے شک ہے کہ اس لڑکی کی گمشدگی میں اس کا ہاتھ ہے۔ اس کے جواب میں اس نے قسمیں زیادہ کھائیں اور بات کم کی۔ اس نے فوراً تسلیم کر لیا کہ وہ عائشہ کے پیچھے پھرتا رہا ہے اور اس کو بری نیت سے پھانسنے کی کوشش میں تھا اور عائشہ اسے بار بار دھتکار کر برا بھلا کہتی تھی۔

پھر اس نے میرے کسی اشارے یا حوالے کے بغیر بتایا کہ عبدالخالق نے اسے منع کیا تو اسی روز سے اس نے عائشہ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ میں نے اس کو کچھ باتیں کہیں اور اس کی سنیں تو میں نے محسوس کر لیا کہ یہ نوجوان عبدالخالق سے ڈر گیا تھا۔

اسے میں نے جلدی نہیں چھوڑا، پوچھ گچھ جاری رکھی اور اسے بہت زچ کیا لیکن اس کی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکلی جو اس کے خلاف شک پیدا کرتی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں تھا کہ میں اسے اس شک سے بری کر دیتا۔ عبدالخالق اور اس نوجوان سے میں نے ابھی خفیہ تفتیش کرنی تھی جس کا طریقہ یہ تھا کہ ان کے پیچھے ایسے مخبر لگانے تھے جنہیں ان پر ہر وقت اور ہر جگہ نظر رکھنی تھی۔ اس بہاری نوجوان کو میں نے اس طرح رخصت کر دیا جیسے اس کے خلاف کوئی شک نہ رہا ہو۔

میں نے اسی رات مخبروں کو بلا کر اچھی طرح ذہن نشین کرا دیا کہ ان کا کام کیا ہے۔

دوسرے یا تیسرے دن کا واقعہ ہے، مجھے یاد ہے، گیارہ بج چکے تھے۔ چھ سات آدمی پولیس سٹیشن آئے۔ ان کے کپڑوں اور چہروں سے میں نے پہچان لیا کہ بہاری ہیں۔ ان کے ساتھ دو جوان آدمی بلکہ نوجوان لڑکے تھے جن کے کرتے خون سے سرخ ہوئے جا رہے تھے۔

میرے آفس میں میرے سامنے آئے تو زخمیوں میں سے ایک کو میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی بہاری نوجوان تھا جو عائشہ کی گمشدگی کے سلسلے میں میرے پاس آ چکا تھا۔ یہ عائشہ کے پیچھے پڑا رہتا تھا۔ اس کی پیشانی پر زخم تھا جس سے خون ٹپک ٹپک کر کرتے پر گر رہا تھا۔ یہ لڑائی جھگڑے کا کیس تھا۔

زخمیوں کے ساتھ جو آدمی تھے، ان میں سے زیادہ ادھیڑ عمر تھے اور ایک ان میں سے بڑی عمر کا تھا انہوں نے غصے اور احتجاج کے لہجے میں بتایا کہ انہیں پنجابیوں نے مارا ہے۔

"پنجابی" کا لفظ سن کر مجھے افسوس ہوا کہ ہم اب اپنے آزاد اسلامی ملک کے باشندے بن چکے تھے مگر یہ لوگ اب بھی پنجابی اور بہاری بنے ہوئے تھے۔ پاکستان کو معرض وجود میں آئے ابھی ایک ہی سال گزرا تھا۔

"ان پنجابیوں نے ہمارے لڑکوں پر....." ان میں جو سب سے زیادہ عمر کا تھا، مجھے رپورٹ دینے لگا۔

"بکواس بند کرو بڑے میاں!" میرے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے اور وہ بولتے بولتے چپ ہو گیا۔ حیرت اور خوف زدگی کی کیفیت میں میرے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔

وہ بزرگ تھا۔ مجھے اس کا احترام کرنا چاہئے تھا لیکن اس وقت میرے قلب ونظر میں پاکستان کا احترام تھا۔ ابھی تو آزادی کے زخمیوں اور شہیدوں کا خون بھی خشک نہیں ہوا اور وہ اپنے آپ کو پاکستانی کہنے کی بجائے علاقائی تفریق میں پڑے ہوئے تھے۔

"آپ بزرگ ہیں" میں نے کہا "انہیں یہ بتائیں کہ اب ہم پاکستانی ہیں۔ پنجابی مشرقی پاکستان میں ہو یا بلوچستان میں، بلوچی سرحد میں ہو یا پنجاب میں، بہاری یہاں ہو یا مغربی پاکستان میں، سب پاکستانی ہیں..... اب بتاؤ کیا ہوا ہے، کس کے ساتھ لڑائی کر کے آ رہے ہو؟"

بات یہ کھلی کہ عبدالخالق کے ساتھ ان کی لڑائی ہو گئی تھی اور ان کا بیان یہ تھا کہ عبدالخالق اور اس کے ساتھیوں نے انہیں زدوکوب کیا ہے۔ میں نے اس لڑائی مارکٹائی کی وجہ دریافت کرنے سے پہلے دونوں زخمیوں کے زخموں کا معائنہ کیا۔ پہلے بتایا ہے کہ عائشہ والے بہاری نوجوان کی پیشانی پر نہایت معمولی زخم تھا جو سر دیوار یا کسی اور چیز سے ٹکرانے سے آیا ہو گا۔ باقی جسم پر کوئی اور زخم نہیں تھا۔ نہ کہیں چوٹ کا نشان تھا۔ اس کے دوسرے ساتھی کے سر پر دائیں کان سے کچھ اوپر چھوٹا سا ابھارا تھا جس پر چھوٹا سا کٹ تھا۔ اس میں سے خون رس رہا تھا۔

کبھی آزما کر دیکھیں، اپنی پیشانی یا سر پر کہیں بلیڈ سے ذرا سا کٹ دیں پھر سر کو دائیں بائیں جھٹکتے رہیں پھر اپنے کپڑے دیکھیں۔ یوں پتہ چلے گا جیسے جسم کا بے شمار خون کپڑوں پر بہہ گیا ہے۔ آپ یہ خون دیکھ کر گھبرا جائیں گے اور آپ کو دیکھنے والے کہیں گے

کہ آپ کی تو کھوپڑی پھٹ گئی ہے۔ اگر یہ سارا خون انجکشن والی سرنج میں ڈالیں تو پورا ایک سی سی بھی نہیں ہوگا۔

ایسے زخمی اسی حالت میں یہ توقع لے کر پولیس سٹیشن جاتے ہیں کہ تھانیدار انہیں دیکھ کر مظلوم اور شدید زخمی سمجھے گا اور زدوکوب کرنے والوں کو فوراً گرفتار کر کے ان پر ارادہ قتل والی دفعہ لگا دے گا لیکن تھانیدار اتنے کمزور دل اور اناڑی نہیں ہوتے۔

یہی حال اِن دو زخمیوں کا تھا۔ زخم اور چوٹیں ایسی ہی تھیں جیسے دو بچے لڑ پڑتے ہیں تو خراشیں آ جاتی ہیں۔ میں نے ان سے لڑائی جھگڑے کی وجہ پوچھی تو پتہ چلا کہ انہیں میں نے پولیس سٹیشن بلایا تھا تو کسی نے ان کے کان میں یہ ڈال دی کہ انہیں عبدالخالق کے کہنے پر شامل تفتیش کیا گیا تھا۔ یہ لوگ اس وہم میں مبتلا تھے کہ عبدالخالق ان پر یہ الزام ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عائشہ کو اس بہاری نوجوان نے جو اس کے پیچھے پڑا رہتا تھا، اغوا کیا ہے۔

یہ لوگ عبدالخالق کے ہاں جا پہنچے اور گلہ شکوہ کیا کہ وہ انہیں پولیس کے ہاتھوں رسوا اور خوار کرا رہا ہے۔ جیسا کہ مجھے توقع تھی، انہوں نے یہ بیان دیا کہ عبدالخالق نے اپنے تین چار ساتھیوں کے ساتھ ان پر حملہ کر دیا اور یہ دو لڑکے زخمی ہو گئے۔ ان کا بیان تھا کہ عائشہ کا بھائی بدر بھی عبدالخالق کے ساتھ تھا۔

میں نے انہیں باہر بٹھا دیا اور عبدالخالق اور بدر کو بلوایا۔ وہ دور نہیں تھے، جلدی آ گئے۔ عبدالخالق کے بائیں بازو پر کہنی کے نیچے پٹی بندھی ہوئی تھی اور بدر کے دائیں رخسار پر روئی رکھی تھی اور اس پر ٹیپیں لگی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ دو اور آدمی تھے جنہیں وہ گواہوں کے طور پر ساتھ لائے تھے۔

میں نے بہاری پارٹی کو بھی اندر بلا لیا اور عبدالخالق سے پوچھا کہ یہ لڑائی جھگڑا کس طرح شروع ہوا اور کیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ اپنے کام کی جگہ بیٹھا تھا۔ یہ دونوں زخمی بہاری تین آدمیوں کو ساتھ لئے آ دھمکے۔ دو کے ہاتھوں میں ڈنڈے تھے۔ عائشہ والے بہاری کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ یہ آئے ہی لڑنے کی نیت سے تھے۔ عائشہ والے بہاری نے عبدالخالق کے ساتھ دھمکیوں کی زبان میں بات کی۔ یہ تو ہر کوئی سمجھ سکتا ہے کہ اس قسم کی زبان کا جواب کس قسم کی زبان سے دیا جاتا ہے۔ عبدالخالق تو تھا ہی پولیس والے کا بیٹا جس سے بزدلی اور صلح صفائی کی توقع رکھی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ لڑائی تو ہونی ہی تھی۔

دونوں پارٹیوں نے اپنی اپنی وکالت شروع کر دی۔ میں نے انہیں چپ کرایا اور اپنے طور پر انکوائری کی۔ میں اس نتیجے پر پہنچا کہ زیادتی ان بہاریوں کی تھی۔ عبدالخالق اور بدر نے کہا کہ وہ دس بارہ گواہ لا سکتے ہیں جو شہادت دیں گے کہ ان بہاریوں نے عبدالخالق کی جگہ پر جا کر اسے مشتعل کیا اور یہ مسلح ہو کر آئے تھے اور انہوں نے حملہ کیا۔

عبدالخالق نے کہا کہ وہ بھی زخمی ہوا ہے اور بدر بھی۔ ان کا بھی خون نکلا تھا لیکن انہوں نے پولیس سٹیشن تک بات پہنچانے سے گریز کیا۔ میں عبدالخالق کی باتوں سے زیادہ متاثر ہوا اور بہاری پارٹی کو بتایا کہ تھانیداروں کے اور کئی ذرائع ہوتے ہیں جن سے انہیں زمین کے نیچے کی خبریں بھی مل جاتی ہیں۔ میں نے انہیں بتایا کہ اس بہاری نوجوان کو شامل تفتیش کرنا ہی تھا۔ یہ بھی کہا کہ یہ شکایت عبدالخالق کو بھی ہو سکتی تھی کہ اس بہاری نوجوان نے اس کے خلاف مخبری کی ہے۔

میں نے ان کا راضی نامہ کرانا چاہا تو بہاری پارٹی رضامند نہیں ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ایسی بات ہے تو میں اس لڑکے کو لڑکی کے اغوا اور عبدالخالق پر حملے الزام میں حوالات میں بند کر دوں گا اور اس وقت چھوڑوں گا جب یقین ہو جائے گا کہ اس کے خلاف الزام صحیح نہیں۔

یہ لوگ راضی نامے پر رضامند ہو گئے اور میں نے دونوں پارٹیوں کو وارننگ دے کر چلتا کیا۔ صورتِ حال ہنگامہ خیز ہو گئی تھی اس لیے مجھے یہ خیال نہ آیا کہ ان سے پوچھوں کہ انہیں کس نے کہا تھا کہ اس لڑکے کے خلاف عبدالخالق نے مخبری کی ہے۔

میرے پاس صرف لڑکی کی گمشدگی کا ہی کیس نہیں تھا، پولیس سٹیشن میں اور بھی کئی کام تھے۔ اس واردات کی تفتیش کے سلسلے میں مخبروں کو کام پر لگا دیا تھا۔ قاعدہ قانون کے مطابق اردگرد کے پولیس سٹیشنوں کو گمشدہ لڑکی کا حلیہ وغیرہ بھجوا دیا تھا۔

غالباً دو دن گزرے ہوں گے کہ صبح عبدالخالق اور بدر پولیس سٹیشن آئے۔ ان کے ساتھ موجدار بھی تھا۔ انہوں نے بتایا کہ عائشہ کا باپ جوہڑ میں ڈوب گیا ہے اور اس کی لاش جوہڑ کے کنارے پڑی ہے۔ مجھے پہلا خیال یہ آیا کہ اس شخص کی موت کا تعلق بیٹی کی گمشدگی کے ساتھ ہی ہو سکتا ہے۔

میں نے ان لوگوں سے کچھ ضروری معلومات حاصل کیں۔ معلوم ہوا کہ وہ صبح حسب

معمول گھر سے نکلا تھا۔ موجمدار نے بتایا کہ وہ روزمرہ کے وقت کے مطابق اس کے پاس کام کے لئے پہنچا تھا۔ وہ سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے چھٹی کیا کرتا تھا لیکن کل کام ذرا زیادہ تھا اس لئے سُورج غروب ہونے کے بعد وہاں سے نکلا۔

بدر نے بتایا کہ باپ گذشتہ رات گھر پہنچا ہی نہیں۔ وقت اور زیادہ گزر گیا تو بدر نے اپنے چھوٹے بھائی کو موجمدار کے ہاں بھیجا کہ باپ کا پتہ کرے کہ وہ ابھی تک کیوں نہیں آیا۔ موجمدار نے بتایا کہ وہ تو شام کو ہی چلا گیا تھا۔

''میری ایک بات مانیں یا نہیں مانیں'' ـــ موجمدار نے کہا ـــ ''اس بدقسمت شخص نے خودکشی کی ہے۔ یہ میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ بیٹی کی گمشدگی کا اس نے بہت صدمہ لیا تھا۔ تین چار مرتبہ اس نے مجھے کہا کہ لوگ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اس کی بیٹی اپنے آشنا کے ساتھ گھر سے بھاگ گئی ہے۔ یہ کہتا تھا کہ وہ ایسی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتا اور اس جینے سے مرجانا بہتر سمجھتا ہے۔ میں اسے یقین دلاتا تھا کہ اس کی بیٹی خود نہیں گئی اور وہ مل جائے گی''۔

ان تینوں کے ساتھ دو بنگالی بھی تھے جنہوں نے لاش جوہڑ میں دیکھی تھی۔ ان میں ایک موجمدار کا ملازم تھا۔ اس نے موجمدار کو بتایا تھا کہ اس کے فلاں نوکر کی لاش جوہڑ میں پڑی ہے۔

میں ان لوگوں کے ساتھ موقعہ کی جگہ جانے کے لیے اپنے آفس سے نکلا تو ایک بنگالی ہیڈ کانسٹیبل نے سر کے اشارے سے مجھے اپنے پاس بلایا۔ میں گیا تو ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا کہ یہ دونوں آدمی اس پولیس سٹیشن کے پکے مشتبہ ہیں۔ چھوٹی موٹی وارداتیں کرتے ہیں اور جھوٹی گواہیاں دینا ان کا پیشہ ہے۔ یہ تعارف میرے لئے اہم تھا۔

میں وہاں پہنچا جہاں لاش پڑی تھی وہ کم و بیش پچاس گز لمبائی چوڑائی کا جوہڑ تھا اور یہ گولائی میں تھا۔ یہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں کہ مشرقی پاکستان یا اب بنگلہ دیش کی کوئی واردات یا اس تفتیش کو سمجھنے کے لیے وہاں کی زمین کو سمجھنا ضروری ہے۔ اس قسم کے جوہڑ تو وہاں جگہ جگہ نظر آتے ہیں اور لوگوں نے ان کے کناروں پر بلکہ ان کے اندر بھی بانسوں کے موٹے ستونوں پر جھونپڑے بنا رکھے ہوتے ہیں۔ انہی جوہڑوں میں یہ لوگ پاخانہ پیشاب کرتے ہیں، انہی میں نہاتے ہیں اور انہی میں سے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ یوں کہہ

لیں کہ یہ جوہڑ ان کے کھیت ہوتے ہیں۔ زیادہ تر زمین اونچی نیچی اور جنگلاتی ہے۔

میں نے لاش دیکھی۔ سر پر بال کاٹنے والی مشین پھری ہوئی تھی۔ کھوپڑی صاف نظر آ رہی تھی۔ لاش کو صرف دیکھ کر کہہ دینا کہ یہ قتل یا خودکشی ہے، ٹھیک نہیں ہوتا۔ یہ لاش پیٹھ کے بل پڑی تھی، میں نے پیٹ کے بل کروائی اور سر سے پاؤں تک نظری معائنہ کرنے لگا تو سر کے پچھلے حصے پر اُبھار سا نظر آیا۔ اگر یہ ابھار ہی ہوتا تو میں اسے سر کا حصہ ہی سمجھتا لیکن اس ابھار کے درمیان کھال ذرا سی کٹی ہوئی تھی۔ اگر لاش پانی میں نہ رہی ہوتی تو وہاں یقیناً خون بھی ہوتا۔ پانی نے خون صاف کر دیا تھا۔

سر کے اس حصے پر ضرب لگائی جائے تو آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے اور کئی منٹ بعد ہی ہوش میں آتا ہے۔ میرے لئے یہ سمجھنا کوئی مشکل نہ تھا کہ اس کے سر پر ضرب لگا کر بے ہوش کیا گیا اور پھر اسے ڈبو کر مارا گیا۔

جن دو آدمیوں نے لاش دیکھی تھی، ان سے پوچھا کہ جوہڑ میں لاش کہاں پڑی تھی۔ ان میں سے ایک آدمی نے پانی میں کنکر پھینک کر بتایا کہ وہاں پڑی تھی۔ میں نے اندازہ کیا کہ وہ جگہ کنارے سے سات آٹھ قدم دور تھی۔ میں نے اسی آدمی سے کہا کہ دھوتی اوپر کر کے وہاں تک چلا جائے۔

وہ پانی میں گیا اور وہاں تک پہنچا۔ پانی اس کے گھٹنوں اور کولہوں کے درمیان تک گہرا تھا۔ اتنے کم گہرے پانی میں کوئی آدمی ڈوب نہیں سکتا۔ وہ جوہڑ تھا، جھیل یا ندی نہیں تھی کہ پانی رواں ہوتا اور لاش کو اپنے ساتھ بہا لے جاتا۔ جوہڑ کا پانی ساکن تھا۔ اگر یہ شخص آگے جا کر گہرے پانی میں ڈوبتا تو اس کی لاش کنارے کے قریب نہیں آسکتی تھی۔

میں نے دماغ پر مزید زور دیا تو ایک اور بات ذہن میں آگئی۔ اگر اس شخص کو خودکشی ہی کرنی تھی تو اس کم گہرے جوہڑ میں نہ کرتا، شہر کے بالکل قریب ہی دریائے گنگا بہہ رہا تھا اور راجشاہی کے قریب آ کر تو یہ دریا اور زیادہ جوش و خروش میں آ جاتا تھا۔ یہ شخص بڑے آرام سے وہاں تک پہنچتا اور اپنے آپ کو دریا کے حوالے کر دیتا۔

میں نے خودکشی کے خیال کو الگ رکھ دیا۔ تفتیش سے بچنے کی خاطر میرے سامنے سیدھا راستہ تھا کہ اسے خودکشی لکھ دیتا لیکن اب میں پاکستان پولیس کا آفیسر تھا اور شک میں کوئی فیصلہ دینے کو فرائض سے کوتاہی اور بددیانتی سمجھتا تھا۔ ویسے ہی پولیس والی چھٹی حس

بتا رہی تھی کہ یہ خودکشی کی واردات نہیں۔

لاش پوسٹمارٹم کے لئے بھجوادی اور جن دو بنگالیوں نے لاش دیکھی اور نکالی تھی، ان کو اپنے ساتھ پولیس سٹیشن لے آیا۔ یہ اس لئے کہ میرے ایک ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا تھا کہ یہ دونوں مشکوک آدمی ہیں۔ اب اگر میں یہ سپردِ قلم کرنے بیٹھ گیا کہ ان کے ساتھ کیا باتیں ہوئیں اور کیسے کیسے سوال کر کر کے انہیں زچ کیا تو یہ معاملہ بوریت کی حد تک طول پکڑ جائے گا۔ ان کے ساتھ میرا رویہ اور انداز ایسا ہوگیا جیسے انہوں نے ہی اس بوڑھے کو ڈبو کو قتل کیا ہو۔ یہ تو میں نے انہیں صاف ہی کہہ دیا کہ عائشہ کی گمشدگی کا سراغ ان کے سینوں میں ہے۔ میں نے انہیں یہ بھی کہا کہ یہ جب تک سچی بات نہیں بتائیں گے، جانے نہیں دوں گا۔

آخر ایک بول پڑا لیکن اس نے بھی یہ نہ بتایا کہ یہ خودکشی ہے یا قتل۔ ان میں ایک تو موجمدار کا ملازم تھا اور دوسرا اس کا دوست۔ اس نے بتایا کہ لاش انہوں نے ہی دیکھی تھی اور جوہڑ سے نکالی بھی تھی اور موجمدار کو بتایا تھا کہ اس کا فلاں نوکر ڈوب کر مر گیا ہے۔ اس نے بیان میں واضح الفاظ میں کہا کہ موجمدار نے ان دونوں سے کہا تھا کہ وہ ہمیں خاصے پیسے دے گا اور وہ کام یہ کریں کہ ہر طرف یہ بات پھیلا دیں کہ اس بوڑھے کو بہاریوں نے ڈبو کر مارا ہے اور بہاریوں کے ہاں یہ بات پھیلا دیں کہ ان پر یہ الزام پنجابیوں نے لگایا ہے۔ پھر بنگالیوں میں یہ بات پھیلا دیں کہ پہلے ہندوؤں نے ہمیں مارا تھا اور اب پنجابی اور بہاری ہمارے آدمیوں کو مارنے لگے ہیں۔

انہوں نے یہ بھی بتایا کہ موجمدار انہیں اور اپنے ہاں کام کرنے والے بنگالی مزدوروں وغیرہ سے اس طرح کی باتیں کرتا رہتا ہے کہ ان پنجابیوں اور بہاریوں کو یہاں سے نکالو ورنہ یہ تمہیں غلام بنالیں گے اور بھوکا مار ڈالیں گے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ ملک تمہارا ہے اور یہاں جو ہندو ہیں وہ تمہارے ہمدرد اور خیر خواہ ہیں...... انہوں نے تفصیلاً یہ بات سنائی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ بہاری اور پنجابی آپس میں ٹکرائیں اور بنگالی ان دونوں کے خلاف محاذ بنالیں۔

انہوں نے آخر میں یہ بھی بتادیا کہ عبدالخالق اور بہاری نوجوان کو موجمدار نے آپس میں متصادم کرایا تھا۔ اس ہندو نے ان دونوں بنگالی مسلمانوں سے کہا تھا کہ وہ بہاریوں کو

یقین دلا دیں کہ اس بہاری نوجوان کے خلاف عبدالخالق نے مخبری کی ہے اور وہ اسے عائشہ کے اغوا میں پھنسانا چاہتا ہے۔

میں نے بہت کریدا اور ان دونوں کو بے حد پریشان کیا لیکن انہوں نے یہی بتایا کہ عائشہ کی گمشدگی کا انہیں کچھ پتہ نہیں نہ ہی یہ بتا سکتے ہیں کہ عائشہ کے باپ نے خودکشی کی ہے یا اسے قتل کی نیت سے ڈبویا گیا ہے۔

موجمدار کے متعلق یہ سن کر میرا تو خون ابلنے لگا۔ میرے دل میں ہندوؤں کی ایسی نفرت بھری ہوئی تھی کہ میرے بس میں ہوتا تو میں موجمدار کو گولی مار دیتا لیکن میری مجبوری یہ تھی کہ مجھے قانون کے مطابق کارروائی کرنی تھی۔ اس قسم کا پروپیگنڈا کرنا کوئی جرم نہیں تھا لیکن مختلف مذہبی، لسانی اور علاقائی لوگوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرت پھیلانا بہت بڑا جرم ہے۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ وکیلوں سے مشورہ کر کے اس ہندو کے خلاف مقدمہ تیار کروں گا۔ قانون نے اس کی سزا 14 سال تک مقرر کر رکھی ہے۔

ان دونوں کے جانے کے کچھ وقت بعد پوسٹمارٹم رپورٹ آگئی۔ مرنے والا ڈوب کر مرا تھا اور اس کے سر کے پچھلے حصے پر شدید ضرب لگائی گئی تھی۔ رپورٹ میں لکھا گیا تھا کہ یہ ضرب اس کے مرنے سے پہلے لگائی گئی تھی۔ اگر مرنے کے بعد لگائی گئی ہوتی تو ابھار نہ ہوتا۔ ایسے ابھار زندہ جسموں پر ہی اٹھا کرتے ہیں۔

اسی رات کا واقعہ ہے، غالباً دس بج چکے تھے۔ میں سونے کی تیاریوں میں تھا کہ گورنمنٹ ہاسپٹل سے ایک آدمی آیا۔ اسے میرے ایک دوست ڈاکٹر عتیق الرحمن نے یہ پیغام دے کر بھیجا تھا کہ میں فوراً اس سے ہسپتال جا کر ملوں۔ اس آدمی نے اتنا ہی بتایا کہ ایک زخمی آیا ہے۔

میں سمجھ گیا معاملہ کیا ہے۔ یہ میں آپ کو یہیں بتا دیتا ہوں۔ آج کل کوئی لڑائی جھگڑے میں زخمی ہو جائے یا کسی حادثے میں، اسے پہلے کسی سرکاری ہسپتال میں لے جاتے ہیں۔ وہاں پولیس موجود ہوتی ہے جو سمجھے کہ یہ پولیس کا کیس ہے تو زخموں کی لمبائی، گہرائی اور دیگر معلومات لکھ لی جاتی ہیں اور یہ بھی کہ آلۂ قتل کوئی تیز دھار ہتھیار تھا یا آتشیں اسلحہ (رائفل ریوالور وغیرہ) تھا۔ اس کے بعد پولیس یہ کیس رجسٹر کر لیتی تھی۔

اس سے پہلے، پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے چند سال بعد تک یوں ہوتا تھا

کہ زخمی کو پہلے متعلقہ علاقے کے پولیس سٹیشن اٹھا لے جاتے تھے۔ ایس ایچ او زخمی کے زخموں کی تفصیل لکھتا پھر زخمی کا بیان (اگر وہ ہوش میں ہوتا) تو لیتا تھا۔ اس کے بعد زخمی کو ہسپتال بھیجا جاتا تھا۔

یہ طریقۂ کار بڑا ہی خطرناک تھا۔ عموماً یوں ہوتا تھا کہ ایسے زخمی ہسپتال پہنچتے ہی زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے مر جاتے تھے جنہیں زخمی ہونے کے فوراً بعد ہسپتال پہنچا کر بچایا جا سکتا تھا۔ بعض تھانیدار دو دو گھنٹے زخمیوں کو پولیس سٹیشن میں روکے رکھتے تھے۔ اس کے نتیجے میں لڑائی جھگڑے کا عام سا کیس قتل کی واردات بن جاتی تھی۔ آگے چل کر ہمارے اس طریقۂ کار میں یہ ترمیم کر دی گئی کہ زخمی کو پہلے ہسپتال پہنچایا جائے اور ڈاکٹر فوراً پولیس کو بلوا لے۔

ڈاکٹر عتیق الرحمان کا پیغام ملتے ہی میں احتیاطاً ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر ہسپتال پہنچ گیا۔ میرا خیال ٹھیک نکلا۔ وہاں ایک نوجوان ہندو کو لایا گیا تھا جس کی گردن اور کندھے کے درمیان چاقو لگا تھا۔ یہ جگہ نرم ہوتی ہے اس لئے چاقو زیادہ نیچے اتر گیا تھا۔ ہنسلی بچ گئی تھی زخمی یہ نہیں بتا رہا تھا کہ اسے یہ چاقو کس نے مارا ہے۔ وہ دو تین بیان بدل چکا تھا جن میں ایک یہ احمقانہ بیان تھا کہ اس نے الماری کھولی تو اوپر کھلا چاقو رکھا جو گر پڑا اور اس کے کندھے میں اُتر گیا۔ کوئی بے وقوف آدمی بھی ایسے بیان کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتا۔

ڈاکٹر نے زخمی کا خون بند کر دیا تھا اور مرہم پٹی ہو رہی تھی۔ زخمی نے مجھے وردی میں دیکھا اور پھر میرے ساتھ ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں کو دیکھا تو وہ سخت گھبرایا۔

''ڈاکٹر صاحب!'' ـــــ میں نے زخمی کو ڈرانے کے لئے کہا ـــــ ''یہ سچ نہیں بول رہا، اس کی پٹی اتار دیں اور اسے ہسپتال سے نکال دیں۔ خون بہہ جانے سے یہ پندرہ بیس منٹ میں مر جائے گا''۔

ڈاکٹر عتیق الرحمان نے ہاتھ روک لیا۔ زخمی کے تو چھکے چھوٹ گئے پھر بھی وہ جھوٹ بولنے سے باز نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہندو تھا۔ میں جانتا تھا کہ ہندو کتنے کچھ دلیر ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر نے مجھے بتایا کہ اس کا باپ اور ماں اس کے ساتھ آئے ہیں۔ میں فوراً باہر نکلا اور انہیں الگ کر کے کہا کہ وہ بتائیں کہ ان کا بیٹا کس طرح زخمی ہوا ہے ورنہ اس کی مرہم پٹی

نہیں ہوگی اور یہ خون بہہ جانے سے مر جائے گا۔

وہ آخر ماں باپ تھے اور پتہ چلا کہ یہ ان کا اکلوتا بیٹا ہے، باقی بہنیں ہیں۔ ان دونوں بوڑھوں نے صاف بتا دیا کہ ان کا بیٹا گذشتہ رات ایک لڑکی کو ساتھ لایا تھا اور اسے الگ کمرے میں رکھ کر ماں باپ کو یہ بتایا تھا کہ یہ ایک یتیم ہندو لڑکی ہے، اس کے گھر والے مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے اور کل اسے ہندوستان بھیج دینا ہے۔ زخمی نے ماں باپ کو سختی سے منع کیا کہ وہ لڑکی سے نہ ملیں۔ وجہ یہ بتائی کہ وہ ذہنی طور پر ٹھیک نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ بھاگ جائے۔ اس نے بتایا کہ مسلمانوں نے اس کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا ہے جس کے نتیجے میں اسے پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔

ماں باپ نے اس بیان کو سچ مان لیا اور خوش ہوئے کہ ان کے بیٹے کے دل میں اپنی قوم کی اور اپنے مذہب کی کتنی زیادہ محبت اور احترام ہے لیکن واردات کی رات یعنی اگلی ہی رات ان کا بیٹا لڑکی والے کمرے میں گیا اور تقریباً نصف گھنٹہ بعد باہر نکلا۔ اس کے کندھے سے خون چشمے کی طرح اُبل اُبل کر نکل رہا تھا جس پر اس نے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ انہوں نے زخم دیکھا تو ان پر غشی طاری ہونے لگی۔ اسے ہسپتال لے آئے۔

ماں باپ نے مجھے یہ بھی بتایا کہ یہ کہتا تھا کہ یہ کسی کو نہ بتانا کہ گھر میں ایک لڑکی ہے۔ اس نے ماں باپ کو یہ بتا دیا کہ اسے چاقو اسی لڑکی نے مارا ہے اور اسی لئے وہ کہتا تھا کہ لڑکی کو نہ دیکھنا کیونکہ اس پر پاگل پن کے دورے پڑتے ہیں۔ باپ نے اس کمرے کے دروازے کی باہر والی چٹخنی چڑھا دی اور اس طرح لڑکی کمرے میں بند ہو گئی۔

میں نے ڈاکٹر عتیق الرحمان سے جا کر کہا کہ اس کے زخم کی ڈریسنگ کر دے اور میں اس کے گھر لڑکی کو پکڑنے جا رہا ہوں۔ ہیڈ کانسٹیبل کو وہیں چھوڑا کہ وہ زخمی کے ساتھ رہے۔ اس کے جھوٹے بیانات سے مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہ معاملہ کچھ اور ہی ہے۔

میں اس ہندو زخمی کے باپ کے ساتھ اس کے گھر گیا۔ دونوں کانسٹیبل میرے ساتھ تھے۔ ان دونوں کو میں نے بتا دیا کہ ایک لڑکی کو پکڑنا ہے جو پاگل ہے اور اس کے پاس چاقو ہے۔ میں اس وقت تک لڑکی کو پاگل ہی سمجھ رہا تھا۔

اس گھر میں داخل ہو کر میں نے دروازے کی چٹخنی اتاری اور بڑی احتیاط سے دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ ایک نوجوان لڑکی ہاتھ میں چاقو لئے یوں تیار کھڑی

تھی جیسے مجھ پر حملہ کر دے گی۔ میں نے اس پر ذرا سا بھی رعب نہ کسا نہ اپنی تھانیداری کی نمائش کی، بڑے پیار سے کہا کہ یہ چاقو مجھے دے دو، میں تمہیں گرفتار کرنے نہیں آیا، پہلے تمہاری پوری بات سنوں گا۔ میری انسان شناس نگاہوں نے مجھے یقین دلایا تھا کہ یہ لڑکی ہندو نہیں اور یہ پاگل بھی نہیں۔

''تم میری نہیں سنو گے''۔۔۔ لڑکی نے کچھ اردو اور زیادہ تر بنگالی زبان میں کہا۔۔۔ ''تم اس کو نہیں پکڑو گے جو مجھے یہاں زبردستی لایا ہے۔ اسی لئے میں نے اسے چاقو مارا ہے''۔۔۔ پھر لڑکی نے ایک ایسی بات کہی جس سے میری روح بھی تازہ ہو گئی۔ اس نے کہا۔۔۔ ''یہ پاکستان میرا ہے، ان ہندوؤں کا نہیں''۔

''میں مسلمان ہوں''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''ہمارے پاکستان میں تمہاری بات چلے گی...... اپنا نام بتاؤ گی؟''

''عائشہ!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''پہلے ایک ہندو شرما موجمدار نے مجھے اپنے قبضے میں رکھا تھا اور کل اس کے پاس بھیج دیا''۔

''بدر کی بہن ہو؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''ہاں ہاں!''۔۔۔ اس نے پُرجوش آواز میں جواب دیا۔۔۔ ''بدر میرا بڑا بھائی ہے''۔

''میرے ساتھ آؤ عائشہ!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میں تمہیں ہی ڈھونڈتا پھر رہا ہوں''۔

میں نے ہاتھ آگے کیا تو اس نے خون آلود چاقو میرے ہاتھ میں دے دیا۔ میں نے تفتیش کے قواعد وضوابط کے مطابق ان لوگوں کے دو پڑوسیوں کو بلوایا اور اس گھر کے بڑے آدمی یعنی زخمی کے باپ کی نشاندہی پر لڑکی برآمد کی۔ وہیں بیٹھ کر اس شخص کا بیان لکھوایا کہ لڑکی ایک روز پہلے یہاں لائی گئی تھی اور اسے اس کا بیٹا لایا تھا۔ میں نے دانستہ یہ نہ لکھا کہ لڑکی نے اس شخص کے بیٹے کو زخمی کیا تھا۔ میں اس واردات کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔ عائشہ نے بیان بھی دیا کہ یہ نوجوان لڑکا اس کی جبری آبروریزی کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

عائشہ کا پورا بیان لکھنے کی ضرورت نہیں، اس کے بیان کی اہم بات یہ ہے کہ پہلے اسے زبردستی اٹھا کر موجمدار کے حوالے کیا گیا تھا۔ کچھ دنوں بعد اسے اس گھر میں منتقل کیا

گیا۔ دن کے وقت وہ اس کمرے میں بند رہی۔ اس نے الماری کھول کر دیکھی تو یہ چاقو پڑا نظر آ گیا۔ چاقو چھوٹے سائز کا تھا۔ عائشہ کو معلوم تھا کہ یہاں اس کے ساتھ کیا سلوک ہو گا۔ اس نے چاقو کھول کر تکیئے کے نیچے رکھ لیا تھا۔ وہی ہوا جس کی اسے توقع تھی۔ یہ نوجوان رات اس کے پاس آیا اور اسے پلنگ پر گرا کر زبردستی کرنے لگا۔ عائشہ نے سرہانے کے نیچے سے اس طرح چاقو نکالا کہ ہندو نوجوان کو پتہ ہی نہ چلا۔ عائشہ نے چاقو اس کی گردن اور کندھے کے درمیان اتار دیا اور ہندو بلبلاتا ہوا باہر کو دوڑا۔

عبدالخالق نے ٹھیک بتایا تھا کہ عائشہ بڑی دلیر لڑکی ہے اور جان دے دے گی لیکن اپنا آپ کسی کے آگے نہیں جھکائے گی۔ میرے دل میں عائشہ کا ایسا احترام پیدا ہوا کہ میں اس کے ہاتھ چومنے کر بیتاب ہونے لگا۔

میں نے زخمی کے باپ کو حراست میں لیا۔ اسے اور عائشہ کو ساتھ لے کر تھانے گیا۔ باپ کو حوالات میں بند کر دیا پھر ہسپتال جا کر عائشہ کے زخمی کو حراست میں لے کر ایک کانسٹیبل کا پہرہ کھڑا کر دیا۔ وہاں سے موجمدار کے ہاں گیا اور اسے گرفتار کیا۔

یہ پولیس کی کارروائیاں ہیں جو بیان کیں تو آپ کو کوفت ہو گی۔ میں آپ کو اس جرم کی کہانی سنا دیتا ہوں۔ موجمدار کو پولیس سٹیشن لا کر ایذا رسانی کے کولہو میں ڈال دیا جس سے مجھ دلی سکون حاصل ہو رہا تھا۔ میں نے اسے ٹارچر کرنے والے سے کہا کہ یہ مر جائے تو پریشان نہ ہونا، میں اس کے گھر کی تمام چھوٹی بڑی عورتوں کو یہاں لا کر ننگا کر دوں گا۔ موجمدار کی چیخ وپکار سے کمرہ کانپ رہا تھا۔

تین ساڑھے تین گھنٹوں کے ٹارچر کے بعد نیم غشی کے عالم میں موجمدار نے اقبالی بیان دینا شروع کر دیا۔ اسے عائشہ کے ساتھ کوئی جسمانی یا جذباتی دلچسپی نہیں تھی۔ اس ہندو نے اپنے جیسے کچھ ہندو اپنے ساتھ ملا لئے۔ مشرقی پاکستان میں رہنے والے ہندوؤں کو کانگریسی لیڈروں نے یہ مشن دیا تھا کہ مشرقی پاکستان میں رہ کر مسلمانوں کی نظریاتی تخریب کاری کرنی ہے اور بنگالی اور غیر بنگالی کے درمیان منافرت پیدا کرنی ہے اور یہاں کے بنگالی مسلمانوں کے دلوں میں یہ نظریہ پیدا کرنا ہے کہ بنگال صرف بنگالیوں کا ہے مغربی پاکستانیوں کا نہیں۔

موجمدار نے عائشہ کو کئی بار دیکھا تھا کہ اِدھر اُدھر آتی جاتی تھی۔ اسے یہ بھی معلوم ہو

گیا تھا کہ ایک پنجابی عبدالخالق اس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے اور یہ بھی کہ ایک بہاری لڑکا عائشہ کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ عائشہ کا باپ تو اس کے ہاں ملازم تھا ہی۔ موجمدار اور اس کی پارٹی نے یہ سکیم بنائی کہ عائشہ کو اغوا کر کے پنجابیوں، بہاریوں اور بنگالیوں کو آپس میں متصادم کیا جائے۔ ایک روز عائشہ ایک جگہ سے گزر رہی تھی تو موجمدار کے ایک آدمی نے اسے کہا کہ اس کے باپ کو کوئی تکلیف ہوگئی ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ گھر لے جائے۔ عائشہ اس جھانسے میں آگئی۔ اُسے ساتھ لے جا کر ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔

پھر ان لوگوں نے جو ڈرامہ کھیلا وہ میں نے سنا دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ موجمدار اور اس کے کسی بھی آدمی نے عائشہ کے ساتھ کوئی زیادتی یا بے ہودگی نہ کی۔ یہاں میں عائشہ کے بیان کا ایک حصہ سناتا ہوں۔ ایک روز اس گھر میں جہاں عائشہ کو بند رکھا گیا تھا کام کرنے والی نے کھڑکی کھول دی۔ کچھ فاصلے پر عائشہ کو اپنا باپ نظر آیا۔ باپ نے اس طرف دیکھا تو عائشہ کو دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اتنے میں ایک آدمی اندر آیا اور اس نے دوڑ کر کھڑکی بند کر دی اور اس نے عائشہ کو اور کام کاج کرنے والی کو بہت گالیاں دیں کہ یہ کھڑکی نہیں کھولنی تھی۔ عائشہ بہت تڑپی کہ وہ اپنے باپ سے ملنا چاہتی ہے۔ اس آدمی نے عائشہ کو مار پیٹ کر چپ کرا دیا۔

موجمدار نے اپنے بیان میں کہا کہ عائشہ کا باپ اس کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ اس نے اپنی بیٹی کو فلاں مکان میں دیکھا ہے۔ موجمدار نے ہنس کر کہا کہ اسے غلطی لگی ہوگی لیکن عائشہ کا باپ اس کے پیچھے ہی پڑ گیا اور اس نے یہ بھی کہا کہ وہ پولیس کے پاس جائے گا۔

موجمدار نے پینترا بدلا اور اسے کہا کہ وہ آج اس گھر میں جا کر دیکھے گا اور عائشہ وہاں ہوئی تو اسے نکال لائے گا۔ اس نے عائشہ کے باپ کو ایسے کام پر لگا دیا جو سورج غروب ہونے تک ختم ہی نہ ہوا۔ اس دوران اس نے ان آدمیوں کو جنہوں نے کہا تھا کہ جوہڑ میں لاش دیکھی ہے، موجمدار نے تیار کر لیا تھا کہ عائشہ کا باپ گھر جانے لگے تو اسے کسی بہانے اس جوہڑ کی طرف لے جائیں اور ڈبو کر مار ڈالیں۔ قتل کا یہ طریقہ اس لئے سوچا گیا تھا کہ قتل کا شبہ نہیں ہوگا۔ موجمدار مجھے یہی یقین دلانے کی کوشش کر رہا تھا کہ یہ خودکشی کی واردات ہے۔ وہ جواز یہ پیش کرتا تھا کہ یہ شخص بہت مغموم رہنے لگا تھا۔

پوری رات گزر گئی تھی اور میں تفتیش کی تکمیل میں مصروف تھا۔ صبح ہوتے ہی اے۔

ایس آئی کو بھیج کر ان دونوں کو بھی گرفتار کر لیا۔ انہیں موجمدار کے سامنے کھڑا کیا اور بتایا کہ یہ شخص اقبالی بیان دے چکا ہے اور تم بھی بیان دے دو ورنہ ہڈیاں توڑ کر اور جان سے مار کر باہر پھینک دوں گا۔

یہ دونوں غریب سے مسلمان بنگالی تھے۔ دھمکی کو ہی برداشت نہ کر سکے اور بول پڑے۔ مشکل یہ تھی کہ یہ دونوں مسلمان تھے اور موجمدار نے ان سے قتل کروایا تھا۔ ان کے ساتھ میری ہمدردی اور دلچسپی نہیں ہونی چاہئے تھی۔ یہ پکے اور بڑے ہی گھٹیا قسم کے جرائم پیشہ افراد تھے دلچسپی یہ پیدا ہوگئی کہ انہیں ایک ہندو نے اپنے ایک گھناؤنے مقصد کے لیے استعمال کیا تھا۔ مجھے اب یہ دیکھنا تھا کہ میں اپنے مقصد کے لیے استعمال کر سکتا ہوں یا نہیں۔

دونوں سے الگ الگ اقبالی بیان لیا۔ بیان لینے سے پہلے انہیں کہا تھا کہ جو سو فیصد سچ بولے گا اسے وعدہ معاف گواہ بنا لوں گا۔ اس وعدے کا یہ اثر ہوا کہ دونوں نے بڑھ چڑھ کر سچ بولا۔

انہوں نے عائشہ کے باپ کو اس طرح قتل کیا تھا کہ موجمدار نے اسے شام گہری ہونے تک روکے رکھا اور جب وہ اپنے گھر کو جا رہا تھا تو دونوں جرائم پیشہ آدمی موجمدار کے بنائے ہوئے پلان کے مطابق اسے باتوں میں الجھا کر شہر سے باہر لے گئے۔ جوہڑ کے کنارے گئے تو ایک نے پیچھے ہو کر مقتول کے سر کے پچھلے حصے پر بڑی زور سے ڈنڈا مارا۔ مقتول بے ہوش ہو کر گرا تو دونوں نے اسے اٹھایا اور کنارے سے چند قدم دور پانی میں پھینک کر اوپر سے دبا لیا تاکہ اس کا منہ پانی سے باہر نہ آسکے۔ پانی اس کی ناک اور منہ کے رستے پھیپھڑوں میں بھر گیا اور وہ مر گیا۔ ان دونوں کا اگلا کام یہ تھا کہ صبح لوگوں کو اور موجمدار کو بتانا تھا کہ جوہڑ میں ایک لاش دیکھی ہے۔ انہوں نے یہ کام بھی کر دیا۔

موجمدار نے بھی اقبالی بیان دے دیا لیکن یہ میرے لیے بیکار تھے۔ اگر وہ اپنا بیان مجسٹریٹ کو ریکارڈ کروا بھی دیتا تو سیشن کورٹ میں منحرف ہو جاتا۔ یہ قتل کی واردات میں تو شریک ہی نہیں تھا۔ کوئی شہادت نہیں تھی کہ یہ عملاً واردات میں شریک تھا اور موقعۂ واردات پر موجود تھا۔

میں اسے آزاد نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ میں نے تو یہاں تک سوچ لیا تھا کہ یہ ہندو

قانون کی گرفت میں نہ آیا تو میں اسے خفیہ طریقے سے مروا دوں گا لیکن میں نے قانون کے دائرے میں رہ کر ایک طریقہ سوچ لیا۔ دونوں قاتلوں میں سے ایک کو وعدہ معاف گواہ بنالیا اور اس سے یہ اقبالی بیان لیا کہ موجمدار نے مقتول کے سر پر ڈنڈا مار کر بے ہوش کیا تھا پھر اس نے اور موجمدار نے مل کر مقتول کو اٹھایا اور جوہڑ میں لے جا کر اس طرح ڈبویا کہ مقتول کے سر اور منہ کو پانی کے اندر رکھنے کے لیے موجمدار نے اپنے دونوں ہاتھوں سے دباؤ ڈالے رکھا تھا۔

اس بنگالی کے ساتھی کو میں نے یہ بیان یاد کروا کے زیر دفعہ 164 ریکارڈ کرایا کہ اسے موجمدار نے یہ ڈیوٹی دی تھی کہ ذرا دور دور گھومتا پھرتا رہے یعنی پہرہ دیتا رہے۔ اس سے بھی کہلوایا کہ اس نے موجمدار کو مقتول کے سر پر ڈنڈا مارتے اور مقتول کو بے ہوش ہو کر گرتے دیکھا تھا۔

موجمدار پر عائشہ کے اغوا کا کیس بھی نہیں بنتا تھا کیونکہ عائشہ دوسرے ہندو کے گھر سے برآمد ہوئی تھی۔ میں کیس تو بنا سکتا تھا لیکن ثابت کرنا مشکل تھا۔ میں نے دوسرا جو طریقہ اختیار کیا تھا وہ میری منشاء کے مطابق کامیاب رہا۔ دونوں بنگالیوں نے پورا پورا تعاون کیا۔ میں نے یہ کیس بڑی ہی محنت اور عرق ریزی سے تیار کیا تھا۔

موجمدار کا وکیل ہندو تھا جو بہت ہی تجربہ کار اور قابل ایڈووکیٹ تھا لیکن وہ موجمدار کو سزائے موت سے نہ بچا سکا۔ ہائی کورٹ نے اپیل بھی مسترد کر کے سزائے موت بحال رکھی۔ وعدہ معاف گواہ آزاد ہو گیا اور اس کے ساتھی کو صرف نو مہینے اعانت جرم میں سزائے قیدی دی...... اغوا، حبس بے جا اور مجرمانہ حملہ...... میں نے عائشہ کو پہلے ہی اپنے مطلب کا بیان یاد کرا دیا تھا جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ عائشہ کو اس ہندو نے خود اغوا کیا تھا۔ جھوٹے سچے گواہ ڈال کر میں نے یہ کیس ثابت کر لیا تھا۔

میں نے ایک ہندو کو پھانسی چڑھوا دیا اور ایک کو جیل بھجوا دیا لیکن میں مشرقی پاکستان کو بنگال کے ان بچھوؤں سے نہ بچا سکا۔

***

ٹیڑھا پاؤں سیدھے لوگ

بھارت کے صوبہ بہار میں پٹنہ اور گیا کے درمیان ریلوے لائن اور سڑک سے کچھ دور ہٹ کر دیہاتی علاقے کا ایک تھانہ تھا۔ وہ تھانہ آج بھی ہو گا لیکن میں یہ بھی کہہ سکتا ہوں کہ اب تو وہاں کی دنیا ہی بدل گئی ہو گی۔ میں اس تھانے کا انچارج تھا۔ میں جو واردات اور تفتیش پیش کرنے چلا ہوں، اس کا مختصراً پس منظر واضح کرنے کی اجازت چاہوں گا۔

پیر پرستی کا جب ذکر آتا ہے تو اسے صوبہ سرحد، پنجاب اور سندھ تک ہی محدود رکھا جاتا ہے جیسے پیر اور پیر پرستی ان ہی صوبہ جات میں ہوتی ہو۔ میں اس کی تصحیح کر کے وضاحت یوں پیش کروں گا کہ برصغیر پاک و ہند میں جہاں جہاں مسلمان آباد ہیں وہاں پیر لازماً موجود ہیں۔ انسان جس قدر پسماندہ ہوں گے پیر پرستی اتنی ہی لازمی سمجھی جائے گی جیسے یہ اپنے مذہب کا ایک لازمی جزو ہو۔ پیر تو انگلینڈ اور یورپ کے ان ملکوں تک بھی پہنچ گئے ہیں جہاں پاکستانی مقیم ہیں۔

میں صوبہ بہار کے جس دیہاتی علاقے کی واردات سنانے چلا ہوں، اس میں دو بڑے پیر تھے۔ مریدی کا حلقہ دونوں کا وسیع تھا۔ یہ دونوں پیر اور ان کے مرید ویسے ہی تھے جیسے سرحد، پنجاب اور سندھ میں دیکھے جاتے ہیں۔ فرق صرف زبان کا تھا۔

ان میں ایک کا نام شاہ مہتاب ولی اللہ تھا اور شاہ مہتاب کے نام سے مشہور تھا۔ یہ چھوٹے سے گاؤں راجن میں رہتا تھا۔ وہاں اس کی کشادہ اور دیدہ زیب حویلی تھی جسے لوگ تقدس کی نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے۔ گاؤں میرے تھانے کے علاقے میں آتا تھا۔ دوسرے پیر کا گاؤں دوسرے تھانے کے تحت تھا۔

اس واردات کا تعلق صرف شاہ مہتاب کے ساتھ ہے بہ ایں وجہ میں دوسرے پیر کا

مزید ذکر نہیں کروں گا۔ میں اس اعتراف میں ذرا سی بھی جھینپ یا شرم محسوس نہیں کروں گا کہ میں خود شاہ مہتاب کا معتقد اور مرید تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ پر مریدی کی بیعت نہیں کی تھی لیکن عقیدت مندی کٹڑ مریدوں جیسی تھی۔ دیہاتیوں کے علاوہ قریبی قصبوں کے تعلیم یافتہ مسلمان بھی شاہ مہتاب کے اگر باقاعدہ مرید نہیں تھے تو معتقد ضرور تھے۔ اس عقیدت مندی کا باعث یہ تھا کہ شاہ مہتاب دینی امور میں کچھ دسترس رکھتا تھا اور اس کا اندازِ خطابت پُراثر تھا۔ وہ مہینے میں ایک بار اپنے ہاں درس دیا کرتا تھا۔ کبھی فرصت ہوتی تو میں بھی اس کا درس سننے چلا جایا کرتا تھا، درس کے علاوہ اس کی جو کرامات سنی تھیں وہ میرے دل نے بغیر تحقیق و تفتیش قبول کر رکھی تھیں۔

میں پہلی بار اس کے سلام اور قدم بوسی کو گیا اور اسے پتہ چلا کہ میں تھانے دار ہوں تو اس نے اٹھ کر میرا استقبال کیا اور تپاک سے ملا۔ اس کی حویلی کا یہ ایک کشادہ کمرہ تھا جس میں وہ مریدوں وغیرہ کو بٹھایا کرتا اور وہیں درس دیا کرتا تھا۔ مجھے دوسرے کمرے میں لے جانے لگا تو میں جان گیا کہ تھانے داری کی وجہ سے یہ میری تعظیم و تکریم کر رہا ہے۔ میں نے اسے روک دیا اور کہا کہ میں اس کے آستانے پر تھانے دار کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک معتقد، پیروکار اور غلام کی حیثیت سے آیا ہوں اور اس کے قدموں میں بیٹھ کر روحانی تسکین چاہتا ہوں۔

یہ خاص طور پر پیش نظر رکھیں کہ میں جاہل اور ذہنی لحاظ سے پسماندہ نہیں تھا اور میں کم فہم اور بے علم بھی نہیں تھا۔ تعلیم کا حصول ہمارا خاندانی ورثہ تھا جو مجھ تک پہنچا اور میں نے حتی المقدور تعلیم حاصل کی تھی۔

ایک رات میرے گھر کے دروازے کی دستک نے مجھے بڑی گہری اور پُرسکون نیند سے جگا دیا۔ میں اپنی تھانے داری کو کوستا ہوا، دروازے تک گیا اور تھانے دارانہ رعب سے پوچھا کون ہے؟ دروازہ کھولا۔ تھانے سے ایک کانسٹیبل آیا تھا۔ اسے کہا کہ تم یقیناً کوئی اچھی خبر نہیں لائے ہو گے!

''بہت بری خبر ہے صاحب!''— اس نے رندھی ہوئی آواز میں خبر سنائی— ''شاہ مہتاب ولی اللہ قتل ہو گئے ہیں۔ لاش ان کے سونے کے کمرے میں پڑی ہے''۔

بخدا یوں لگا جیسے میں جاگا نہیں، خواب دیکھ رہا ہوں اور بہت برا خواب ہے لیکن

کانسٹیبل کی سسکی سن کر مجھے یقین ہو گیا کہ یہ خواب نہیں۔ کانسٹیبل رو رہا تھا۔ میرے تھانے کے چند ایک افراد شاہ مہتاب کے مرید تھے۔ وقت دیکھا۔ رات کے دو بج رہے تھے۔ میں نے بڑی تیزی سے وردی پہنی اور تقریباً دوڑتا ہوا تھانے پہنچا۔ وہاں تو سارا تھانہ ہی بیدار ہو چکا تھا۔ شاہ مہتاب کے جو کانسٹیبل مرید تھے، وہ ہچکیاں اور سسکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔

رپورٹ لانے والوں کے ساتھ گاؤں کا مکھیا بھی تھا۔ میں اسے مکھیا کی بجائے نمبردار لکھوں گا کیونکہ یہاں جرم و سزا کی جو کہانیاں چھپتی ہیں ان میں نمبردار کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہے...... اس ہندو نمبردار کے ساتھ گاؤں کے دو اچھی حیثیت والے زمیندار تھے۔ یہ دونوں مسلمان تھے۔ ذہن میں رکھیں کہ شاہ مہتاب کے گھر میں کوئی اور مرد نہیں تھا۔ اس کی عمر پچاس سال سے کچھ زیادہ تھی، دو بیویاں تھیں اور صرف ایک بیوی میں سے ایک بیٹا تھا جو ابھی بہت چھوٹا تھا۔ باقی چار یا غالباً پانچ بیٹیاں تھیں۔

ابتدائی رپورٹ لکھنے کے لیے جو ضروری معلومات و تفصیلات درکار تھیں وہ میں نے رپورٹ لانے والوں سے لیں اور تحریر کر لیں۔ یہ تو ضابطہ پولیس کی کارروائیاں ہوتی ہیں جو تفصیل سے بیان کرنا کوئی ضروری نہیں، میں آپ کی دلچسپی کو پیش نظر رکھوں گا۔

پیر کا گاؤں وہاں سے ڈیڑھ پونے دو میل کے فاصلے پر تھا۔ وہ بھی زمانہ تھا، پولیس کے پاس کوئی موٹر ٹرانسپورٹ نہیں ہوتی تھی۔ تیز رفتار ذریعہ گھوڑا تھا اور کانسٹیبلوں کے پاس سائیکل ہوتے تھے۔ پیدل چلنے میں کوئی عار محسوس نہیں ہوتی تھی۔ وہ زمانہ پیدل چلنے کا ہی تھا لیکن نقصان یہ ہوتا تھا کہ موقعہ پر بروقت پہنچنا ممکن نہیں ہوتا تھا۔ کچھ ایسے ہی میں عملے کے ضروری افراد کو اور رپورٹ لانے والوں کو ساتھ لے کر واردات والے گاؤں پہنچ گیا۔

راجن گاؤں کوئی ایسا چھوٹا بھی نہ تھا لیکن اتنا بڑا گاؤں بھی نہ تھا۔ صوبہ بہار ہندو اکثریت کا صوبہ تھا۔ دیہاتی علاقے میں مسلمانوں کی آبادی ذرا زیادہ تھی لیکن اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ راجن گاؤں کی زیادہ آبادی ہندوؤں کی ہی تھی۔

قتل کی وارداتوں کے متعلق بھی کچھ تبصرہ پیش کر دوں تو بے محل نہ ہو گا۔ آج کل تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ لوگ لوگوں کو کس طرح بے خوف و خطر قتل کر رہے ہیں اور قانون بے بس اور مجبور ہو کر رہ گیا ہے۔ اگر قانون موجود ہے تو ایسے ہی قانون کو جنگل کا قانون کہا جاتا

ہے۔ ایک ہی بار پورے خاندان کو کاٹ دیا جاتا ہے اور مقتولین کے لواحقین کی کہیں بھی شنوائی نہیں ہوتی۔ یہ ایک غیر معمولی صورتِ حال ہے جس پر قابو پانے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ پولیس پر قابو پایا جائے تاکہ مک مکا والا سسٹم ختم ہو جائے۔

میں جس دور کی واردات سنا رہا ہوں اس دور میں سب سے زیادہ قتل پنجاب کے کچھ علاقوں میں ہوتے تھے جن میں پوٹھوہار، ضلع سرگودھا، ضلع جہلم اور سکھوں کا علاقہ دوآبہ خاص طور شامل ہیں۔ یہ سب خاندانی عداوتوں کی بنا پر یا انتقامی قتل ہوتے تھے۔ ان علاقوں کے لوگوں کے لیے قتل کوئی چونکا دینے والی واردات نہیں ہوتی تھی۔ میں صوبہ بہار کی بات کر رہا ہوں۔ وہاں کے لوگ قتل کے صرف لفظ سے واقف تھے۔ اگر ڈاکو کسی کو قتل کر دیتے تو جہاں جہاں تک یہ خبر پہنچتی تھی لوگوں پر خوف و ہراس طاری ہو جاتا تھا۔ اس صوبے کے لوگوں کو شرفاء کہہ لیں بزدل کہہ لیں یا امن پسند کہہ لیں، قتل کی واردات نہ ہونے کے برابر تھی۔

میں جو واردات سنا رہا ہوں، اس میں ایک مشہور و معروف اور مقبول عام پیر قتل ہو گیا تھا جسے لوگ ولی اللہ بھی مانتے تھے۔ میں جب مقتول کی حویلی تک پہنچا تو گاؤں کی ساری ہی آبادی حویلی کے سامنے اکٹھی ہو چکی تھی۔ ذرا سی دیر میں سارے گاؤں کو پتہ چل گیا تھا کہ پیر صاحب قتل ہو گئے ہیں یا یہ کہ پیر صاحب اپنے پلنگ پر مردہ پائے گئے ہیں۔

پہلے بتا چکا ہوں کہ یہ خاصی کشادہ حویلی تھی جو قلعہ نما تھی۔ مجھے اندر لے گئے۔ میں نے ان افراد کو جو مجھے تھانے سے لائے تھے، باہر ہی کھڑا کر دیا اور پیر کی دونوں بیویوں کے ساتھ اس کمرے میں گیا جس میں اس کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

اس علاقے میں ابھی بجلی نہیں گئی تھی۔ میرے ساتھ تین لمبی ٹارچیں تھیں۔ حویلی میں پیٹرومیکس لیمپ جلا لیا گیا تھا۔ اس کی روشنی خاصی زیادہ تھی۔

یہ شاہ مہتاب کا بیڈروم تھا۔ کمرے کی زیب و زیبائش نہایت اچھی تھی۔ پلنگ خاصا چوڑا تھا جو کمرے کے وسط میں رکھا ہوا تھا۔ تکیئے کی طرف سے یہ دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا۔ کمرے میں ایک پیٹرومیکس لیمپ موجود تھا، ایک اور لیمپ آ گیا۔ ان کی روشنی ٹیوب لائٹوں جیسی تھی۔ مقتول کی لاش پلنگ پر پیٹھ کے بل پڑی تھی۔ چہرے پر کرب ناک تاثر تھا۔ منہ کچھ زیادہ کھلا ہوا اور آنکھیں بھی کھلی ہوئی تھیں۔ چہرے کا یہ تاثر ہی بتا رہا تھا کہ اس

کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ میں نے اس کی گردن دیکھی۔ ہاتھوں سے گلا گھونٹنے کے صاف نشانات موجود تھے۔ شہ رگ کے دائیں اور بائیں طرف ایسے نشانات تھے جیسے قاتل کے ناخن کھال میں اترے ہوں۔ گردن کے دائیں بائیں بھی نشانات تھے جن سے یہ پتہ چلتا تھا کہ پہلے اس کی شہ رگ ایک ہاتھ سے دبائی گئی تھی پھر دونوں ہاتھوں سے گردن دبائی گئی یعنی گلا گھونٹا گیا۔

جو خاص بات دیکھی وہ یہ تھی کہ لاش نیم برہنہ تھی۔ کرتہ پہنا ہوا تھا، پاجامہ نہیں تھا۔ پاجامہ پلنگ کے ایک پائنتی والے کونے پر پڑا ہوا تھا۔

پلنگ پوش سفید تھا۔ اس پر ٹوٹی ہوئی رنگین چوڑیوں کے ٹکڑے بکھرے ہوئے تھے۔ یہ ذہن میں رکھیں کہ واردات میں عورت ہوگی تو ٹوٹی ہوئی چوڑیاں ضرور ہوں گی۔ یہ عموماً زبردستی کی نشانی ہوتی ہے۔ یوں بھی کہہ لیں کہ ٹوٹی ہوئی چوڑیوں سے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ قتل کے وقت ایک عورت بھی یہاں موجود تھی۔

مقتول کی بڑی بیوی نے مجھے بتایا کہ چوڑیوں کے کچھ ٹکڑے فرش پر بھی بکھرے ہوئے ہیں۔ میں نے یہ ٹکڑے دیکھے اور چن لئے۔ پلنگ والے ٹکڑے بھی میں نے اکٹھے کر کے اپنے قبضے میں کر لئے۔

پلنگ پوش پر مجھے کچھ اور نشانات بھی نظر آئے۔ اس پر ذرا سی مٹی بکھری ہوئی تھی اور ایسے نشانات بالکل واضح تھے کہ پلنگ پر کوئی چڑھا جو جوتے پہنے ہوئے تھا وہ نشانات جوتیوں کی رگڑ کے تھے۔ ان جوتیوں کے نیچے مٹی لگی ہوئی تھی۔ میرا قیاس یا قیافہ کہتا تھا کہ قاتل جوتیاں پہنے ہوئے پلنگ پر چڑھا، سوئے ہوئے شاہ مہتاب پر بیٹھ گیا اور اس کا گلا گھونٹ دیا لیکن چوڑیوں کے ٹکڑے بتاتے تھے کہ یہ کوئی آدمی نہیں بلکہ عورت تھی۔ چوڑیوں کا ٹوٹنا اور ان کے ٹکڑوں کا پلنگ کے علاوہ فرش پر بھی بکھر جانا مزاحمت اور دھینگا مشتی کی نشاندہی کرتا تھا۔

پولیس والے جذباتی نہیں ہوا کرتے لیکن میں صدمے کی کیفیت میں تھا اور جذبات مجھ پر غالب آ رہے تھے۔ یہ تو میرا پیر و مرشد تھا جس کے درس مجھے متاثر کیا کرتے تھے اور میری زندگی اسی سانچے میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ یقین جانیں میں مبالغہ آرائی نہیں کر رہا۔ میں نے عہد کر لیا تھا کہ دن رات ایک کر دوں گا اور قاتل کو پکڑ کر سزائے موت دلاؤں گا

لیکن کمرے میں ایک ایسی چیز دیکھی جس نے مجھے کچھ اور ہی نوعیت کا صدمہ پہنچایا۔ وہ تھی شراب کی بدبو جو کمرے میں پھیلی ہوئی تھی۔ پلنگ کے تکیئے کی طرف ایک گول تپائی پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی اور دو گلاس بھی۔ بوتل آدھی خالی ہو چکی تھی اور دو گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی شراب پڑی ہوئی تھی۔ میرا دل تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ میرا پیرو مرشد شراب بھی پیتا تھا۔ میں نے صدمے اور جذبات سے مغلوب ہو کر یہ احمقانہ حرکت کی کہ لاش کے کھلے ہوئے منہ پر جھک کر ناک اس کے قریب کر کے سونگھا تو شراب کی بو نے مجھے جیسے زور سے دھکا مارا ہو۔

چوڑیوں کا ٹوٹنا اور ٹکڑوں کا اس طرح بکھر جانا ایک واضح ثبوت تھا کہ کمرے میں کوئی غیر عورت آئی یا لائی گئی تھی۔ بات تو یہ بھی میرے لیے صدمے والی تھی لیکن اپنے آپ کو میں نے یہ دھوکا دیا کہ شاہ مہتاب کی اپنی دو بیویوں میں سے کوئی اس کے پاس ہوگی۔ میں نے تصدیق یا تردید کی خاطر دونوں بیویوں سے پوچھا کہ آج رات دونوں میں سے کون اس کے پاس تھی۔

دونوں نے انکار میں سر ہلائے۔

''ایک مہینہ ہو گیا ہے''۔۔۔ چھوٹی بیوی نے کہا۔۔۔ ''ہم دونوں میں سے کوئی بھی کسی بھی رات اس کمرے میں نہیں سوئی نہ بلائی گئی ہے''۔

''یہ کوئی اور تھی''۔۔۔ چھوٹی بیوی نے کہا۔۔۔ ''آپ نے یہاں جو دیکھنا ہے، دیکھ لیں پھر میں آپ کو بتاؤں گی وہ کون تھی''۔

مجھے ان دونوں بیویوں پر بھی شک تھا۔ میں نے دونوں کے بازوؤں میں چوڑیاں دیکھی تھیں۔ ٹوٹی ہوئی چوڑیاں کے ٹکڑے ان دونوں کی چوڑیوں سے ملا کر دیکھنے تھے لیکن فوری طور پر نہیں۔ کوئی گھریلو تنازعہ قتل کا باعث ہو سکتا تھا۔ میں نے لاش کا نظری معائنہ اچھی طرح کر لیا اور موقعۂ واردات کو بھی پوری تسلی سے دیکھ لیا تو لاش کو پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوانے کا انتظام کر دیا۔ لاش کو نو ساڑھے نو میل دور سرکاری ہسپتال میں جانا تھا۔

دونوں بیویاں مجھے ایک اور کمرے میں لے گئیں۔ یہ بھی بیٹھک جیسا کمرہ تھا۔ چھوٹی بیوی نے کہا تھا کہ وہ مجھے کچھ بتائے گی کہ یہ عورت کون ہو سکتی ہے جس کی چوڑیاں واردات والے کمرے میں پائی گئی تھیں۔ میں نے اس بیوی کو اپنے پاس بٹھا لیا اور بڑی

سے کہا کہ وہ ابھی چلی جائے اور میں اسے بھی بلاؤں گا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے چھوٹی بیوی سے گھر کے افراد کی تفصیل پوچھی۔

یہ تفصیل یوں تھی کہ مقتول کی ایک تو یہ بڑی بیوی تھی جسے پہلی بیوی کہہ لیں۔ اس کی عمر پینتالیس اور پچاس سال کے درمیان تھی۔ جوانی ڈھل گئی تھی اور ویسے بھی وہ واجبی سی شکل و صورت کی تھی۔ چھوٹی بیوی کی عمر تیس سال کے لگ بھگ تھی۔ یہ جوانی کا عروج تھا اور دلکش شکل صورت والی تھی اور جسم کی ساخت کے لحاظ سے تو اس میں ایک خاص جاذبیت تھی۔ میں نے یہ خاص بات دیکھی کہ ان دونوں بیویوں کی آنکھوں میں آنسوؤں کی ذرا سی نمی بھی نہیں تھی۔ چہروں پر اداسی کا تاثر تو تھا لیکن ان کی کیفیت ماتمی ہرگز نہیں تھی جو جوان عورتوں کے چہروں پر آ جاتی ہے جب وہ بیوہ ہو جاتی ہیں۔ بڑی بیوی کی دو بیٹیاں تھیں۔ ایک کی عمر بیس سال کے لگ بھگ اور دوسری پندرہ سولہ سال کی تھی۔ چھوٹی کا ایک بیٹا تھا جس کی عمر چھ سال اور ایک بیٹی تھی جو دس سال کی تھی۔ اس طرح گھر میں اور کوئی مرد نہیں تھا۔

چھوٹی بیوی نے سلیٹی رنگ کا ململ کا دوپٹہ میرے حوالے کرتے ہوئے کہا کہ یہ اس عورت کا دوپٹہ ہے جو مقتول کے کمرے میں آئی تھی۔ اس نے ساری بات سنائی جو میں اپنی زبان میں سنا دیتا ہوں۔ ان کے پاس گھڑی تو تھی نہیں کہ پتہ چلتا کہ یہ واقعہ کتنے بجے رات ہوا تھا۔ اس نے یوں بتایا کہ آدھی رات گزر گئی تھی جب وہ پیشاب کے لیے باہر آئی۔ اس حویلی کا ایک دروازہ تو سامنے کی طرف تھا جدھر سے مرید وغیرہ آتے اور ملاقات والے بڑے کمرے میں بیٹھ جاتے تھے۔ ایک دروازہ حویلی کے دائیں پہلو کی طرف تھا جو عام لوگوں کے لیے نہیں تھا۔ چھوٹی بیوی نے بتایا کہ اس دروازے سے رات کے وقت پیر کے خاص ملاقاتی آیا اور جایا کرتے تھے۔ خاص ملاقاتیوں میں عورتیں خاص طور پر شامل تھیں۔

چھوٹی بیوی جب مجھے یہ تفصیلات سنا رہی تھی تو میں یوں محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ شاہ مہتاب ولی اللہ کی اصلیت سے پردہ اٹھا رہی ہو اور جسے میں سونا سمجھتا رہا تھا وہ پیتل یا تانبے کی شکل میں میرے سامنے آ رہا ہو۔ اس نے بتایا کہ وہ جب صحن میں آئی تو اسے حویلی کے اس بغلی دروازے کا ایک کواڑ ذرا سا کھلا نظر آیا اور ایک عورت دکھائی دی جو دروازے

میں سے باہر نکل رہی تھی۔ اگر چھوٹی بیوی کو اس وقت معلوم ہو جاتا کہ یہ اس کے خاوند کو قتل کر کے یا قتل کروا کے بھاگ رہی ہے تو وہ دوڑ کر اسے پکڑ لیتی لیکن چھوٹی بیوی نے صرف یہ محسوس کیا کہ آدھی رات کے وقت ایک عورت کا اس دروازے میں سے اندر آنا اور چلے جانا کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں تھی۔ اس نے بتایا کہ یہ تو شاہ مہتاب کا معمول تھا۔

چاندنی تو خاصی چمک دار تھی لیکن چاند افق کی طرف چلا گیا تھا اس لئے سائے اس طرح پڑ رہے تھے کہ چھوٹی بیوی اس عورت کو پہچان نہ سکی اور اس نے عورت کو آمنے سامنے سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ دروازے میں عورت کا دایاں پہلو اور چہرہ دائیں طرف سے نظر آیا اور وہ دروازے میں سے نکل گئی۔ چھوٹی بیوی کو رکھوالی والے کتے کا خیال آیا جو کھلا ہوا تھا اور حویلی کے باہر موجود تھا۔ وہ بل ڈاگ تھا جسے پنجاب میں بوہلی کہا جاتا ہے۔ وہ خونخوار کتا تھا۔

اس عورت کے نکل جانے کے فوراً بعد کتا غرایا پھر بھونکا۔ یہ آوازیں چھوٹی بیوی نے سنیں لیکن دروازے میں جا کر دیکھا نہیں کہ یہ عورت کون تھی۔ وہ جانتی تھی کہ حسب معمول شاہ مہتاب نے ایک عورت کو اپنے بیڈ روم کی زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ بنایا تھا۔

کتا جب بھونکا تو چھوٹی بیوی نے بھاگتے قدموں کی آوازیں سنیں اور پھر کتے کے غرانے کی آوازیں بھی سنائی دیں۔ چند سیکنڈ بعد عورت کی چیخ سنائی دی تب چھوٹی بیوی باہر کو دوڑی کہ وہ جو کوئی بھی ہے اسے کتے سے بچالے۔ اس خونخوار کتے نے تو اسے چیر پھاڑ دینا تھا۔

یہ حویلی گاؤں سے باہر تھی اور اس کے اردگرد جگہ خالی تھی اور ذرا فاصلے سے کھیت شروع ہو جاتے تھے۔ چھوٹی بیوی باہر نکلی تو اسے بیس پچیس قدم دور یہ منظر نظر آیا کہ کتے نے عورت کو اگلی ٹانگیں اٹھا کر پکڑ لیا تھا۔ کتے نے اسے کاٹا بھی ہوگا اور پنجوں سے اس کی کہیں کہیں سے کھال بھی اتاری ہوگی لیکن کتا خود ہی رک گیا اور عورت دوڑتی گئی اور حویلی کے پچھواڑے چلی گئی۔ اس جگہ درخت کچھ زیادہ تھے جن کے سائے میں کتا نظر تو آتا تھا لیکن بہت اچھی طرح نہیں۔ صرف یہ نظر آیا کہ کتا ایک ہی جگہ ناچ کود رہا تھا۔

چھوٹی بیوی بڑی تیزی سے کتے تک پہنچی۔ اس نے دیکھا کہ عورت کا دوپٹہ اس طرح کتے پر گر پڑا تھا جیسے کتا جال میں پھنس گیا ہو۔ دوپٹہ اس عورت نے دانستہ نہیں پھینکا

ہوگا بلکہ کتے نے جب اس تک پہنچ کر اس پر حملہ کیا تو اس کا دوپٹہ سرک کر کتے کے جسم اور سر پر گرا۔ یہی وجہ تھی کہ کتا رک گیا تھا اور اب وہ اپنے آپ کو دوپٹے سے آزاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

چھوٹی بیوی نے جا کر کتے کو دوپٹے سے آزاد کیا اور اسے پٹے سے پکڑ لیا۔ چونکہ یہ کتا ان کا اپنا تھا اس لیے وہ چھوٹی بیوی کے ہاتھ چاٹنے لگا اور پیار کی حرکتیں بھی کیں۔ چھوٹی بیوی دوپٹہ ساتھ لے کر واپس آئی اور حویلی میں داخل ہو کر دروازہ بند کر دیا۔

میں نے اسے کہا کہ وہ ایسی عورت کو کتے سے بچانے کے لیے کیوں دوڑ پڑی تھی جو اس کے خاوند کے بیڈ روم میں آئی تھی؟...... چھوٹی بیوی نے جواب دیا کہ یہ محض انسانی ہمدردی کا جذبہ تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ یہ عورت اپنے آپ ہی اس کے خاوند کو خراب کرنے نہیں آئی تھی بلکہ اس کا خاوند جسے میں اور بے شمار لوگ ولی اللہ سمجھتے تھے، عورتوں کا شکاری اور رسیا تھا۔

پھر چھوٹی بیوی نے اپنے بیان میں کہا کہ وہ کچھ خوش اور مطمئن ہو رہی تھی کہ اس نے ایک عورت کو کتے سے بچالیا ہے لیکن معلوم نہیں کیا بات تھی کہ وہ اپنے دل پر کچھ گھبراہٹ سی محسوس کرنے لگی تھی جیسے کوئی ایسا واقعہ ہو گیا ہے یا ہونے والا ہے جسے وقوع پذیر نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے شاہ مہتاب کے کمرے کی طرف دیکھا۔ کمرے کا ایک کواڑ کھلا ہوا تھا اور لالٹین کی روشنی باہر آ رہی تھی۔ عورت کے جانے کے بعد شاہ مہتاب کو دروازہ بند کر لینا چاہیے تھا اور لالٹین بجھا دینی چاہیے تھی یا اس کی بتی نیچے کر دیتا۔

پھر باہر کی کسی عورت کو جس رات آنا ہوتا ہے اس رات کتا نہیں کھولا جاتا یا عورت کو لانے والا کوئی خاص مرید ہوتا ہے جسے کتا پہچانتا ہے اور اس پر نہ بھونکتا ہے نہ غراتا ہے۔ عورت کو جب مہتاب شاہ رخصت کرتا ہے تو کتے سے بچانے کے لیے خود باہر تک اس عورت کے ساتھ جاتا ہے اور کتے کو اپنے پاس بلا لیتا ہے۔ اس رات شاہ مہتاب اس عورت کے ساتھ نہ گیا۔

چھوٹی بیوی نے سوچا کہ شاہ مہتاب زیادہ پی گیا ہوگا اور بے ہوش پڑا ہوگا۔ چھوٹی بیوی نے سوچا کہ ایسا بھی کبھی نہیں ہوا۔

وہ بیت الخلاء میں چلی گئی اور وہاں سے نکلی تو وہ شدت سے محسوس کرنے لگی کہ اسے

دیکھ ہی لینا چاہئے کہ ابھی تک شاہ مہتاب کا دروازہ کیوں کھلا ہے اور لالٹین کیوں جل رہی ہے۔ وہ کمرے میں گئی تو شاہ مہتاب کو اس حالت میں پڑا دیکھا جو میں نے پہلے آپ کو بتایا ہے۔ چھوٹی بیوی نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھ کر ذرا ہلایا اور آواز دی، شاہ صاحب، شاہ صاحب لیکن شاہ صاحب اسی حالت میں پڑے رہے۔ منہ کھلا رہا اور آنکھیں بھی کھلی رہیں۔ چھوٹی بیوی کی چیخ نکل گئی اور اس نے بڑی بیوی کو جا جگایا۔

مریدوں سے ملاقات والے کمرے میں دو تین آدمی سویا کرتے تھے۔ شاہ مہتاب خود بھی چاہتا تھا کہ ایک دو آدمی حویلی میں موجود رہنے چاہئیں۔ دونوں بیویوں نے انہیں جگایا اور ان آدمیوں نے مکھیا کو بتایا اور پھر سارے گاؤں میں یہ اطلاع پہنچ گئی۔

میں نے دوپٹہ اپنے قبضے میں لے لیا اور اس برآمدگی کی کاغذی کارروائی بمعہ دستخط و نشان انگوٹھا گواہان مکمل کر لی۔

آپ جرم وسزا کی جو تفتیشی کہانیاں پڑھتے ہیں ان میں کھوجی کا ذکر ضرور ہوتا ہے۔ کھوجی پولیس کے لیے بڑے ہی کارآمد ثابت ہوا کرتے تھے لیکن اس علاقے کی پولیس کی یہ ایک کمزوری تھی کہ اس طرح وہاں کھوجی نہیں تھے جس طرح پنجاب میں ہوا کرتے تھے۔ ڈسٹرکٹ پولیس ہیڈ کوارٹر میں چند ایک ملازمین موجود تھے۔ جنہیں یہ فن سکھایا گیا تھا۔ وہ اچھا خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ ان سے ہم خاطر خواہ استفادہ حاصل کرنے سے قاصر رہ جاتے تھے کیونکہ دور دراز تھانے تک کھوجی کو پہنچنے کے لیے وقت درکار ہوتا تھا۔ کبھی تو کھوجی اس وقت پہنچتا تھا جب کھرے یعنی نقوش پا بجھ چکے ہوتے یا مدھم پڑ گئے ہوتے تھے۔

میں اس معاملے میں خوش نصیب تھا کہ ایک پرانا ہیڈ کانسٹیبل نقوش پا دیکھنے میں خاصا تجربہ رکھتا تھا۔ یہ فن جسے کھرا اٹھانا کہتے ہیں بہت ہی مشکل اور پیچیدہ فن ہے جو صرف مشاہدے سے اور تجربے سے ہی دماغ میں بیٹھتا ہے۔ مجھے بھی اس کی کچھ سوجھ بوجھ تھی لیکن یہ دعویٰ میں نے کبھی نہیں کیا تھا کہ میں کھرا اٹھا سکتا ہوں۔

میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور اسے مقتول کی چھوٹی بیوی کا بیان سنا کر کہا کہ وہ باہر جائے اور کھرا اٹھائے۔ اس کے پاس ٹارچ تھی میں نے اسے کہا کہ وہ ایک پٹرومیکس لیمپ بھی ساتھ لے جائے اور ایک کانسٹیبل کو ساتھ لے لے جو لیمپ اٹھائے گا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے دوسرا انتظام یہ کیا کہ دو کانسٹیبلوں کو بلا کر کہا کہ وہ حویلی کے پچھواڑے اور

دوسری طرف گشت کرتے رہیں اور کسی کو اس طرف نہ آنے دیں تاکہ کھرے محفوظ رہیں۔ لوگوں کا ہجوم حویلی کے سامنے کی طرف تھا۔ لاش جب پوسٹ مارٹم کے لیے چلی گئی تو اس ہجوم میں کمی آنے لگی تھی۔

میں نے مقتول کی چھوٹی بیوی کو ابھی فارغ نہیں کیا تھا۔ وہ خود بھی کچھ اور کہنے کے موڈ میں نظر آتی تھی۔ میں اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''کیا تم اپنے خاوند کے پاس آنے والی عورتوں میں سے کسی کو جانتی ہو؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''نہیں!''۔۔۔ اس نے جواب دیا۔۔۔ ''مریدوں کی کمی نہیں۔ کئی مرید اپنی جوان بیویوں کو، اپنی بہنوں کو اور باپ اپنی جوان بیٹیوں کو یہاں لایا کرتے تھے۔ بے اولاد عورتیں تو آتی ہی رہتی تھیں۔ ہم دونوں بیویاں جانتی ہیں یہاں کیا ہوتا رہا ہے۔ شراب تو چلتی ہی تھی اور بدکاری دن کو بھی ہوتی تھی اور رات کو بھی۔ ہمیں جرأت نہیں ہوتی تھی کہ جھانک کر بھی دیکھ سکیں''۔

میرے کہے پوچھے بغیر چھوٹی بیوی نے یہ سنانا شروع کر دیا کہ وہ شاہ مہتاب کے چنگل میں کس طرح آئی تھی۔ تفتیش میں اس کی ضرورت تو نہیں تھی لیکن میں نے اسے بولنے دیا۔ اس سے میں کچھ فائدہ حاصل کر سکتا تھا۔ وہ اس طرح کہ وہ بولتی چلی جاتی اور میں انہماک اور ہمدردی سے سنتا رہتا تو میرے ساتھ بے تکلف ہو جاتی پھر توقع رکھی جا سکتی تھی کہ اس کی زبان سے کوئی کارآمد بات نکلے گی۔

اس نے بتایا کہ گیارہ بارہ سال پہلے جب اس کی عمر سولہ سترہ سال تھی تو یہ اپنی بڑی بہن کے ساتھ شاہ مہتاب کے پاس آئی تھی۔ آنے کی وجہ یہ تھی کہ اس کی بڑی بہن کی شادی ہوئے چار سال گزر گئے تھے اور ابھی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ اس کی بہن کی ساس اسے شاہ مہتاب کے پاس لاتی تھی اور پھر یہ چھوٹی بیوی بہن کے ساتھ آتی رہی۔

شاہ مہتاب نے دیکھا کہ یہ تو نوخیز اور خاصی خوبصورت لڑکی ہے تو شاہ مہتاب نے اس کے باپ کو بلا کر کہا کہ اگر وہ چاہتا ہے کہ اس کی بڑی بیٹی کی اولاد ہو جائے اور وہ طلاق سے یا سسرال کے طعنوں سے بچی رہے تو چھوٹی بیٹی اس کے ساتھ بیاہ دی جائے۔ میں جانتا ہوں کہ شاہ مہتاب نے کس جلالی کیفیت میں اور کیسے انداز سے اس لڑکی کے باپ کو

ہراساں اور متاثر کیا ہوگا۔ باپ نے اس نوخیز دوشیزہ کو شاہ مہتاب کے ساتھ بیاہ دیا۔ اس وقت شاہ مہتاب کی عمر چالیس سال سے تجاوز کر گئی تھی۔

پہلی رات شاہ مہتاب نے خود تو شراب پی ہی رکھی تھی، اس لڑکی کو بھی مجبور کرنے لگا کہ یہ بھی شراب پیئے۔ لڑکی نے انکار کر دیا۔ کچھ دنوں بعد شاہ مہتاب نے اسے زبردستی شراب پلا دی...... میں آپ کو یہ ساری تفصیلات نہیں سناؤں گا۔ سنانے والی بات یہ ہے کہ بڑی بیوی یعنی پہلی بیوی کا رویہ اس چھوٹی بیوی کے ساتھ سوکنوں والا ہونا چاہیے تھا لیکن اس بھلی عورت نے اسے گلے لگا لیا اور کہا کہ ہم اس کی قیدی ہیں اور وہ کتنا ہی کیوں نہ تڑپے، اس سے مار پٹائی کروا سکتی ہے آزاد نہیں ہوسکتی۔

چھوٹی بیوی نے مجھے سنایا کہ اسے شاہ مہتاب نے صرف دو مہینے اپنے ساتھ اس طرح رکھا جیسے اس پر مرمٹا ہو پھر اس سے نظریں پھیر لیں اور اپنی ڈگر پر چل پڑا۔ چھوٹی بیوی کو پہلی بار پتہ چلا کہ رات اس کے خاوند کے پاس ایک غیر عورت آئی تھی تو اس نے شاہ مہتاب سے گلہ شکوہ کیا۔ شاہ مہتاب نے اسے بری طرح ڈانٹ پلا دی اور یہ دبک گئی۔ آخر نوجوان لڑکی تھی اور خاوند کو اپنا رفیق سمجھتی تھی اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگئی تھی کہ یہ خاوند اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ ایک بار پھر اس نے شاہ مہتاب سے باز پرس کی کہ گذشتہ رات وہ کون تھی جو آئی تھی۔

شاہ مہتاب نے اسے ایک تھپڑ منہ کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف مار کر کہا کہ پھر کبھی زبان کھولی تو شہر کے کنجروں کے پاس بھجوا دوں گا اور چکلے میں بوڑھی ہو کر مرو گی۔ اس کے بعد کبھی پانچویں چھٹے مہینے شاہ مہتاب اسے اپنے بیڈروم میں بلا لیتا اور اس کے ساتھ اس کا رویہ ایسا ہوتا جیسے یہ اس کی بیوی نہیں بلکہ زرخرید لونڈی ہو۔

اب یہ چھوٹی بیوی شاہ مہتاب کے قید خانے میں گیارہ بارہ برس گزار چکی تھی۔ اس کا بیان طویل تھا جس میں اس نے کچھ باتیں تفصیل سے سنائی تھیں۔ کچھ باتوں نے مجھے اس شک میں ڈال دیا کہ یہ ہوسکتا ہے کہ اس نے شاہ مہتاب کو اگر خود قتل نہیں کیا تو کسی اور سے قتل کرا دیا ہے اور ہوسکتا اس نے کسی پیشہ ور عورت کو جال میں چارے کے طور پر استعمال کیا ہو۔

مجھے اس چھوٹی بیوی کی ایک اور بات یاد آئی ہے۔ اس نے کہا تھا کہ شاہ مہتاب کے

ساتھ اس کی شادی ہوگئی تو چند ماہ بعد اس کی بڑی بہن کا پہلا بچہ پیدا ہوا تھا اور خوشیاں منائی گئی تھیں۔ چھوٹی بیوی نے مجھے بتایا کہ یہ بچہ شاہ مہتاب کا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ سب کچھ جانتے اور دیکھتے ہوئے وہ اس لیے چپ رہی تھی کہ یہ بچہ نہ ہوتا تو اس کی بہن کو طلاق ہو جاتی۔

اس کے بعد میں نے مقتول کی پہلی بیوی کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا۔ باتیں تو چھوٹی بیوی بھی پُراعتماد اور پختہ لہجے میں کرتی تھی لیکن بڑی بیوی کا انداز زیادہ دوٹوک اور پختہ تھا۔ اس نے کچھ باتیں خود سنائیں اور میرے سوالات کے جواب دیئے تو میں نے دیکھا کہ اس کا یہ سارا بیان چھوٹی بیوی کی تائید کرتا تھا۔ اس کے دل میں چھوٹی بیوی کی ہمدردی تھی جس کا اس نے کئی بار اظہار کیا۔ اس نے کہا کہ وہ چھوٹی بیوی کو گلے نہ لگا لیتی تو یہ کبھی کی خودکشی کر چکی ہوتی یا بھاگ گئی ہوتی۔

بڑی بیوی نے اپنے بیان میں یہ بھی بتایا کہ رات کے وقت شاہ مہتاب کے پاس جرائم پیشہ افراد آیا کرتے تھے۔ شاہ مہتاب نے انہیں خاص طور پر اپنے خاص مرید بنا رکھا تھا۔ تین ساڑھے تین سال پہلے شاہ مہتاب نے ان جرائم پیشہ آدمیوں سے ایک گاؤں میں ایک ہندو ساہوکار کے گھر ڈاکہ ڈلوایا تھا اور مال اس حویلی میں آیا تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ اب وہ جرائم پیشہ آدمی شاہ مہتاب کے خاص مرید بنے ہوئے ہیں لیکن در پردہ ان کی کارستانیاں کچھ اور ہیں۔

میں نے اس سے ان دونوں کے نام پوچھے تو اس نے نام بتا دیئے۔ اگر کسی اور پیر کا ذکر ہو رہا ہوتا تو میں یہ سن کر حیران نہ ہوتا کہ اس نے جرائم پیشہ اشخاص اپنے ساتھ رکھے ہوئے تھے۔ یہ نہ اس دور میں کوئی نئی خبر تھی نہ آج یہ کوئی انوکھی بات ہے کہ ان پیروں نے درپردہ غنڈے اور جرائم پیشہ اشخاص اپنے پاس رکھے ہوئے ہیں اور ان کی وہ پرورش کرتے ہیں۔ ان سے وہ اپنے مخالفین کی سرکوبی بھی کرواتے ہیں اور بڑے سنگین جرائم کا ارتکاب بھی۔ حیرت ناک بات یہ تھی کہ جسے میں اپنا پیرومرشد سمجھتا تھا، اس نے بھی جرائم پیشہ اشخاص اپنے پاس رکھے ہوئے تھے۔ رکھے بھی ایسے پوشیدہ اور خفیہ طریقے سے کہ میں علاقے کا تھانے دار تھا جسے ہر خبر ہوتی تھی لیکن میں یہ نہ جان سکا کہ اس معاملے میں شاہ مہتاب دوسرے پیروں سے مختلف نہیں۔

''پھر قبلہ شاہ صاحب کو ایک اور آدمی مل گیا'' ـــ بڑی بیوی نے کہا ـــ ''وہ پنجابی ہے۔ بڑا ہی خوبرو اور تنومند جوان ہے۔ ایک سال پہلے آیا تھا اور دیکھتے ہی دیکھتے شاہ مہتاب کا منظورِ نظر بن گیا۔ میں نے اسے کئی بار رات کو شاہ مہتاب کے ذاتی کمرے میں راز و نیاز کی باتیں کرتے دیکھا ہے لیکن تین چار مہینے ہو گئے ہیں، یہ پنجابی نظر نہیں آیا۔ مجھے کسی ذریعے سے معلوم ہو گیا ہے کہ شاہ صاحب اور اس پنجابی میں ناراضگی ہو گئی ہے''۔

میں ایک اور دلچسپ بات بتاتا چلوں۔ صوبہ بہار میں اور دیگر ملحقہ صوبوں میں بھی لوگ پنجابی اور پٹھان سے ڈرا کرتے تھے۔ لوگوں کو یقین تھا کہ پنجابی اور پٹھان لڑاکے اور خون خرابہ کرنے والے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ پنجابی اور پٹھان اجڈ ہوتے ہیں جو صرف لڑنا اور مرنا جانتے ہیں۔ اس دور میں پنجابی اور پٹھان کا قد لمبا اور جسم گٹھا ہوا ہوتا تھا۔ اس کے مقابلے میں صوبہ بہار، اڑیسہ اور اس کے ساتھ کے صوبوں کے لوگوں کے قد چھوٹے اور جسم دبلے پتلے ہوتے تھے جو اب بھی ویسے ہی ہیں۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ ان صوبوں کے لوگ امن پسند تھے اور لڑائی جھگڑے سے گریز کرتے تھے۔ لوگوں نے کبھی پنجابی اور پٹھان دیکھا ہی نہیں تھا، سنا تھا۔ جنگِ عظیم کے دوران فوجوں کی نقل و حرکت زیادہ ہونے لگی تو ریل گاڑیوں میں وہاں کے لوگوں نے پنجابی اور پٹھان دیکھے اور ان سے ڈرنے لگے۔

میرے کانوں میں جب دو جرائم پیشہ اشخاص کے نام پڑے اور اس کے ساتھ یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک پنجابی بھی شاہ مہتاب کے پوشیدہ حلقے میں تھا تو مجھے خوشی سی ہوئی کہ اب میرا کام آسان ہو جائے گا۔ میرا کام اس طرح بھی آسان ہو گیا تھا کہ اس صدمے سے نکل آیا کہ میرا پیر و مرشد عام پیروں جیسا نکلا۔ میں نے اب اس حقیقت کو قبول کر لیا کہ شاہ مہتاب نہ پیر و مرشد تھا نہ عالم نہ ولی اللہ۔ وہ دوسرے پیروں جیسا ہی تھا۔

میں شاہ مہتاب کی حویلی کی تلاشی نہیں لینا چاہتا تھا کیونکہ میں نے ایسی ضرورت محسوس نہیں کی تھی لیکن بڑی بیوی نے کہا کہ شاہ مہتاب کے خاص کمرے کو ضرور دیکھوں۔ میں اس کمرے میں گیا اور رسمی طور پر تلاشی لی۔ ایک الماری مقفل تھی۔ چھوٹی بیوی نے تالے کی چابی ڈھونڈ نکالی اور تالہ کھول دیا۔

جب الماری کے کواڑ کھلے تو مجھے دھچکا سا لگا اور دو چار سیکنڈ کے لیے میں نے محسوس

کیا جیسے میں کسی قدیم بادشاہ کا خزانہ دیکھ رہا ہوں۔ نوٹوں کی گٹھیاں پڑی ہوئی تھیں۔ ایک روپے کے سکے والی تھیلیاں بھری رکھی تھیں اور زیورات کا تو کوئی حساب ہی نہیں تھا۔

اس خزانے کے ساتھ مجھے ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ یہ مال حرام کا تھا یا حلال کا، میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ میں اس گھر کے ایک آدمی کے قتل کی تفتیش کرنے آیا تھا۔ مجھے چوری یا ڈکیتی یا حرام خوری کا مال برآمد نہیں کرنا تھا، البتہ ایک چیز نظر آئی جو میں نے الماری سے نکال لی اور دو گواہ بلا کر اس چیز کی برآمدگی کا کاغذ تیار کر لیا۔ یہ ایک ریوالور تھا اور ایک ڈبے میں اس کی گولیاں بھی پڑی ہوئی تھیں۔ مجھے معلوم تھا کہ ریوالور بلا لائسنس ہے۔ تھانے کے ریکارڈ میں چند ایک شکاری بندوقیں لائسنس والی لکھی ہوئی تھیں۔ ریوالور کا اس میں ذکر نہیں تھا نہ ہی یہ کہ شاہ مہتاب کے پاس ریوالور کا لائسنس ہے۔

اتنے میں ہیڈ کانسٹیبل نقوش پا یعنی کھرے دیکھ کر واپس آ گیا۔ میں اسے الگ لے گیا۔

''عجیب کھرے ہیں'' ـــ ہیڈ کانسٹیبل نے کہا ـــ ''ایک پاؤں سیدھا ہے اور دوسرا ٹیڑھا۔ آگے سے پنجہ باہر کو نکلا ہوا ہے۔ آپ خود چل کر دیکھ لیں''۔

میں نے اسے کہا کہ پہلے وہ مجھے پوری رپورٹ دے پھر میں اس کے ساتھ چل کر دیکھوں گا۔ اس نے بتایا کہ یہ کھرا حویلی سے نکلا اور چند قدم آگے گیا۔ زمین کچی اور دھول والی تھی اس لئے کھرے بڑے ہی صاف اور واضح تھے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا کہ عورت چند قدم آگے گئی اور دوڑ پڑی۔ دایاں پاؤں تو ٹھیک پڑتا رہا لیکن بایاں پاؤں اس طرح پڑتا گیا جیسے کچھ کچھ گھسیٹا جا رہا ہو۔ عورت زیادہ دور نہیں گئی تھی کہ کتا اس کے پیچھے گیا۔ کتے کے پنجے صاف نظر آ رہے تھے۔

کتے نے جہاں لڑکی پر حملہ کیا تھا وہاں کتے کے پنجوں کے اور لڑکی کے پاؤں کے نشان گڈمڈ تھے اور پھر وہاں سے آگے لڑکی کے دوڑتے قدموں کے نشان تھے۔ لڑکی حویلی کے پچھواڑے چلی گئی۔ وہاں چھوٹی چھوٹی گھاس تھی جس پر کھرا صاف نہیں آ سکتا تھا۔ یہ گھاس حویلی کے پچھواڑے کی لمبائی میں تھی۔ بہرحال ہیڈ کانسٹیبل نے آگے جا کر یہ کھرا پھر ڈھونڈ لیا۔

کھرا کچھ آگے تک نظر آیا۔ اس سے آگے گاؤں آ جاتا تھا۔ لوگ شاہ مہتاب کے قتل کی خبر سن کر دوڑے آئے اور عورت کے کھرے مٹ گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل یقین کے ساتھ کہتا تھا کہ عورت گاؤں میں گئی ہے۔

وہ ایک گاؤں تھا کوئی بڑا شہر نہیں تھا جہاں ایک عورت گم ہو جاتی اور اسے تلاش نہ کیا جا سکتا۔ میں ہر گھر کی تلاشی لے کر اس عورت کو ڈھونڈ سکتا تھا لیکن اسے کورٹ میں مجرم ثابت کرنا کسی پہلو ممکن نہ تھا۔ صرف کھرے کوئی شہادت اور ثبوت نہیں ہوتے۔ یہ عورت کہہ سکتی تھی کہ وہ ادھر سے گزری تھی۔ مجھے ثبوت اور شہادت کی ضرورت تھی۔ میں نے اس کے مطابق فیصلہ کرنا تھا کہ اس ٹیڑھے پاؤں والی عورت کو پکڑا جائے یا نہیں۔

مجھے ان دو جرائم پیشہ اشخاص پر بھروسہ تھا۔ یہ اب میرے اپنے آدمی تھے۔ ان کا سرپرست قتل ہو گیا تھا۔ جرائم پیشہ لوگ اس پیشے سے باز نہیں آتے اس لیے یہ پولیس کے ساتھ ایسے تعلقات قائم کیے رکھتے ہیں جو دوستانہ بھی ہوتے ہیں معاندانہ بھی۔ میں نے چھوٹی چھوٹی کئی اور باتیں معلوم کر لی تھیں اور طوالت سے بچنے کے لیے اس کہانی میں شامل نہیں کیں۔ میں نے یہی فیصلہ بہتر سمجھا کہ باقی تفتیش تھانے میں چل کر کی جائے۔

میں نے ہندو نمبردار سے کہا کہ وہ گاؤں کے دو معزز ذمہ دار قسم کے آدمیوں کو ساتھ لے کر تھانے پہنچے۔ ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ ان دونوں جرائم پیشہ افراد کو تھانے لے آئے۔ ان دونوں کو سارا تھانہ جانتا تھا۔

پو پھٹ رہی تھی۔ میں وہاں سے واپسی سفر کو چل پڑا اور تھانے جانے کی بجائے گھر چلا گیا، غسل کیا ناشتہ کیا اور ذرا سا بھی ستانے کی بجائے پھر وردی چڑھالی اور تھانے جا پہنچا جہاں تین ہندو میرے منتظر بیٹھے تھے۔ ایک نمبردار اور دو گاؤں کے معززین۔

میں معززین کی جو اصطلاح لکھ رہا ہوں اس سے قارئین کو غلط فہمی میں نہیں رکھنا چاہتا، پولیس جنہیں معززین کہا کرتی ہے وہ ہوتے تو اونچی حیثیت والے ہیں لیکن معزز کسی پہلو نہیں ہوا کرتے۔ ان میں خاصے بڑے زمیندار بھی ہوتے ہیں۔ تھانے داروں اور سرکاری افسروں اور اسمبلیوں کے ممبروں کی خوشامد اور چاپلوسی کو اور پولیس کے ہاں جا کر مخبری کو اپنا دین اور ایمان سمجھتے ہیں۔ میرے پاس جو معززین آئے تھے یہ تو تھے ہی ہندو اس لیے میں انہیں سرکاری طور پر معززین کہتا ہوں، غیر سرکاری طور پر پست سطح کے افراد

تھے۔ کسی کو ہندو کہہ دینا ہی کافی ہوتا ہے۔ اس سے پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کس اخلاقی سطح اور ذہنیت کا آدمی ہے۔

میں ان تینوں سے یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ وہ مسلمانوں کے متعلق مخلصانہ بات کریں گے۔ ہندو تو ہوتا ہی متعصب ہے لیکن صوبہ بہار کا ہندو تو سرتاپا متعصب تھا۔

''میری ایک بات بڑی غور سے سن لیں'' ___ میں نے انہیں کہا ___ ''یہ مت سوچیں کہ مسلمانوں کا پیر قتل ہو گیا ہے اور آپ لوگوں نے اس کے خلاف یا مسلمانوں کے خلاف بات کی تو میں ناراض ہو جاؤں گا۔ یہ وہم دل سے نکال دیں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ جب اپنی چنڈال چوکڑیوں میں جا بیٹھیں گے تو اس مقتول پیر کے خلاف اور مسلمانوں کے خلاف باتیں کریں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ باتیں میرے ساتھ کریں۔ اگر پیر کو یا کسی بھی مسلمان کو اپنے گھر جا کر برا ثابت کرنا ہے تو وہ میرے سامنے کریں اور بتائیں کہ اس میں کیا خرابی ہے۔ آپ لوگ نہیں بتائیں گے تو میں قاتل کو کس طرح پکڑوں گا؟ کل یہی قاتل آپ میں سے بھی کسی کو قتل کر سکتا ہے''۔

تینوں نے غلامانہ انداز اور لہجے میں وعدہ کیا کہ وہ جو کچھ بھی جانتے ہیں صحیح بتائیں گے۔ میں نے انہیں پہلی بات یہ کہی کہ ان کے گاؤں میں کوئی عورت ایسی ہے جس کا بایاں پاؤں اس طرح ٹیڑھا ہو کہ پنجہ کچھ زیادہ ہی باہر کی طرف رہتا ہے۔ پھر میں نے اس کھرے کے مطابق جو حویلی کے باہر دیکھا تھا، اپنا بایاں پاؤں اس زاویے پر موڑا اور میں تین چار قدم چلا۔ یہ بھی کہا کہ اس عورت کا بایاں پاؤں اگر اتنے زیادہ زاویے پر مڑا ہوا ہے تو وہ سیدھی چل بھی نہیں سکتی ہو گی، اس کی چال میں اچھا خاصا نقص ہو گا۔ میں نے خود پاؤں اس طرح موڑ کر چند قدم اٹھائے تھے اور چلنے میں بہت سی دشواری محسوس کی تھی۔

تینوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

''حفیظے کی بیٹی کی چال دیکھی ہے؟'' ___ ایک ہندو نے پوچھا۔

''اس پنجابی کی بیوی؟'' ___ نمبردار نے پوچھا۔

''ہاں بھائی!'' ___ دوسرا ہندو بولا ___ ''وہ بائیں ٹانگ ذرا کھینچ کر چلتی ہے''۔

ان تینوں کی باتوں سے معلوم ہوا کہ اس عورت کے پاؤں میں یہ نقص ہے لیکن اس کی چال میں ایسا نمایاں فرق نہیں کہ دوسروں کو نظر آ جائے۔

میں نے جب ان کی زبان سے پنجابی کا لفظ سنا تو میں چونک پڑا۔ اس کے متعلق مقتول کی بڑی بیوی بتا چکی تھی۔ میرے ذہن میں یہ بات آ گئی کہ شاہ مہتاب کے ساتھ اس پنجابی کی راز و نیاز والی دوستی تھی پھر ان میں ناراضگی ہو گئی اور ان کے تعلقات منقطع ہو گئے تھے۔ اب معلوم ہوا کہ اس پنجابی کی بیوی کا بایاں پاؤں ٹیڑھا ہے تو خیال آیا کہ یہ ٹیڑھا پاؤں گزشتہ رات شاہ مہتاب کی حویلی تک کس طرح پہنچ گیا تھا۔ میں نے اب توجہ اس پنجابی پر مرکوز کر لی۔ ان تینوں سے میں نے پوچھا کہ یہ پنجابی کون ہے؟ یہ ظاہر نہ ہوتے دیا کہ اس کے متعلق میں پہلے میں کچھ جانتا ہوں۔

انہوں نے اتنا ہی بتایا کہ اس پنجابی کا نام صادق ہے اور کوئی ایک سال پہلے یہاں آیا تھا۔ کرائے کا ایک مکان لیا تھا۔ پھر یہ بتایا کہ گاؤں سے کچھ دور ایک ٹھیکے دار کا کام ہے۔ جس میں بہت سے مزدور لگائے گئے ہیں اور صادق ان مزدوروں کا میٹ ہے۔

پھر انہوں نے یہ بتایا کہ ٹیڑھے پاؤں والی لڑکی کا کوئی گھر رشتہ قبول نہیں کر رہا تھا۔ پاؤں یا ٹانگ کا نقص تو ایک بہانہ تھا، رشتہ لینے والے دیکھتے تھے کہ لڑکی والے غریب لوگ ہیں اور جہیز نہیں دے سکیں گے۔ کسی طرح صادق کو لڑکی کے ماں باپ کی مجبوری کا علم ہو گیا اور اس نے شاید شاہ مہتاب کے ذریعے اس لڑکی کے ساتھ شادی کر لی۔ لڑکی کے متعلق بتایا گیا کہ خاصی خوبصورت ہے۔

میں نے ان تینوں کو یہ کہہ کر فارغ کر دیا کہ یہ دیکھیں کہ لڑکی زخمی تو نہیں؟ میرے ذہن میں یہ بات تھی کہ کتے نے اس پر حملہ کیا تھا...... یہاں میں پھر کہوں گا کہ صادق اور اس لڑکی کو میں بڑے آرام سے تھانے بلوا سکتا تھا اور پھر میں خود اس کا پاؤں دیکھتا اور جسم دیکھتا کہ اس پر کتے کے دانتوں کے یا پنجوں کے نشانات ہیں یا نہیں لیکن میرے پاس ایسا کوئی ثبوت نہیں تھا کہ لڑکی رات حویلی میں گئی تھی اور باہر آتے وقت کتے نے اس پر حملہ کیا تھا۔ مقتول کی چھوٹی بیوی کا یہ کہہ دینا کافی نہیں تھا کہ اس نے دیکھا تھا کہ کتے نے ایک عورت پر حملہ کیا تھا۔ اس نے یہ تو کہا ہی نہیں تھا کہ کتے نے اس لڑکی پر حملہ کیا تھا۔ چھوٹی بیوی کا بیان اور کھرے میرے لیے فائدہ مند تھے کہ مجھے بڑے واضح اشارے اور سراغ مل گئے تھے لیکن یہ قانون کو مطمئن نہیں کر سکتے تھے۔

شاہ مہتاب کے دونوں جرائم پیشہ بالکے تھانے میں آ گئے تھے۔ ایک تو اسی گاؤں

راجن کا رہنے والا تھا اور دوسرا دوسرے تھانے کے ایک گاؤں میں رہتا تھا۔ دونوں گھروں میں ابھی سوئے ہوئے تھے کہ انہیں پکڑ لیا گیا اور تھانے لے آئے۔ میں نے دونوں کو اکٹھے ہی اپنے پاس بلا لیا تھا۔ تھانے کے ریکارڈ سے اور تھانے کے افراد سے میں نے دونوں کی ہسٹری معلوم کر لی تھی۔ ان میں ایک دو بار کا سزا یافتہ تھا اور دوسرے کو ایک ہی بار سزا ہوئی تھی اور مختلف جرائم ہی ان کا پیشہ تھا۔

"دونوں میرے سامنے بیٹھ جاؤ" ___ میں انہیں اپنے سامنے بٹھاتے ہوئے کہا ___ "تمہارا سرپرست اور پالن ہار قتل ہو گیا ہے۔ اب میرے سوا تمہارا کوئی سرپرست اور محافظ نہیں۔ میرے ساتھ ذرا سا بھی جھوٹ نہ بولنا۔ میں بہت کچھ معلوم کر چکا ہوں۔ جھوٹ بولو گے تو میں دونوں کو شاہ مہتاب کے قتل میں گرفتار کر لوں گا۔ تم اس حویلی کے گھر بھیدی ہو۔ تمام بھید میرے آگے رکھ دو"۔

دونوں جانتے تھے کہ سزا یافتہ ملزم معمولی سے جرم میں گرفتار ہو جائے تو اسے زیادہ سزا دی جاتی ہے اور یہی ثبوت اسے سزا دلانے کے لیے کافی ہوتا ہے کہ یہ سزا یافتہ ہے اور جرائم اس کا پیشہ ہے۔ دونوں نے حسب دستور ہاتھ جوڑ کر وعدہ کیا کہ وہ کچھ بھی نہیں چھپائیں گے۔ دونوں مسلمان تھے۔

میں نے ایک کو باہر بٹھا دیا اور دوسرے کا بیان لیا پھر اسے اٹھا کر دوسرے کو بلایا اور اس کا الگ بیان لیا۔ میں بات سے بات نکال کر سوال اور جرح بھی کرتا رہا جس سے دونوں کے بیانات بہت طویل ہو گئے۔ اس روداد میں جو میں قلمبند کر رہا ہوں، وہی تفصیلات شامل کر رہا ہوں جو ضروری ہیں۔ دونوں کے بیانات تقریباً ایک جیسے تھے۔

میں زیادہ توجہ صادق پنجابی اور اس کی بیوی پر مرکوز کر رہا تھا جس کا بایاں پاؤں ٹیڑھا تھا۔ میں نے دونوں سے پہلا سوال یہ کیا تھا کہ شاہ مہتاب کے ہاں اندر خانے کیا ہوتا تھا۔ ایک نے جواب دیا تھا کہ بدی کے سوا اور کیا ہونا تھا۔ دوسرے نے میرے اس سوال کے جواب میں کہا تھا کہ آپ تو ان پیروں کو ہم سے زیادہ جانتے ہیں۔ لوگ ہمیں مجرم کہتے ہیں لیکن شاہ مہتاب جیسے پیروں کے ہاں جو جرم ہوتے ہیں انہیں نہ کوئی دیکھتا ہے نہ پکڑتا ہے۔ اس دوسرے نے یہ بھی کہا تھا کہ یہ شاہ مہتاب شکار کا ذوق رکھتا تھا۔ اس کے پاس دونالی بندوق تھی جس سے پرندوں کا شکار کھیلتا تھا۔ اس کے پاس ایک کتا رکھوالی والا

اور بڑا ہی خونخوار تھا اور ایک اور کتا اس نے شکار کے لیے رکھا ہوا تھا۔ کبھی کبھی دونوں کتّے ساتھ لے جا کر چھوٹے بڑے جانوروں کا شکار کھیلتا تھا اور ایک شکار اور اسے زیادہ اچھا لگتا تھا۔ یہ تھا عورت کا شکار۔ مقتول خوبصورت اور نوجوان عورتوں کا شکاری تھا۔

صادق کے متعلق دونوں نے وہی بات بتائی جو وہ تینوں ہندو بتا گئے تھے۔ صادق ایک سال پہلے اس گاؤں میں آیا تھا۔ اس لڑکی کے ساتھ شادی کی بھی انہوں نے وہی بات بتائی جو مجھے پہلے معلوم ہو چکی تھی۔

صادق اور شاہ مہتاب کی دوستی کی تفصیل انہوں نے اس طرح بیان کی کہ صادق شاہ مہتاب کے سلام کے لیے پہلی بار آیا تو شاہ مہتاب نے اپنے دونوں جرائم پیشہ آدمیوں سے کہا کہ اسے صادق بہت اچھا لگا ہے اور اسے وہ ساتھ رکھنا چاہتا ہے۔ ان دونوں نے صادق کی دوستی شاہ مہتاب کے ساتھ کرا دی اور یہ دوستی بہت جلدی گہری ہو گئی اور پھر شاہ مہتاب اور صادق ہم راز بن گئے۔

شاہ مہتاب نے صادق کو اپنا باڈی گارڈ بنا لیا تھا۔ کہتا تھا کہ دوسرے پیر کے ساتھ اس کی دشمنی ہے، وہ پیر کسی بھی دن اوچھا وار کر سکتا ہے۔ شاہ مہتاب بندوق سے یا کتوں سے جب بھی شکار کھیلنے جاتا تھا، صادق اس روز اپنی ڈیوٹی پر نہیں جاتا تھا اور شاہ مہتاب کے ساتھ شکار پر چلا جاتا تھا۔ صادق کے پاس پیر کا بھرا ہوا ریوالور ہوتا تھا۔ صادق کبھی کبھی رات کو بھی پیر کے خاص کمرے میں اس کے ساتھ رہتا تھا۔

راجن کا رہنے والا حفیظ نام کا ایک آدمی دو تین مرتبہ اپنی ایک نوجوان بیٹی کو شاہ مہتاب کے پاس لایا تھا اور عرض کی کہ قریبی رشتہ دار بھی اس کی بیٹی کا رشتہ قبول نہیں کرتے جس کی ایک وجہ یہ بتاتے ہیں کہ لڑکی کی ایک ٹانگ میں نقص ہے لیکن اصل نقص یہ ہے کہ یہاں باپ بیٹی کو منہ مانگا جہیز نہیں دے سکتے۔ شاہ مہتاب انہیں تعویذ دیتا رہا اور ایک دن صادق نے لڑکی کے باپ کو شاہ مہتاب کے آگے سجدہ کرتے اور روتے دیکھا۔

صادق لڑکی کے باپ سے ملا اور کہا کہ وہ لڑکی کو تین کپڑوں میں ہی قبول کر لے گا، نہ اسے جہیز کی ضرورت ہے نہ وہ زیور بنائیں پھر صادق نے شاہ مہتاب سے کہا کہ وہ لڑکی کو انہی کپڑوں میں جو اس نے پہنے ہوئے ہیں اور اس نقص کے ساتھ قبول کرنے کو تیار ہے۔

شاہ مہتاب نے لڑکی کے باپ کو بلایا اور اسے کہا کہ اس کے تعویذ اثر کر گئے ہیں اور

اس کا مسئلہ حل ہو گیا ہے۔ شاہ مہتاب نے یہ بھی کہا کہ اسے خدائی اشارہ ملا ہے کہ صادق کو خدا نے اسی لڑکی کی خاطر اس گاؤں میں بھیجا ہے۔ لڑکی کے باپ نے تو شاہ مہتاب کے قدموں میں سر رکھ دیا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ شاہ مہتاب ہی نکاح پڑھا دے۔ اس طرح صادق اور اس لڑکی کی شادی ہو گئی۔ نکاح شاہ مہتاب نے پڑھا تھا۔ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے ان دونوں نے بتایا کہ لڑکی کا بایاں پاؤں باہر کی طرف ٹیڑھا ہے اور وہ ٹانگ کو ذرا سا گھسیٹ کر چلتی ہے لیکن آہستہ چلے تو اس کا یہ نقص کسی کو نظر نہیں آتا۔

ان دونوں جرائم پیشہ افراد نے بتایا کہ پیر ان پر ہر طرح مہربان تھا اور انہوں نے پیر کے لیے کچھ جرم بھی کیے تھے۔ دوسرا پیر واقعی اس کا دشمن تھا اور یہ دشمنی پیری مریدی پر تھی۔ ان دونوں جرائم پیشہ آدمیوں نے دو تین نامی گرامی غنڈے ساتھ لے کر دوسرے پیر کے غنڈوں کو ایسا مرعوب کیا تھا کہ انہوں نے اپنے پیر سے کہہ دیا تھا کہ وہ شاہ مہتاب کی مخالفت ترک کر دے۔ شاہ مہتاب کے اتنے زیادہ کام کر کے بھی انہوں نے دیکھا کہ وہ صادق پر بہت ہی زیادہ مہربان ہو گیا تھا اور اسی کے مشوروں پر عمل کرتا اور صادق اس کا ہر جائز اور ناجائز حکم مانتا تھا۔ ان دونوں کی صادق کے ساتھ بڑی گہری دوستی تھی۔ وہ تو ہونی ہی تھی کیونکہ یہ سب ایک گروہ کے افراد تھے۔

میں نے ان سے پوچھا کہ صادق اور شاہ مہتاب میں ایسی ناراضگی کیا پیدا ہو گئی تھی کہ ان کا اتنا گہرا تعلق منقطع ہو گیا؟

دونوں نے وجہ بتا کر مجھے چونکا دیا۔ انہوں نے بتایا کہ شاہ مہتاب کی چھوٹی بیوی نے صادق کے ساتھ ناجائز دوستی کر لی تھی۔ ان دونوں کو یہاں تک معلوم تھا کہ شاہ مہتاب اور صادق کے تعلقات ٹوٹ پھوٹ گئے تو بھی چھوٹی بیوی اور صادق کی دوستی چلتی رہی تھی۔ شاہ مہتاب خود عیاش اور بدکار تھا وہ اتنا ہی چاہتا تھا کہ اس کی بیویاں اسے نہ روکیں اور اس سے باز پُرس نہ کریں۔ اس سے زیادہ اس نے بیویوں پر اور جوان بیٹوں پر کوئی پابندی عائد نہیں کی تھی۔ انہیں روپیہ پیسہ دیتا رہتا تھا اور وہ جہاں جانا چاہتیں، اس کی اجازت کے بغیر چلی جاتی تھیں اور شاہ مہتاب اس پر اعتراض نہیں کرتا تھا۔ اس آزادی سے اس کی چھوٹی بیوی نے یہ استفادہ حاصل کیا کہ صادق کو اپنی تسکین کا ذریعہ بنا لیا۔

ان دونوں جرائم پیشہ آدمیوں نے صادق اور شاہ مہتاب کی ناراضگی کی یہی وجہ بتائی

کہ شاہ مہتاب کو اپنی چھوٹی بیوی کی اس ناجائز دوستی کا بھید مل گیا تھا لیکن انہیں یقین نہیں تھا کہ یہی وجہ تھی۔ نہ کبھی شاہ مہتاب نہ کبھی صادق نے ان دونوں کو بتایا تھا کہ صادق اور چھوٹی بیوی اسے دھوکہ دے رہے ہیں۔ صادق ان دونوں کے ساتھ اتنا بے تکلف تھا کہ ایسی بات ہوتی تو وہ انہیں ضرور بتا دیتا۔ وہ تو انہیں یہ بتاتا رہا کہ چھوٹی بیوی کے ساتھ اس کی پوشیدہ دوستی پہلے کی طرح چل رہی ہے۔

میں اس مسئلے پر زیادہ توجہ مرکوز کرنے لگا۔ آپ جانتے ہیں کہ قتل کی اکثر وارداتوں کا باعث ناجائز تعلقات ہوتے ہیں۔ مجھے یہ شبہ ہوا کہ شاہ مہتاب نے صادق اور اپنی چھوٹی بیوی کو کہیں اکٹھے دیکھ لیا ہوگا اور انہیں کوئی دھمکی دی ہوگی لیکن یہ دونوں زیادہ تیز نکلے اور چھوٹی بیوی نے ایک رات شاہ مہتاب کا گلا گھونٹ دیا لیکن پھر ذہن میں صادق کی بیوی کے کھرے آجاتے تھے جو حویلی کے دروازے سے شروع ہوتے تھے۔ یہ کھرے میرے ذہن کو الجھا رہے تھے۔

پھر انہوں نے ایک اور انکشاف کیا۔ اس انکشاف نے بھی مجھے دھچکا دیا لیکن اطمینان بھی ہوا کہ میری تفتیش صحیح راستے پر جا رہی ہے اور میں قاتل تک جلدی پہنچ جاؤں گا۔ انکشاف یہ تھا کہ تین چار دن پہلے صادق ان دونوں کے پاس اس ذہنی کیفیت میں آیا کہ بہت ہی پریشان تھا اور غصے کا یہ عالم کہ اس کے ہونٹ بھی اور ہاتھ بھی رعشہ گیر تھے۔ اس نے اپنے ان جرائم پیشہ دوستوں کو بتایا کہ اس کی بیوی لاپتہ ہوگئی ہے اور اسے شاہ مہتاب نے ہی لاپتہ کرایا ہوگا۔ وہ کہتا تھا کہ اس بدکار شاہ سے کہو کہ میری بیوی واپس کر دے ورنہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔

ان دونوں نے شاہ مہتاب کو بتایا کہ صادق کیا کہہ گیا ہے۔ شاہ مہتاب نے قسمیں کھا کر کہا کہ وہ ایسی گھٹیا حرکت کرنے والا آدمی نہیں۔ اگلے دو روز صادق ان دونوں کو ملتا رہا۔ اب تو اس کی ذہنی حالت پاگلوں جیسی ہوگئی تھی۔ ان دونوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ صادق خود بھی شاہ مہتاب سے ملا تھا یا نہیں حالانکہ ان دونوں نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ شاہ مہتاب سے ملے اور اس کی بھی سن لے۔

پھر انہوں نے یہ خبر سنی کہ رات شاہ مہتاب قتل ہوگیا ہے۔

میں نے ان سے ابھی کچھ اور راز اور سراغ لینے تھے لیکن نمبردار بھاگتا دوڑتا آیا اور

مجھے باہر بلا کر یہ خبر سنائی کہ صادق کی بیوی بازو پر مرہم پٹی کرا کر آئی ہے اور اس وقت صادق بھی اس کے ساتھ گھر میں موجود ہے۔ میں نے نمبردار سے پوچھا کہ مرہم پٹی کہاں سے کرا کے آئی ہے؟ وہاں تو کوئی ہسپتال یا کسی ڈاکٹر یا ڈسپنسر کا کلینک تھا ہی نہیں۔ اس نے بتایا کہ اڑھائی تین میل دور جہاں کوئی سرکاری ٹھیکہ چل رہا ہے اور جہاں صادق مزدوروں کا میٹ ہے، وہاں سے پٹی کروائی ہے۔ میں جان گیا کہ جہاں اتنے زیادہ راج مزدور کام کر رہے تھے وہاں فسٹ ایڈ کا انتظام ہوگا۔ نمبردار یہ بھی معلوم کر آیا تھا کہ علی الصبح صادق کسی کی گھوڑی لایا تھا اور اس پر بٹھا کر بیوی کو ساتھ لے گیا تھا۔ دونوں اب واپس آئے تھے۔

میرے پاس اب کافی شہادتیں اکٹھی ہوگئی تھیں۔ اب میں ٹیڑھے پاؤں والی لڑکی کو پکڑ سکتا تھا۔ جواز بڑا مضبوط تھا۔ میں عملے کے چند ایک افراد کو ساتھ لے کر نمبردار کے ساتھ فوراً اس گاؤں کو روانہ ہوگیا۔ شاہ مہتاب کے دونوں جرائم پیشہ آدمیوں کو میں نے جانے کی اجازت نہ دی۔ اے ایس آئی سے یہ کہہ کر روانہ ہوا کہ ان دونوں کو تھانے میں پابند رکھے اور تھانے کے احاطے سے باہر ایک منٹ کے لئے بھی نہ جانے دے۔

میں راجن گاؤں میں داخل ہوا اور نمبردار مجھے صادق کے گھر تک لے گیا۔ دروازہ کھلا تھا لیکن میں نے پولیس والی بدتمیزی نہ کی، دروازے پر دستک دی تو ایک بڑا ہی خوب رو، دراز قد اور تنومند جسم والا جوان باہر آیا۔ بخدا میں اس کا سراپا دیکھ کر ہی اس سے متاثر ہوگیا۔ میرے متعلق وہ جانتا تھا کہ میں مسلمان ہوں۔ اس نے ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے بڑے تپاک سے مصافحہ کیا اور کہا کہ میں ذرا اندر آنا چاہتا ہوں۔ اس نے بڑے احترام سے کہا، آئیے، پوچھنے کی کیا ضرورت ہے!

اپنی پارٹی کو میں نے باہر کھڑا رہنے کو کہا اور صادق کے ساتھ ایک کمرے میں چلا گیا۔ اس کی بیوی اس کمرے میں نہیں تھی۔ میں نے کہا کہ میں اس کی بیوی کو دیکھنے آیا ہوں۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے ایسے پُرکشش چہرے پر تذبذب کا تاثر آگیا ہے۔ وہ چپ ہوگیا، اتنا بھی نہ پوچھا کہ میں اس کی بیوی کو کیوں دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے ایک بار پھر کہنا پڑا کہ اپنی بیوی کو میرے سامنے لے آئے۔

''وہ ابھی آپ کے سامنے آجاتی ہے'' ـــــ صادق نے کہا ـــــ ''میری ایک عرض پر

ضرور غور کریں۔ میں بیوی کو پیش کر دیتا ہوں لیکن میری بھی پوری بات ضرور سننا''۔

''ہم مسلمان بھائی ہیں صادق!''۔۔۔ میں نے دوستانہ لہجے میں کہا جو دراصل مصنوعی لہجہ تھا۔ مجھے ملزم مطلوب تھا۔ میں نے کہا۔۔۔ ''میں اس بے دین پیر کو بھی جانتا تھا جس کے قتل کی تفتیش کر رہا ہوں۔ اس کی اصلیت سے میں آگاہ ہوں۔ میں اپنی ڈیوٹی پوری کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ تعاون کرو گے تو میں اتنا زیادہ فائدہ پہنچاؤں گا جو تمہیں حیران کر دے گا''۔

اس طرح میں نے اسے یہ تاثر دیا کہ میں بڑا ہی شریف تھانے دار ہوں اور مسلمانوں کا بہت ہی خیال رکھتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ صادق کو یقین ہو گیا تھا کہ وہ پکڑا گیا ہے اور اب پولیس کے جال سے نکل نہیں سکے گا۔

اس کمرے کے ساتھ ایک اور کمرہ تھا جسے کوٹھڑی کہہ لیں۔ صادق نے اس طرف دیکھتے ہوئے آواز دی۔۔۔ ''نازو، باہر آ جاؤ''۔

فوراً بعد کوٹھڑی کے دروازے میں ایک لڑکی نمودار ہوئی جو بلاشک و شبہ خوبصورت تھی۔ وہ دروازے میں ہی رک گئی اور اس کی نظریں میرے چہرے پر جم کر رہ گئیں۔ یوں نظر آنے لگا جیسے اس کی آنکھیں پتھرا گئی ہوں۔ اس کے چہرے کا رنگ لاش کی طرح ہو گیا۔ اس کی یہ حالت اپنے سامنے بیٹھے ہوئے باوردی تھانے دار کو دیکھ کر ہوئی تھی۔

''آ جاؤ نازو!''۔۔۔ میں نے پیار سے کہا۔۔۔ ''ڈر کیوں گئی ہو؟ ڈرنے گھبرانے کی کوئی بات ہی نہیں...... آ جاؤ''۔

صادق نے بھی اسے آگے آنے کو کہا اور اس کی حوصلہ افزائی کی۔ تب اس نے کوٹھڑی کی دہلیز پھلانگی اور آہستہ آہستہ ہماری طرف چلی۔ میں نے اس کا بایاں پاؤں دیکھا جو پنجے کی طرف سے باہر کو مڑا ہوا تھا۔ اس کی چال دیکھی جس پر ٹیڑھے پاؤں کا اثر صاف نظر آ رہا تھا۔

اس نے لمبی آستینوں والی قمیض پہن رکھی تھی۔ میں نے اسے اپنے قریب آنے کو کہا اور جب وہ میرے قریب آ گئی تو میں نے اپنے ہاتھوں اس کے دائیں بازو کی آستین اوپر کی۔ اس نے آستین اوپر ہونے سے پہلے اپنا بازو میرے ہاتھ سے چھڑانے کی ہلکی سی کوشش کی تھی۔ اس بازو پر کہنی سے ذرا نیچے نئی پٹی بندھی ہوئی تھی۔

میں نے اسے گھما کر اس کی پیٹھ اپنی طرف کر لی۔ وہ گھوم کر پھر سیدھی ہو گئی۔ میں نے صادق سے کہا کہ اسے کہے کہ میں اس کی پیٹھ سے قمیض ہٹا کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر اس نے مزاحمت کی تو پھر میں اسے تھانے لے جاؤں گا۔ صادق نے اٹھ کر اپنے ہاتھ سے پیچھے سے اس کی قمیض اٹھا دی۔ میں نے دیکھا کہ اس کے دائیں شولڈر بلیڈ سے لے کر کچھ نیچے تک گہری خراشیں تھیں جو یقیناً کتے کے پنجوں سے آئی تھیں۔ ان پر پٹی نہیں باندھی گئی تھی۔ ان پر ٹنکچر نبرول لگا ہوا تھا۔ یہ زخم نہیں تھے، خراشیں تھیں جن سے کوئی زیادہ خون نہیں نکل رہا تھا۔

''قمیض نیچے کر دو''۔۔۔ میں نے کہا اور پوچھا۔۔۔ ''یہ زخم کیسے ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟''

''رات اس پر ایک کتے نے حملہ کیا تھا''۔۔۔ صادق نے کہا۔۔۔ ''یہ پٹی ٹھیکیدار کی فسٹ ایڈ کی ڈسپنسری سے کروائی ہے''۔

لڑکی سے میں نے کہا وہ کوٹھڑی میں چلی جائے اور صادق کو میں باہر صحن میں لے گیا اور وہاں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر بٹھا لیا۔

''صادق!''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''سارا واقعہ خود ہی سنا دو۔ میرے پاس پوری شہادت موجود ہے۔ تمہاری بیوی کے قدموں کے نشان شاہ مہتاب کی حویلی کے دروازے سے چلے اور یہاں تک آئے ہیں۔ اپنی بیوی کے پاؤں دیکھ لو۔ اس کے نشان تو چھپائے ہی نہیں جا سکتے۔ ایک پاؤں سیدھا اور دوسرا ٹیڑھا زمین پر لگتا ہے۔ میرے پاس تمہاری بیوی کی ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے ٹکڑے موجود ہیں۔ میں نے تمہارے بیوی کے بازوؤں میں بچی ہوئی چوڑیاں دیکھ لی ہیں۔ یہ سب ایک ہی رنگ اور ایک ہی ڈیزائن کی ہیں۔ تمہاری بیوی کا دوپٹہ میرے قبضے میں ہے۔ ایک عورت موجود ہے جس نے تمہاری بیوی کو حویلی میں سے بھاگتے اور پھر مہتاب شاہ کے کتے کو اس پر حملہ کرتے دیکھا تھا۔ میں نے تمہاری سامنے تمہاری بیوی کی دائیں آستین اوپر کی تھی پھر پیٹھ ننگی کر کے دیکھی۔ کیا تم سمجھے نہیں کہ مجھے پہلے ہی معلوم تھا کہ تمہاری بیوی کو کتے نے کہاں کاٹا اور کہاں پنجے مارے ہیں؟ کہو تو میں تمہیں تفصیل سے سنا دوں کہ یہ واردات کس طرح ہوئی ہے۔ تم اپنی زبان سے سنا دو گے تو میرے لیے یہ سہولت پیدا ہو جائے گی کہ تمہیں اور تمہاری بیوی کو بچا سکوں

گا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ شاہ مہتاب کی چھوٹی بیوی کے ساتھ تمہارے ناجائز تعلقات ہیں لیکن اس کے ساتھ مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں تمہیں صرف یہ بتا دیتا ہوں کہ تم پر اور تمہاری بیوی پر کوئی پردہ نہیں رہا...... بولو صادق، زیادہ مت سوچو"۔

اس نے سر جھکا لیا جیسے کسی گہری سوچ میں گم ہو گیا ہو۔

"تمہاری بیوی لاپتہ ہو گئی تھی" ــــ میں نے کہا اور پوچھا ــــ "واپس کب آئی ہے؟ گئی کہاں تھی؟"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ اب اس کے چہرے پر جو تاثر آ گیا تھا، اس سے مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اصل بات اگلنے پر آ گیا ہے۔ مجھے اتنا تجربہ حاصل ہو چکا تھا کہ اس ذہنی حالت میں ملزم کو اقبالی بیان کے لیے کس طرح تیار کیا جاتا ہے۔ میں نے نرمی اور ہمدردی کا رویہ جاری رکھا اور آخر وہ بولنے پر آ گیا۔

اس کا بیان غیر معمولی طور پر طویل تھا۔ اس نے اپنی ہسٹری بھی سنانی شروع کر دی تھی کہ وہ اپنے وطن سے اتنی دور کس طرح آن پہنچا تھا۔ میں اس کے بیان کے دو حصے اپنی زبان میں بیان کر رہا ہوں جو آپ کی دلچسپی کے ہوں گے اور جن سے یہ تفتیشی کہانی بھی ادھوری نہیں رہے گی...... اس نے سنایا کہ تین چار روز پہلے اس کی بیوی علی الصبح باہر نکلی۔ وہ دوسرے دیہاتیوں کی طرح کھیتوں میں رفع حاجت کے لیے جایا کرتی تھی۔ اس صبح وہ گئی اور پھر واپس نہ آئی۔ صادق نے بہت انتظار کیا اور اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ اس کے والدین کے گھر گیا۔ وہ وہاں بھی نہیں تھی۔

یہ تفصیل سنانے کی چنداں ضرورت نہیں کہ صادق اسے کہاں کہاں ڈھونڈتا رہا۔ اسے پکا شبہ تھا کہ شاہ مہتاب نے اس کی بیوی کو اغوا کرایا ہے۔ اس کی وجہ اس نے یہ بتائی کہ کچھ عرصہ پہلے ایک روز شاہ مہتاب کے پاس اس کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جس کمرے میں وہ لوگوں سے ملا کرتا تھا۔

ایک باپ اپنی بھولی بھالی سی بیٹی کو ساتھ لایا اور شاہ مہتاب سے یہ عرض کی کہ اس کی بیٹی کا رشتہ کوئی بھی قبول نہیں کرتا۔ شاہ مہتاب نے اسے تعویذ دیئے اور لڑکی کی آنکھوں میں کچھ پڑھ کر پھونکیں بھی ماریں۔ صادق اس وقت تک جان گیا تھا کہ اس پیر کے پاس پلے کچھ بھی نہیں اور یہ سراپا فریب اور دھوکہ ہے۔ لڑکی اپنے باپ کے ساتھ دو تین مرتبہ پھر

آئی۔ لڑکی کے باپ نے کہا تھا کہ اس کے پاس لڑکی کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں اور رشتہ لینے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ لڑکی میں جسمانی نقص ہے۔

صادق نے اپنے بیان میں کہا کہ اسے معلوم تھا کہ کسی دن شاہ مہتاب لڑکی کو اپنے الگ کمرے میں لے جائے گا اور اسے ہوس کاری کا نشانہ بنائے گا۔ صادق لڑکی کے باپ سے ملا اور جس طرح میں نے پہلے سنایا ہے، اس نے لڑکی کے رشتے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور شاہ مہتاب سے کہہ کر لڑکی سے نکاح پڑھوا لیا۔

صادق نے ایک ایسی بات بتائی جو کسی بھی تہذیب یافتہ انسان کا ذہن قبول نہیں کر سکتا لیکن یہاں بات جرائم اور جعلی پیروں کی دنیا کی ہو رہی ہے جہاں اخلاقیات کے پیمانے کچھ اور ہوتے ہیں۔ صادق نے بتایا کہ شادی کے کچھ عرصہ بعد شاہ مہتاب نے صادق سے یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ اپنی بیوی کو کبھی کبھار اس کے پاس بھیج دیا کرے۔ شاہ مہتاب نے یہ فرمائش بڑے اچھے الفاظ میں کی تھی لیکن صادق اس کا مطلب سمجھتا تھا۔ پہلے پہل صادق اسے ٹالتا رہا۔ پھر شاہ مہتاب نے اسے واضح الفاظ میں کہا کہ یہ لڑکی اس کے دل میں اتر گئی تھی اور اسے وہ ایک دو راتیں اپنے پاس رکھنا چاہتا تھا لیکن صادق کی اس کے ساتھ شادی ہو گئی۔ اب شاہ مہتاب کہتا تھا کہ صرف ایک بار صادق اپنی بیوی کو اس کے پاس بھیج دے۔

اگر صادق جرائم پیشہ ہوتا اور وہ شاہ مہتاب کی دنیا ہی کا آدمی ہوتا تو شاید وہ اس کی یہ فرمائش پوری کر دیتا لیکن صادق کسی اور دنیا کا اور ایک غیرت مند خاندان کا آدمی تھا۔ یہ میں آپ کو آگے چل کر بتاؤں گا کہ وہ آیا کہاں سے تھا اور اس کی اصلیت کیا تھا۔

اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ شاہ مہتاب پاور والا پیر تھا۔ یہ پاور روحانی نہیں، نوسربازی اور غنڈہ گردی کی تھی۔ اس نے جب واضح الفاظ میں یہ فرمائش صادق کے آگے رکھی تو صادق کا خون کھول اٹھا۔ اس نے شاہ مہتاب سے کہا کہ ان کی بڑی گہری دوستی اور رازداری رہی ہے اس لیے وہ شاہ مہتاب کو معاف کرتا ہے، لیکن آج سے دوستی یاری اور ہر طرح کا تعلق ختم سمجھے۔ یہاں سے ان کی ناراضگی شروع ہو گئی۔ شاہ مہتاب نے صادق کو دھمکی دی کہ اپنی بیوی کو اپنے پردوں کے نیچے چھپا کر رکھنا ورنہ میں اسے اُڑا دوں گا۔

صادق نے بلا جھجک اعتراف کیا کہ اس نے شاہ مہتاب کی چھوٹی بیوی کے ساتھ

ناجائز مراسم قائم کر رکھے تھے اور اس میں پہل چھوٹی بیوی نے کی تھی۔ وہ بڑی دلیری سے صادق سے ملتی ملاتی تھی۔ یہ جواں سال خوبصورت عورت صادق پر ایسی بُری طرح فریفتہ ہوئی تھی کہ اس نے صادق سے کہا تھا کہ تم شادی نہ کر چکے ہوتے تو میں اس خاوند کو قتل کر کے تمہارے پاس آجاتی۔

صادق کو صرف یہ خطرہ نظر آرہا تھا کہ وہ ایک ٹھیکیدار کے مزدوروں کا میٹ تھا۔ یہ نوکری اسے شاہ مہتاب کی سفارش سے ملی تھی۔ ٹھیکیدار تو ہندو تھا، نوکری دینے والا منیجر مسلمان تھا جو شاہ مہتاب کا مرید تھا۔ صادق کو معلوم نہیں تھا کہ شاہ مہتاب نے منیجر کو ایسی بات کہی تھی یا نہیں کہ صادق کو نوکری سے ہٹا دے۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ منیجر نے کبھی اسے ایسا نہ کہا کہ اس نے پیر صاحب کے کسی حکم کی خلاف ورزی کی ہے اور وہ پیر کو جا کر راضی کرے۔

صادق کی ایک کمزوری اور تھی جو اس کے لیے کسی بھی وقت خطرہ بن سکتی تھی۔ یہ اس نے کسی کو بھی نہیں بتایا تھا کہ وہ پنجاب کا رہنے والا ہے اور یہاں تن تنہا کیا کر رہا ہے۔ اس نے اپنی اصلیت مجھ پر ظاہر کر دی جو یہ تھی کہ وہ بھگوڑا فوجی تھا۔ میں آپ کو اس کا بھی تھوڑا سا پس منظر بتا دیتا ہوں۔

جنگ عظیم کے دوران وہ لوگ بھی فوج میں بھرتی ہو گئے تھے جنہوں نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ بھرتی کے دروازے ہر کس و ناکس کے لیے کھول دیئے گئے تھے۔ تھوڑی سی ٹریننگ دے کر انہیں مختلف محاذوں پر بھیج دیا جاتا تھا۔ وہاں جب وہ توپوں کے دھماکے اور چھوٹے ہتھیاروں کے فائر کی لرزہ خیز آوازیں سنتے اور اپنے ساتھیوں کو زخمی ہوتے اور مرتے دیکھتے تو اس وقت کو کوستے تھے جب وہ بھرتی ہوئے تھے۔ بعض فوجی محاذ سے بھاگ جاتے تھے۔

فوجی ہیڈ کوارٹر سے ان کے گھروں کے تھانوں میں رپورٹ جاتی تھی کہ فلاں ولد فلاں وغیرہ وغیرہ بھگوڑا ہو گیا ہے، اسے گرفتار کر کے فلاں چھاؤنی میں پہنچا دیا جائے۔ بھگوڑے چھپتے پھرتے تھے۔ یہاں سے رشوت کا ایک سلسلہ چل پڑا۔ علاقہ تھانیدار بھگوڑے فوجی سے ماہوار وظیفہ وصول کرتا رہتا اور اسے گرفتار نہیں کرتا تھا۔ بعض پکڑے بھی جاتے تھے۔ ان کا کورٹ مارشل ہوتا اور لڑائی سے بھاگنے کے جرم میں دو سال سے

سات آٹھ سال تک سزائے قید دی جاتی تھی۔ عموماً بھگوڑے روپوش رہتے تھے۔

صادق برما فرنٹ سے بھاگا تھا اور وہ اپنے گھر جانے کی بجائے صوبہ بہار میں گھومتا پھرتا رہا اور محنت مزدوری کر کے روٹی کھاتا رہا۔ وہ فوج میں بھرتی نہیں ہونا چاہتا تھا لیکن پوٹھوہار کے علاقے کا رہنے والا تھا جہاں خاندانی دشمنیوں پر قتل اور خون خرابے ہوتے رہتے تھے۔ صادق نے ایسی ہی ایک خاندانی لڑائی میں ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا اور گرفتاری سے بچنے کے لیے فوج میں بھرتی ہو گیا اور ٹریننگ لے کر اپنی رجمنٹ کے ساتھ چلا گیا۔ ان دنوں برما فرنٹ بڑا ہی خونریز محاذ تھا۔ صادق طبعاً فوجی نہیں تھا۔ وہ بھگوڑا ہو گیا۔

روزی اور قسمت کا چکر اسے صوبہ بہار کے اس علاقے میں لے گیا۔ جنگ برما تک پہنچ گئی تھی اور فاتح جاپانی فوجیں اب کسی بھی وقت پیش قدمی کر کے آسام اور بنگال پر حملہ آور ہو سکتی تھیں۔ انگریزوں نے تھوڑے تھوڑے فاصلے پر موزوں جگہوں پر ملٹری پوسٹیں تعمیر کرنی شروع کر دی تھیں جن میں اکثر پوسٹیں سگنل والوں کی تھیں۔ ایسے ہی کچھ اور دفاعی منصوبے تھے جو ٹھیکیداروں کو تعمیر کے لئے دیئے جاتے تھے۔ صادق کی رسائی ایسے ہی ایک ٹھیکیدار تک ہو گئی اور جس طرح اسے ملازمت ملی وہ میں پہلے بتا چکا ہوں۔

صادق کو یہی خطرہ نظر آرہا تھا کہ وہ کہیں پکڑا گیا اور یہ معلوم ہو گیا کہ بھگوڑا فوجی ہے تو اسے کورٹ مارشل کے ذریعے بڑی لمبی سزا ملے گی۔

میں نے اس کے ساتھ پختہ وعدہ کیا کہ اس کی یہ اصلیت بے نقاب نہیں ہونے دوں گا۔ اس وقت میرا مسئلہ صرف یہ تھا کہ شاہ مہتاب کے قاتل کو پکڑ لوں۔ صادق نے پوری دیانتداری سے بیان دینا شروع کر دیا تھا۔

میں سنا رہا تھا کہ صادق کی بیوی لاپتہ ہو گئی اور وہ اسے ڈھونڈتا پھرتا رہا۔ اسے یقین تھا کہ شاہ مہتاب نے اس کی بیوی کو اغوا کرایا ہے۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ شاہ مہتاب کو کہیں بھی پکڑ کر قتل کی دھمکی دے گا اور اپنی بیوی اس سے آزاد کرائے گا۔ اس نے شاہ مہتاب کو اس کے جرائم پیشہ آدمیوں کے ذریعے یہ دھمکی پہنچا دی تھی۔

اس نے اپنے بیان میں کہا کہ گذشتہ رات اس کے دروازے پر بڑی زور کی دستک ہوئی تو پہلے وہ گھبرایا کہ یہ پولیس ہوگی جو اسے گرفتار کرنے آئی ہے۔ کسی طرح پولیس کو پتہ چل گیا ہوگا کہ یہ شخص بھگوڑا فوجی ہے۔ اس خطرے کے پیش نظر اس نے کسی طرف سے

مکان سے نکل کر بھاگنے کی سوچ لی لیکن اسے اپنی بیوی کی آواز سنائی دی جو اسے پکار رہی تھی۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ صادق نے دوڑ کر دروازہ کھولا اور اپنی بیوی کو دیکھا۔ بیوی تو خوف کے مارے اس کے گلے لگ گئی۔ وہ ہانپتی کانپتی اور روتی تھی۔ وہ اس قدر خوفزدہ تھی کہ صادق سے کہنے لگی کہ فوراً اندر گھس کر مجھے چھپا لو۔

صادق اسے اندر لے گیا اور لالٹین جلا کر دیکھا۔ اس کی بیوی کے کپڑے خون سے لال تھے اور پیچھے سے اس کی قمیض پھٹی ہوئی تھی۔ اس نے صادق کو بتایا کہ وہ شاہ مہتاب کو شاید جان سے ہی مار آئی ہے۔

اپنے اغوا کی واردات اس نے یوں سنائی کہ وہ علی الصبح کھیتوں میں گئی تو ویسے ہی کچھ اور آگے چلی گئی جہاں علاقہ بنجر اور ویران تھا۔ پیچھے سے کسی نے اس پر کھیس یا کمبل پھینکا اور اسے اٹھا کر ویرانے کی طرف لے گیا۔ راستے میں اسے اپنے کندھوں سے اتارا۔ یہ دو آدمی تھے۔ انہوں نے اسے دھمکیاں دیں کہ وہ روئی یا شور مچایا تو اسے خراب کر کے قتل کر دیا جائے گا۔ اسے اغوا کرنے والے یہی دو جرائم پیشہ افراد تھے جنہیں شاہ مہتاب نے اپنے ساتھ یا اپنے سائے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ لڑکی ان دونوں کو اچھی طرح جانتی پہچانتی تھی۔ وہ اس طرح کہ وہ صادق کے دوست تھے اور چند مرتبہ اس کے گھر بھی آئے تھے۔

اب یہ دونوں جرائم پیشہ میرے تھانے میں پابند بیٹھے تھے۔ میں نے کچھ سوچ کر ہی اے ایس آئی سے کہا تھا کہ انہیں تھانے میں ہی رکھنا باہر نہ جانے دینا۔ اب تو میں نے انہیں باقاعدہ حوالات میں بند کرنا تھا۔

انہوں نے اغوا کی یہ واردات غالباً اس امید پر اتنی دلیری سے کی تھی کہ شاہ مہتاب انہیں گرفتاری سے بچائے رکھے گا۔ صادق نے بتایا کہ اسے بیوی نے یہ بات سنائی تھی کہ تھوڑی ہی دور چھوٹا سا ایک گاؤں تھا، لڑکی کو وہاں ایک مکان میں بند کر دیا گیا اور یہ دونوں لڑکی کو خراب کرتے رہے۔

قتل کی رات یہ دونوں لڑکی کو شاہ مہتاب کے گھر لے آئے۔ شاہ مہتاب کا کتا اس وقت باہر کھلا پھر رہا تھا لیکن ان دونوں آدمیوں سے مانوس تھا اس لیے نہ بھونکا نہ غرایا۔ یہ دونوں آدمی لڑکی کو شاہ مہتاب کے حوالے کر کے چلے گئے۔

صادق کا بیان جب یہاں تک پہنچا تو میں نے بہتر جانا کہ اس کی بیوی کو بھی بلا لوں اور واردات کا ارتکاب اس کی زبان سے سنوں۔ میرے کہنے پر صادق نے اپنی بیوی کو بلا کر اپنے پاس بٹھا لیا۔ اس نے اسے کہا کہ قتل کا وقوعہ مجھے بلا جھجک سنا دے۔

لڑکی نے یہ بات یوں سنائی کہ شاہ مہتاب اسے اپنے کمرے میں لے گیا اور کہا کہ وہ اسے صرف دو راتیں اپنے پاس رکھے گا پھر آزاد کر دے گا۔ لڑکی نے اس کی منت سماجت کی اور روئی بھی لیکن شاہ مہتاب انسان نہیں ابلیس تھا۔ اس نے لڑکی کو زبردستی شراب پلانے کی کوشش کی جو لڑکی نے نہ پی۔ خود اس نے شراب پی لی اور لڑکی کو پلنگ پر لٹانے لگا۔

لڑکی پلنگ کے قریب نہیں جا رہی تھی۔ شاہ مہتاب نے زبردستی کی تو اس دھینگا مشتی میں لڑکی کی کچھ چوڑیاں ٹوٹ گئیں۔ پھر شاہ مہتاب نے اپنا پاجامہ اتار کر پلنگ کے کونے پر رکھ دیا اور لڑکی کو اٹھا کر پیٹھ کے بل پلنگ پر پھینکا اور اس پر سوار ہو گیا۔

لڑکی آخر عورت ذات تھی اور کمزور تھی اور شاہ مہتاب ہٹا کٹا آدمی تھا۔ لڑکی نے قسم کھالی تھی کہ اس شخص کے ہاتھوں اپنا جسم ناپاک نہیں ہونے دوں گی۔ لڑکی نے نیچے سے شاہ مہتاب کی شہ رگ اپنی مٹھی میں لے کر اتنی زور سے دبایا کہ اس کے ناخن شاہ مہتاب کی کھال میں اتر گئے اور وہ بے ہوش ہو گیا اور ایک پہلو کے بل پلنگ پر گرا۔

اس وقت لڑکی چڑیل بن چکی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑی ہوئی۔ اب شاہ مہتاب پیٹھ کے بل تھا اور لڑکی اس کے سینے پر بیٹھ ہوئی تھی۔ شاہ مہتاب کی شہ رگ لڑکی کی شکنجے جیسی مٹھی میں تھی۔ لڑکی نے اس کی شہ رگ چھوڑ دی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا گلا گھونٹا اور دیکھا کہ شاہ مہتاب کے بازو پلنگ پر بے جان ہو کر گر پڑے تھے اور اس کے جسم میں کوئی حرکت نہیں رہی تھی۔ میرے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے لڑکی نے بتایا کہ جب شاہ مہتاب نے اسے اٹھا کر پلنگ پر پھینکا تھا وہ تو وہ ننگے پاؤں نہیں تھی، اس نے جوتی پہن رکھی تھی جو اس کے پاؤں میں ہی رہی، اتری نہیں۔ اس نے اپنے بیان میں کہا جب دیکھا کہ شاہ مہتاب کا منہ کھل گیا ہے اور اس کی آنکھیں بھی ایسی کھلی ہیں جیسے ڈھیلے باہر آ جائیں گے تو اس نے شاہ مہتاب کی گردن چھوڑ دی۔ شاہ مہتاب کا پھر بھی منہ کھلا رہا اور آنکھیں بھی۔ وہ پلنگ سے اتری اور باہر نکل گئی۔

حویلی کے دروازے سے نکلتے اس نے دیکھ لیا تھا کہ ایک عورت صحن میں نکلی ہے۔ لڑکی باہر کو دوڑ پڑی۔ بائیں ٹانگ اسے دوڑنے نہیں دے رہی تھی۔ وہ آہستہ چلنے لگی تو کتا بھونکا اور اس کی طرف آیا۔ وہ پھر دوڑنے لگی اور کتا اس تک پہنچ گیا۔

کتے نے اس کا دایاں بازو اپنے منہ میں لے لیا اور لڑکی کی چیخ نکل گئی۔ اس نے کتے کی آنکھوں پر بڑی زور سے ہاتھ مارا تو کتے نے بازو چھوڑ دیا۔ وہ پھر دوڑی تو کتے نے پیچھے سے اس کی پیٹھ پر پنجے مارے اتنے میں حویلی میں دروازے کی طرف سے ایک عورت نے کتے کو پکارا اور لڑکی نے اس عورت کے دوڑتے قدموں کی آوازیں بھی سنیں۔ اس کے ساتھ ہی لڑکی کا دوپٹہ اتر گیا اور کتے پر پڑا۔ کتا دوپٹے میں الجھ گیا اور لڑکی کو بھاگ نکلنے کا موقع مل گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ میں کسی نہ کسی کی زبان سے تحریر کر چکا ہوں۔ صادق صبح سویرے بیوی کو ڈسپنسر کے پاس لے گیا۔ ڈسپنسر نے زخم بلکہ زخموں کی مرہم پٹی بڑی توجہ سے کر دی اور جب وہ واپس آئے تو میں پہنچ گیا۔

میں نے قاتل پکڑ لیا تھا۔ یہاں پر میری تفتیش ختم ہو گئی تھی اور اب مقدمہ تیار کرنا تھا جس کے لیے شہادت اور ٹھوس ثبوت اکٹھے کرنے تھے لیکن میرے اپنے جذبات اڈ آئے اور میں نے اس واردات میں اپنی ذات کو ملوث کر لیا۔ میری جگہ پر آ کر سوچیں کہ جسے میں اللہ کا برگزیدہ عالم اور ولی اللہ سمجھتا رہا تھا وہ اِس قدر فریب کار نکلا کہ ایک تھانے دار کو بھی اس نے اُلو بنائے رکھا۔

اگر صرف میری ذات کی توہین ہوتی یا صرف مجھے اس فریب کاری کی تکلیف پہنچی ہوتی تو شاید میں برداشت کر لیتا لیکن اس شخص نے درپردہ جو ابلیسیت جاری ساری کر رکھی تھی اس میں نہ جانے صادق کی بیوی جیسی کتنی ہی بھولی بھالی، معصوم اور کنواری لڑکیاں ذلیل و خوار کر دی گئی تھیں۔ یہ بھی انکشاف ہوا تھا کہ اس شاہ مہتاب نے ایک ہندو ساہوکار کے گھر ڈاکہ ڈلوایا تھا اور چھوٹے موٹے کئی جرائم کروائے تھے۔

میں نے شاہ مہتاب کے دونوں جرائم پیشہ آدمیوں کو گرفتار کر کے ان پر اغوا، جبری آبروریزی اور دو اور دفعات کے تحت مقدمہ تیار کر لیا تھا۔ ان دونوں نے شاہ مہتاب کے کئی اور جرائم اور کبیرہ گناہوں سے پردہ اٹھایا تھا۔ میں ان تفصیلات میں نہیں جا رہا حالانکہ

ان میں کچھ دلچسپیاں بھی ہیں۔ میری اس تفتیشی کہانی کے اندر کئی کہانیاں ہیں جو اتنی طویل ہیں کہ ایک کہانی میں سمیٹی نہیں جا سکتیں، مثلاً صادق کا محاذ سے فرار اور اس کا میرے تھانے کے علاقے کے اس گاؤں پہنچنا ایک بڑا ہی سنسنی خیز واقعہ ہے جسے میں ایکشن ڈرامہ کہوں تو زیادہ بہتر ہوگا۔ کبھی خیال آیا تو یہ بھی سنا دوں گا۔

شاہ مہتاب کا قتل میرے لیے باعث مسرت تھا۔ میں اب یہ ارادہ کر بیٹھا کہ صادق کی بیوی کو سزا سے بچانا ہے۔ پاکستانی خواتین و حضرات تو سمجھتے ہیں کہ پولیس جسے چاہے بچا سکتی ہے اور جسے چاہے لٹکا سکتی ہے۔ یہ مک مکا کی کرشمہ سازی ہے لیکن انگریزوں کے دورِ حکومت میں یہ ممکن ہی نہیں تھا۔ تھانے دار کو ملزم گرفتار ہی کرنا پڑتا تھا خواہ وہ اس کا سگا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ مقدمے میں ذرا سی ہیرا پھیری کر کے کسی کو اتنا فائدہ پہنچایا جا سکتا تھا کہ سیشن کورٹ کی سنائی ہوئی سزا کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل ہوتی تھی اور یہ کمزوری ہائی کورٹ میں سامنے لا کر ملزم کو بری کروا لیا جاتا تھا۔

میں نے صادق کی بیوی کو باقاعدہ گرفتار کر لیا اور تھانے لے گیا۔ مقدمہ اس زمین پر کھڑا کیا کہ اس ملزمہ کو اغوا کیا گیا، اسے بے آبرو کیا گیا اور اس شاہ سے اپنی عزت اور جان بچانے کے لیے لڑکی نے شاہ کو گلا گھونٹ کر مار دیا اور یہ اس کا قانونی حق تھا۔ میں نے لڑکی کو قانونی حق دلانے کے لیے کچھ ڈرامے کھیلے۔ مثلاً ایک یہ کہ شاہ مہتاب کا ریوالور چھ گولیوں سے بھر کر واردات والے پلنگ پر رکھا اور وہاں سے برآمد کروایا، برآمدگی کے گواہ اپنی مرضی کے رکھے اور اس طرح ثابت کیا کہ مقتول نے ریوالور کی نالی ملزمہ کی کنپٹی پر رکھی اور جان کی دھمکی دے کر اس کی آبروریزی کی کوشش کی لیکن ملزمہ کو مقتول کا گلا دبانے کا موقع مل گیا۔ اس طرح یہ مقدمہ سیلف ڈیفنس (حفاظت خود اختیاری) بن گیا۔

اس کے ساتھ ہی دو جرائم پیشہ افراد پر اغوا اور آبروریزی اور دو مزید دفعات کا مقدمہ تیار کر کے عدالت میں بھیج دیا اور اس مقدمے کا حوالہ قتل کے مقدمہ میں شامل کر دیا۔ لڑکی کے وکیل کو الگ کر کے میں نے سمجھا دیا کہ وہ عدالت میں یہ نکتہ اور دلیل دے کہ لڑکی کے ساتھ اس قدر ظلم ہوا تھا اور اس ظلم مین مقتول اضافہ کر رہا تھا کہ ملزمہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھی اور اس پاگل پن میں اس نے قتل کی واردات کر ڈالی۔

مختصر یہ کہ میں نے اپنا آپ بھی بچائے رکھا کہ میں ملزمہ کی مدد کر رہا ہوں اور مقدمہ

ایسا بنایا جو ملزمہ کے لیے فائدے مند تھا۔ اگر میں یہ کہانی صرف وکیلوں کو سنا رہا ہوتا تو میں مقدمے کی پوری تفصیل سناتا۔ اسے صرف وکیل سمجھ سکتے ہیں۔

مقدمہ چلا اور صادق کی بیوی کو سیشن جج نے تین سال سزائے قید دی۔ جج ہندو تھا۔ اس نے مسلمانوں کی پیر پرستی کے خلاف فیصلے میں بڑی رسوا کن باتیں لکھیں اور یہ لکھا کہ لڑکی یعنی ملزمہ انہی جرائم کا شکار ہوئی ہے۔

ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی تو صفائی کے وکیل نے ایک دو اور نکتے جو اسے میں نے بتائے تھے، پیش کر دیئے اور اس انگریز جسٹس نے لڑکی کو بری کر دیا۔

صادق کے متعلق تو میں نے یہ ظاہر ہی نہ ہونے دیا کہ بھگوڑا فوجی ہے۔ اسے میں نے کہا تھا کہ اب وہ خود سوچ لے کہ یہیں رہنا چاہتا ہے یا یہاں سے نکل جانا چاہتا ہے۔ اس نے کہا کہ اب جو ہوگا دیکھی جائے گی میں بیوی کو ساتھ لے کر اپنے وطن جا رہا ہوں۔

میری یہ کہانی یہیں پر ختم ہو جاتی ہے لیکن سیدھے سادے اور گنوار مسلمانوں نے شاہ مہتاب کو یوں زندہ رکھا کہ اس کا مزار بنایا اور پھر مزار پر چڑھاوے چڑھنے لگے اور میں نے وہاں ایک سالانہ عرس بھی دیکھا۔

تو یہ ہے کہانی ٹیڑھے پاؤں اور سیدھے لوگوں کی۔

* * *

اُرملا سے عابدہ تک

میں اس صبح معمول سے جلدی تھانے چلا گیا۔ اس روز کام کچھ ایسے تھے کہ مجھے طلوع آفتاب سے پہلے تھانے جانا تھا۔ میں ابھی اپنے دفتر میں داخل ہوا بھی نہیں تھا کہ تین ہندو تھانے میں آئے۔ ہندو خواہ کتنی ہی اونچی حیثیت کا ہو، میں اسے معزز بھی نہ کہوں لیکن ان تینوں کو میں معززین صرف اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یہ پولیس کی اصطلاح ہے۔ یہ تینوں قصبے کے آڑھتی تھے اور اچھے خاصے امیر کبیر لوگ تھے۔ ان میں ایک بڑا ہی بھدا، گول گپا، چھوٹے ناٹے قد کا آدمی تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے انہیں اپنے دفتر میں بٹھایا اور آمد کا مدعا پوچھا۔

''میری بیوی قتل ہو گئی ہے'' ـــــ گول گپے ٹھنگنے نے سسکی سی لے کر کہا۔

اس کے ساتھ جو دو ہندو آئے تھے، وہ اس کے پڑوسی بھی تھے اور منڈی میں وہ بھی آڑھتی تھے۔ اس شخص کا نام پنڈت شردھانند تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ حسب معمول سحری کے وقت اٹھا تو بیوی کو بستر سے غائب پایا۔ یہ کوئی پریشانی والا معاملہ نہیں تھا۔ بیوی بھی اسی وقت جاگ اٹھنے کی عادی تھی لیکن بہت دیر گزر گئی اور بیوی غائب ہی رہی۔ وہ اتنی دیر غسل خانے میں نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ شخص اسے کمروں میں ڈھونڈنے لگا۔ وہ جب بیٹھک میں گیا تو بیوی کو فرش پر پڑے دیکھا۔ اسے ہلایا، آوازیں دیں اور جھنجھوڑا لیکن وہ مری پڑی تھی۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھیں کچھ زیادہ ہی کھلی تھیں اور منہ بھی کھلا تھا۔

اس ہندو کی عمر 40 برس سے تجاوز کر چکی تھی۔ اس کی ایک بیٹی تھی جس کی عمر سولہ سال ہو گئی تھی اور اس سے چھوٹا بیٹا تھا جو بارہ تیرہ سال کا تھا۔ وہ بے چارے اس کی کیا مدد کر سکتے تھے، یہ شخص پڑوسیوں کے ہاں دوڑا گیا اور شور شرابا کیا۔ پڑوسیوں نے جا کر دیکھا اور اسے کہا کہ لاش کو وہیں پڑا رہنے دے اور ان کے ساتھ تھانے چلے۔

میں جس دور کی بات سنا رہا ہوں، اس وقت قتل کی واردات یوں سمجھی جاتی تھی جیسے زلزلے کا شدید جھٹکا آیا ہو۔ بیشتر قارئین کرام اس دور کو تصور میں نہیں لاسکیں گے جب قتل کی اطلاع پورے تھانے کو بنیادوں تک ہلا ڈالتی تھی اور ڈی ایس پی وغیرہ تڑپ اٹھتے اور علاقہ تھانیدار کی جان کو آجاتے تھے۔ آج پاکستان میں تو قتل کو ایک معمولی سی واردات سمجھ لیا گیا ہے۔ قتل کی وارداتیں بھی اتنی کہ تھانے کے اندر بھی قتل ہوتے ہیں اور باہر کا تو حساب ہی نہیں۔ یہ ہندوستان کے علاقے کی واردات ہے جو ہندوؤں کی غالب اکثریت کا علاقہ تھا۔ وہاں قتل کا تصور تو موجود تھا عملاً اتنی سنگین واردات کبھی کبھی ہوا کرتی تھی۔

میں نے پنڈت شردھانند سے وہ معلومات حاصل کرلیں جو قتل کی اطلاع پر کی جاتی ہیں اور پھر میں نے ان کاموں کو سردخانے میں پھینک دیا جن کی خاطر میں اتنی سویرے تھانے آیا تھا۔ میرے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور تین کانسٹیبل تھے۔ واردات والے مکان تک پہنچے تو مجھے صدر دروازے کی بجائے بیٹھک والے دروازے سے اندر لے جایا گیا اور بتایا گیا کہ جب پنڈت موصوف نے اپنی بیوی کی لاش دیکھی تھی تو اس نے بیٹھک کا باہر والا دروازہ کھلا پایا تھا۔ یہ دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ مجھے اسی دروازے سے اندر لے جایا گیا۔

میرے سامنے فرش پر ایک عورت کی لاش پڑی تھی۔ میں نے اس کا چہرہ دیکھا۔ چہرے پر اذیت اور کرب کے آثار ابھی تک موجود تھا۔ ان آثار کے ہوتے ہوئے بھی عورت خوبصورت لگتی تھی۔ میں نے اپنے تجربے کی بناء پر اس کی عمر کا تعین چالیس برس سے ایک دو برس اوپر کیا۔ اس عمر میں بھی اس کے چہرے پر جوانی کے آثار موجود تھے۔ یہ چہرہ مرچکا تھا لیکن میں اس کی کھلی اور پتھرائی ہوئی آنکھوں میں اور چہرے پر جوانی کے آثار دیکھ رہا تھا۔

میں نے لاش کا معائنہ شروع کیا۔ سب سے پہلے گردن دیکھی جس پر بڑے صاف نشان تھے جو گواہی دیتے تھے کہ اس کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھ لیا کہ گلا ہاتھوں سے یا رسی سے نہیں گھونٹا گیا بلکہ کپڑا استعمال کیا گیا تھا۔ کپڑے کے نشان مختلف ہوتے ہیں۔ پورے جسم کو دیکھا، لاش کی کروٹ بدل کر دیکھا، جسم پر کہیں اور کسی قسم کے تشدد کے نشانات نہیں تھے۔ میں نے لاش کی برآمدگی کے کاغذات تحریر کئے اور اس تحریر پر دو گواہوں

کے دستخط لے کر ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ لاش پوسٹمارٹم کے لیے لے جائے۔ مقتولہ کے خاوند نے چارپائی اور چارپائی اٹھانے کے لیے آدمیوں کا انتظام کردیا اور لاش چلی گئی۔

"کیا رات کوئی مہمان آیا تھا؟" ـــ میں نے پوچھا ـــ "کسی مہمان کے لیے ہی بیٹھک کھولی گئی ہوگی اور اسے باہر والے دروازے سے رخصت کیا گیا ہوگا!"

"کوئی مہمان نہیں آیا تھا" ـــ مقتولہ کے خاوند نے جواب دیا ـــ "ایسے تو ہو نہیں سکتا تھا کہ میری بیوی کا کوئی ایسا مہمان آیا ہوتا جس کا مجھے علم نہ ہوتا"۔

"پھر آپ کی بیوی بیٹھک میں کیوں آئی تھی؟" ـــ میں نے پوچھا۔

"رات کے وقت اس کا اس بیٹھک میں آنا میری سمجھ میں بھی نہیں آتا" ـــ اس نے کہا ـــ "میں جب بیٹھک میں آیا اور لاش دیکھی تو سب سے پہلے گلی والا دروازہ دیکھا جو کھلا ہوا تھا۔ بہت سوچا ہے لیکن کچھ پتہ نہیں چلتا وہ کون تھا اور کس طرف سے آیا تھا"۔

"رات کو کبھی کبھار دروازے پر دستک ہوتی ہوگی" ـــ میں نے پوچھا ـــ "اگر ایسا ہوتا رہا ہے تو دروازہ کھولنے کون باہر نکلتا ہے؟...... آپ یا آپ کی بیوی یا نوکر؟"

"گھر میں نوکر نہیں" ـــ اس نے جواب دیا ـــ "دروازہ میں ہی کھولا کرتا ہوں۔ رات کے وقت میں عورت کو دروازے تک جانے نہیں دیتا۔ ویسے بھی برا لگتا ہے کہ مرد گھر میں ہو اور دروازہ کھولنے عورت جائے۔ یہ تو پتہ ہی نہیں ہوتا کون آیا ہے"۔

میں نے دروازہ اچھی طرح دیکھا، اس کی چٹخنیاں دیکھیں، دروازہ کہیں سے بھی ٹوٹا ہوا نہیں تھا اور کوئی ایسی نشانی نظر نہ آئی جس سے پتہ چلتا کہ قاتل نے باہر سے دروازہ کھول لیا تھا...... یہ خیال بھی آیا کہ فرض کیا قاتل نے باہر سے دروازہ کھول لیا تھا تو اسے یہ بیٹھک خالی ملنی چاہیے تھی۔ مقتولہ بیٹھک میں کیوں آئی تھی؟ بیٹھک میں دوسرے فرنیچر کے علاوہ ایک قیمتی پلنگ بھی پڑا ہوا تھا۔ میں نے شردھانند سے پوچھا کہ اس کی بیوی کہاں سویا کرتی تھی؟ اس نے جواب دیا کہ اس کے سونے کا کمرہ الگ ہے اور ہمیشہ اسی کمرے میں سویا کرتی تھی۔

میں نے سارا مکان گھوم پھر کر دیکھ لیا۔ اندر آنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ مکان خاصا کشادہ تھا اور اس میں کمرے بھی چھ سات تھے، ڈیوڑھی بھی تھی اور بالائی منزل بھی تھی۔ یہ مجھے ناممکن نظر آیا کہ چھت کی طرف سے کوئی نیچے اترا ہوگا۔ مقتولہ کے خاوند سے پوچھا تو

اس نے بتایا کہ صدر دروازہ اندر سے ٹھیک بند تھا۔

میرے کہنے پر پنڈت شردھانند مجھے سونے والے کمرے میں لے گیا جہاں میں نے دو پلنگ بچھے ہوئے دیکھے۔ مجھے وہ پلنگ دکھایا گیا جہاں مقتولہ سوتی تھی۔ یہ کمرہ بیٹھک سے دور تھا۔ فاصلے کا اندازہ اس طرح کریں کہ بیٹھک اس مکان کے ایک کونے میں تھی اور سونے کا کمرہ اس کے بالمقابل کونے میں تھا۔ سونے والے کمرے کے ساتھ والے کمرے میں اس میاں بیوی کی بیٹی اور اس کا چھوٹا بھائی سوتے تھے۔

یہ بہن بھائی گھر میں موجود تھے اور بری طرح رو رہے تھے۔ میں نے انہیں ذرا بہلایا اور پوچھا کہ انہوں نے رات کو دروازے پر دستک سنی تھی یا نہیں؟ دونوں نے سر ہلا دیئے کہ انہوں نے کوئی دستک یا کوئی آواز نہیں سنی تھی...... میں نے مقتولہ کی بیٹی کو اچھی طرح دیکھا۔ سولہ سال اس کی عمر تھی اور بہت حسین وجمیل لڑکی تھی۔ میرے ذہن میں ایک مشاہدہ اور بھی اٹک گیا تھا۔ مقتولہ کو میں نے مردہ حالت میں دیکھا تھا۔ وہ دراز قد اور بڑے ہی اچھے جسم والی عورت تھی۔ اس کی خوبصورتی ایسی تھی کہ موت بھی اس کے چہرے پر پردہ نہیں ڈال سکی تھی۔ اس کے مقابلے میں اس کا خاوند ٹھنگنے قد کا اور بہت ہی موٹا اور بھدا آدمی تھا۔ اس پر صدمے کا اثر تو تھا ہی لیکن میں نے یہ مشاہدہ کیا کہ وہ بات کرتا تھا تو بالکل احمق لگتا تھا۔ بیشتر ہندو تاجروں میں ایک ہی چیز دیکھنے میں آتی تھی کہ انہیں دنیا کی کوئی اور دلچسپی نہیں ہوتی تھی اور عموماً اسی طرح احمقانہ باتیں کیا کرتے تھے لیکن جب وہ اپنے کاروبار کی، لین دین کی اور سودے بازی کی بات کرتے تھے تو ان میں ایسی دانشمندی اور حاضر دماغی آجاتی تھی کہ مدمقابل کو چکرا دیتے تھے۔

سوال ایک ہی تھا...... مقتولہ رات کو بیٹھک میں کیوں گئی تھی اور دروازہ کس لیے کھولا گیا تھا؟...... میں بیٹھک میں جا بیٹھا اور پنڈت شردھانند کو بٹھا لیا۔ اس سے پوچھا کہ اس کی کسی کے ساتھ ذاتی، خاندانی یا کاروباری دشمنی ہوگی۔ اس نے کورا سا جواب دے دیا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ میں نے بال کی کھال اتارنے کی پوری کوشش کی لیکن یہ شخص مجھے کچھ بھی نہ بتا سکا۔

''پنڈت جی مہاراج!'' ــــ میں نے قدرے جھنجلا کر کہا ــــ ''اگر آپ بیوی کے قاتل کو پھانسی چڑھتا دیکھنا چاہتے ہیں تو کچھ تو بتائیں جس کی روشنی میں تفتیش کروں۔ آپ

تو میرے ہر سوال پر سر ہلا دیتے ہیں''۔

میری اس بات پر بھی اس نے تربوز جیسا سر ہلا دیا اور میری مایوسی میں اضافہ ہو گیا۔

اس میں تو کوئی شبہ تھا ہی نہیں کہ مقتولہ نے کسی کے لیے بیٹھک کا گلی والا دروازہ کھولا تھا۔ وہ شخص آیا اور اس عورت کو قتل کر کے چلا گیا۔

میں مقتولہ کے اس پنڈت خاوند سے سوال پوچھ رہا تھا اور میں جان چکا تھا کہ اس کے پاس میرے کسی بھی سوال کا تسلی بخش جواب نہیں پھر بھی میں سوال کئے جا رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی میرا دماغ سوچ رہا تھا۔ سوچ یہ رہا تھا کہ مقتولہ پیشاب وغیرہ کے لیے اٹھی ہو گی اور کسی نے صدر دروازے کی بجائے بیٹھک کے دروازے پر دستک دی ہو گی اور اس نے جا کر دروازہ کھولا اور وہ شخص اسے قتل کر کے چلا گیا۔ اس سوال میں سے ایک نہایت اہم سوال اٹھتا تھا، وہ یہ کہ قتل کا باعث کیا تھا؟...... مقتولہ کے ساتھ کسی بھی قسم کی زیادتی نہیں ہوئی تھی۔ گھر میں کوئی چیز چوری نہیں ہوئی تھی۔ یہ تو میں نے خاص طور پر دیکھ لیا تھا کہ اس قتل کا باعث ڈکیتی نہیں تھا۔

ایک امکان یہ بھی تھا کہ مقتولہ کی بیٹی جوان تھی۔ یہ لڑکی کسی کو چاہتی ہوگی اور اس نے اپنے محبوب کو بیٹھک میں ملاقات کا وقت دیا ہوگا۔ وہ آیا اور لڑکی نے دروازہ پہلے ہی کھول رکھا تھا اور جب وہ اندر آیا تو ماں جاگ اٹھی اور بیٹھک میں آئی۔ اندر آنے والے نے یہی بہتر سمجھا کہ اس عورت کو راستے سے ہٹا دیا جائے تاکہ شہادت ہی نہ رہے۔

پھر ایک امکان یہ بھی تھا کہ پنڈت شردھانند نے ہی اس عورت کا گلا گھونٹا اور بیٹھک میں پھینک دیا اور صبح تھانے رپورٹ کرنے جا پہنچا۔

یہ تھے وہ امکانات جو میرے ذہن میں آئے اور میں نے انہیں ذہن میں محفوظ کر لیا۔ میں نے مکان کو اچھی طرح دیکھ لیا تھا۔ میں اوپر گیا تھا اور پھر میں نے اس پنڈت کو بڑی ہی محنت اور توجہ سے کھنگال لیا تھا مگر حاصل کچھ بھی نہیں ہوا تھا۔ مجھے مقتولہ کی بیٹی اور بیٹے سے کوئی نہ کوئی سراغ مل سکتا تھا لیکن ابھی وہ دونوں صدمے کی ایسی حالت میں تھے کہ ہچکیاں لے لے کر رو رہے تھے۔ اس حالت میں ان سے کچھ اگلوانا محال تھا۔ میں تھانے چلا گیا۔ میں اپنے ساتھ پنڈت شردھانند کے دونوں پڑوسیوں کو لے گیا تھا اور ان کی وساطت سے ایک اور پڑوسی بھی میرے ساتھ ہو لیا تھا۔

میں نے تینوں کو دفتر میں بٹھا کر لیکچر دیا اور ڈرایا بھی۔ ڈرایا یوں کہ شہری ہوتے ہوئے ان پر فرض ہوتا ہے کہ وہ جو کچھ بھی جانتے ہیں، پولیس کو بتائیں تا کہ قاتل بچ کر نہ جا سکے۔ میں نے یہ بھی کہا کہ بعد میں اگر پتہ چلا کہ ان میں سے کسی کو یا تینوں کو کوئی انتہائی اہم بات معلوم تھی تو میں اس شخص کو اس جرم میں گرفتار کر سکتا ہوں کہ اس نے ضروری شہادت چھپالی تھی۔ یہ بھی کہا کہ یہ قاتل نہ پکڑا گیا تو یہی واردات ان میں سے کسی کے گھر میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس طرح لیکچر دے کر میں نے باری باری انہیں اپنے پاس بٹھا کر سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا۔

کم و بیش تین گھنٹے کی جھک جھک کے بعد مجھے جو باتیں معلوم ہوئیں وہ یہ تھیں کہ مقتولہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جنہیں خاوند اپنے پاؤں کے نیچے دبا کر رکھتے ہیں اور انہیں جائز بات کرنے کی بھی اجازت نہیں ہوتی۔ خاوند صرف کاروبار میں تیز طرار تھا، باقی معاملات میں یعنی معاشرتی اور گھریلو باتوں میں اسے نہ کوئی دلچسپی تھی نہ اس میں اتنی عقل تھی کہ ان امور کو اپنی مرضی کے مطابق چلا سکتا یا کم از کم سمجھ ہی سکتا۔

پنڈت کے ان پڑوسیوں نے افسوس کا اظہار کر کے کہا کہ مقتولہ پنڈت کے اختیار اور قابو میں تھی ہی نہیں۔ وہ اتنی خوش مزاج تھی کہ اس کی فحش کلامی سارے محلے میں مشہور تھی اور عورتیں اس سے لطف اندوز ہوا کرتی تھیں۔ اس نے اپنے آپ کو ابھی تک جوان رکھا ہوا تھا۔ چال چلن کے لحاظ سے بھی ٹھیک عورت نہیں تھی۔

میں نے کہا کہ خاوند کی غیر حاضری میں اس کے گھر میں کوئی آدمی یا اپنے رشتے داروں میں سے کوئی آدمی آتا ہوگا۔ مجھے یہ جواب ملا کہ یہ عورت اتنی کچی اور سادہ نہیں تھی کہ اپنے کسی دوست یار کو گھر بلاتی۔ اس گھر میں خاوند کی غیر حاضری میں صرف ایک آدمی آتا جاتا ہے اور وہ خاوند کا منشی ہے۔ میں نے ابھی اس منشی کو نہیں دیکھا تھا۔ ان تینوں نے متفقہ طور پر کہا کہ منشی جوان آدمی ہے، ابھی تک اس نے شادی نہیں کی اور خوبرو ہے۔ یہ منشی مسلمان تھا۔ پنڈت شردھا نند کو اس پر اتنا اعتماد اور بھروسہ تھا کہ صرف اسے گھر بھیجا کرتا تھا۔ گھر کے کئی کام ہوتے تھے جو یہ منشی کیا کرتا تھا۔

ان تینوں سے مجھے کچھ کارآمد باتیں معلوم ہو گئیں۔ یہ تو میرے تصور میں آیا ہی نہیں تھا کہ کوئی ہندو عورت اس قدر آزاد خیال ہو سکتی ہے۔ ان کی باتوں سے میں نے ایک

نتیجہ یہ اخذ کیا کہ یہ عورت بے لگام تھی اور اس نے خاوند کو اچھا خاصا اُلو بنا رکھا تھا۔

ان تینوں آدمیوں کے انکشافات سے میرے ذہن میں یہ شبہ ابھرا کہ مقتولہ نے خود ہی کسی کو بلایا تھا اور پھر کوئی وجہ ایسی ہو گئی کہ وہ اس کا گلا گھونٹ کر چلتا بنا۔ یہ رقابت بھی ہو سکتی تھی۔ بہر حال میں اب یہ کہہ سکتا تھا کہ اس قتل کا باعث اس گھر کے اندر ہی ہے۔

اس قصبے میں رات چوکیداروں کا سرکاری انتظام تھا۔ ہر وارڈ کا چوکیدار الگ تھا۔ اس وارڈ کا چوکیدار تھانے آیا بیٹھا تھا اور چوکیداروں کا میٹ بھی موجود تھا۔ جب بھی کوئی واردات ہو جاتی تھی تو اس وارڈ کا چوکیدار کسی حکم کے بغیر تھانے آجاتا تھا کیونکہ اسے معلوم تھا کہ اسے بلایا جائے گا۔ میں نے ان تینوں آدمیوں کو رخصت کر دیا اور چوکیدار کو بلایا۔

میں اس چوکیدار سے یہ توقع رکھتا ہی نہیں تھا کہ اس نے اس گھر میں کسی کو داخل ہوتے اور یہاں سے نکلتے دیکھا ہوگا۔ ہر چوکیدار کی ذمہ داری کا علاقہ اتنا زیادہ تھا کہ ان بے چاروں کی استطاعت سے باہر تھا۔ پھر بھی میں نے اس چوکیدار سے پوچھا کہ اس نے اس گلی میں سے کسی کو گزرتے دیکھا تھا۔ چوکیدار نے ایک ایسی بات بتا دی جسے میں امید کی ایک کرن کہوں تو غلط نہ ہوگا۔ اس کا بیان یہ تھا کہ گذشتہ رات تو اس نے کسی کو نہیں دیکھا البتہ چھ سات روز پہلے ایک آدمی کو دیکھا تھا۔ تقریباً آدھی رات کے وقت ڈیوڑھی کے اس دروازے سے ایک آدمی نکلا اور بائیں کو مڑ کر چلا گیا اور آگے جا کر گلی دائیں کو مڑتی تھی، اس طرف غائب ہو گیا۔ اس وقت چوکیدار اس سے کچھ دور کھڑا تھا۔ وہ اس شخص کو پہچان نہیں سکا۔

پھر چوکیدار نے یہ بھی بتایا کہ اس سے سات آٹھ روز پہلے بھی اس نے اسی بیٹھک میں سے کسی آدمی کو نکلتے دیکھا تھا۔ وہ بھی اسی طرف چلا گیا تھا جس طرف یہ دوسرا آدمی گیا تھا۔ اس وقت چوکیدار زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ تیز قدم اٹھاتا قریب آیا تو ایک ہاتھ دروازے میں سے باہر نکلا جس نے کواڑ بند کر دیا۔ گلی کی بتی ذرا دور تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ یہ ہاتھ نظر نہ آسکتا۔ یہ ہاتھ ہی نہیں تھا بلکہ کندھے تک پورا بازو تھا۔ میں نے چوکیدار سے پوچھنا شروع کر دیا تو اس کی یاد نکھر آئی۔ اس نے میرے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ یہ بازو سو فیصد ایک عورت کا بازو تھا۔ بازو میں چوڑیاں بھی تھیں اور قمیض کی آستین سے صاف پتہ چلتا تھا کہ زنانہ کپڑا ہے۔ اس عورت کا چہرہ سامنے نہیں آیا تھا۔

میں نے یہ تعین کرنے کے لیے کہ یہ ہاتھ یا یہ بازو ماں کا ہے یا بیٹی کا، چوکیدار سے پوچھا لیکن وہ کوئی تسلی بخش جواب نہ دے سکا۔ مجھے اس سے ایسی ہی توقع تھی۔ اس نے سراغرسانی یا جاسوسی کی نظر سے نہیں دیکھا تھا بلکہ اسے اطمینان ہو گیا کہ یہ جو آدمی اس گھر سے نکلا ہے وہ اس گھر کا آدمی ہو گا یا کوئی مہمان ہو گا جسے گھر کی عورت نے رخصت کیا ہے اور یہ کوئی چور اچکا نہیں۔

یوں چوکیدار نے میرے اس شک کی تائید کر دی کہ اس واردات کا باعث اس چار دیواری کے اندر ہی ہے اور یہ کوئی چوری چکاری یا ڈکیتی کی واردات نہیں نہ یہ واردات اتفاقیہ ہو گئی ہے۔ اب مجھے یہ اطمینان ہو گیا کہ قاتل پہلے بھی رات کے وقت گھر میں آتا رہا ہے اور وہ خود ہی نہیں آتا رہا بلکہ اسے بلایا جاتا تھا۔ یہ میری عقل و دانش اور فہم و فراست کی آزمائش تھی۔ کوئی سراغ اور کوئی نشان نہیں تھا، مجھے اب اپنی عقل سے اور اپنے تجربے سے کام لینا تھا ورنہ میرے لیے ناکامی ہی ناکامی تھی۔ یہ ایسا کیس تھا جسے پولیس کی زبان میں اندھا قتل کہتے ہیں یعنی ایسا قتل جس میں قاتل نے کوئی نشان اور کوئی سراغ نہ چھوڑا ہو۔

میں نے چوکیدار سے کہا کہ مجھے کوئی ایسا آدمی یا عورت درکار ہے جو مقتولہ کے بارے میں اندر کی باتیں بھی بتا سکے۔ یہ تو میں نے اپنے دوسرے ذرائع سے بھی معلوم کر لینا تھا لیکن میں ہر ذریعے سے فائدہ اٹھانے کی کوشش میں تھا۔ اسے آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا...... چوکیدار عقل والا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ایک عورت کو لے آئے گا جو گھر گھر کی خبر رکھتی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ اس عورت کو شام کے بعد لائے گا کیونکہ غریب عورت ہے اور انہی گھروں سے اسے دال روٹی اور کپڑا لتا ملتا ہے، کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ وہ تھانے آئی تھی۔

چوکیدار کو رخصت کر کے میں نے مخبروں کو تھانے بلانے کا حکم جاری کیا...... آپ کے ہاں مخبر کا تصور کچھ اور ہو گا۔ میں اگر آپ کو بتاؤں کہ کیسے کیسے حضرات پولیس کے پاس آ کر مخبری کرتے ہیں تو آپ کا تصور چکنا چور ہو جائے اور آپ حیران بھی ہو جائیں۔ ایک تو پولیس کے پیشہ ور مخبر ہوتے ہیں جن کا سوسائٹی میں کوئی اونچا مقام نہیں ہوتا، مثلاً وارداتیے، رجسٹرڈ بدمعاش، جرائم پیشہ اور سزا یافتہ لوگ۔ اصل مخبری تو وہ معززین کرتے ہیں جو اپنے اپنے علاقے میں عوام کے حاکم بلکہ حکمران بنے رہتے ہیں لیکن پولیس کے

افسروں کے ہاں جا کر وہ ایک دوسرے کے خلاف غیبت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اس فن میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے وہ لوگوں کے گھروں کے اندر کی باتیں معلوم کرتے رہتے ہیں۔ زندگی نے وفا کی تو میں کسی وقت ایسے معزز مخبروں کی بھی ایک دو کہانیاں سناؤں گا۔ علاقے میں کوئی سنگین واردات ہو جاتی تھی تو یہ لوگ فرداً فرداً خود ہی بن بلائے تھانے آ جاتے تھے اور تفتیش کرنے والے افسروں کے لیے روشنی کے مینار ثابت ہوتے تھے۔

ذہن میں یہ رکھ لیں کہ میں یہ وقوعہ اور اس کی تفتیش کی تفصیلات سناتے ہوئے ایسی پابندی نہیں رکھ سکوں گا کہ یہ بات واردات کے کتنے دنوں بعد ہوئی تھی اور میں نے فلاں اقدام کس روز اور کس وقت کیا تھا، وقت دن کا تھا یا رات کا۔ بات پرانی ہو گئی ہے اس لیے دن اور وقت کا تعین میرے لیے ممکن نہیں رہا۔

اس قصبے میں ایک سرکاری ہسپتال تھا جس کا ڈاکٹر وہیں پوسٹمارٹم کیا کرتا تھا۔ اس سے ہمیں یہ سہولت تھی کہ تفتیش میں وقت ضائع نہیں ہوتا تھا۔ مقتولہ کی پوسٹمارٹم رپورٹ آئی تو پتہ چلا کہ اس کی موت رات ساڑھے گیارہ اور بارہ بجے کے درمیان واقع ہوئی ہے۔ یہ تصدیق ہو گئی کہ گلا گھونٹا گیا تھا اور موت کا باعث یہی تھا۔ گلا گھونٹنے کے سوا اس پر کسی بھی قسم کا تشدد نہیں کیا گیا تھا نہ اس کی آبرو ریزی کی گئی تھی۔ یہ تو میں نے لاش دیکھتے وقت نوٹ کر لیا تھا کہ اس نے کپڑے پہنے ہوئے تھے اور ان کپڑوں کو چھیڑا نہیں گیا تھا یعنی مقتولہ پر دست درازی نہیں ہوئی تھی۔

اس رپورٹ کی روشنی میں یہی کہا جا سکتا تھا کہ یہ انتقامی قتل کی واردات ہے۔ مقتولہ کی عمر بے شک چالیس برس سے تجاوز کر گئی تھی لیکن وہ جوان لگتی تھی اور اس کا حسن قائم تھا۔ اس کے باوجود قاتل نے اس پر مجرمانہ حملہ نہیں کیا تھا بلکہ میں یہاں تک کہوں گا کہ اس نے جیسے توجہ ہی نہ دی ہو کہ یہ ایک خوبصورت عورت ہے۔ وہ اسے قتل کرنے ہی آیا تھا اور اس میں انتقام کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ نہ اس نے اس کے حسن و جوانی کی طرف توجہ دی نہ اس نے اس کے زیورات اتارے۔ اس کے کانوں میں سونے کے وزنی جھمکے تھے، بازوؤں میں سونے کی چوڑیاں تھیں اور ایک انگلی میں سونے کی انگوٹھی تھی۔

شام تک تین چار مخبر اور خود میرے پاس آ چکے تھے...... میں کہانی سنانے کے

معاملے میں طوالت اور تفصیلات کا قائل نہیں۔ میں صرف نہایت اہم باتیں سناتا ہوں۔ ان افراد سے مجھے یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ مقتولہ اپنی بدمعاشی کی وجہ سے قتل ہوئی ہے۔ اس کا خاوند ایسا بدھو تھا کہ اس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔ یہ تو میں بھی جانتا تھا کہ تجارت پیشہ ہندو کسی کے ساتھ عداوت رکھتے ہی نہیں تھے بلکہ یہاں تک دیکھا گیا تھا کہ ان سے کوئی گالی گلوچ کردے تو بھی وہ اپنی مطلب براری کی خاطر ہنستے رہتے تھے۔

مقتولہ کے بارے میں ان میں سے کسی نے بھی اس کے حق میں بات نہیں کی۔ انہوں نے کہا کہ منشی جو پنڈت شردھانند کے گھر کھلے بندوں آتا ہے کسی کاروباری یا گھریلو کام کے لیے نہیں آتا بلکہ مقتولہ کی خاطر آتا ہے اور مقتولہ اس کی پرورش کرتی ہے۔ اس منشی کا نام لائق علی تھا۔ میں نے یوں نہیں سوچا کہ منشی کے بارے میں ایک اطلاع ملی تو اسے فوراً تھانے بلالوں، میں نے اسے ذہن میں محفوظ کرلیا اور سوچا کہ آگے چل کر اسے بلالوں گا۔ ابتدائی مرحلے میں، میں اسے اور مقتولہ کے خاوند کو یہ تاثر دینا ہی نہیں چاہتا تھا کہ ان کے خلاف میرے دل میں شکوک ہیں۔ خاوند کے بارے میں کہہ چکا ہوں کہ یہ امکان موجود تھا کہ اس نے خود ہی مقتولہ کا گلا گھونٹ دیا ہوگا۔ مجھے اپنے اس شک کے حق میں رپورٹیں ملنی شروع ہوگئی تھیں۔ میں نے اپنی سروس میں دیکھا ہے کہ اس قسم کے سیدھے، بدھو اور بزدل آدمی کسی وقت ایسے بھڑک اٹھتے ہیں کہ کسی کا یا اپنا ہی خون کردیتے ہیں۔

پھر ان افراد نے ایک انکشاف اور کیا۔ اس گھر میں ایک بڑی ہی حسین اور نوجوان لڑکی تھی جو قتل کا باعث بن سکتی تھی۔ میں نے ابھی اس لڑکی کے بارے میں کچھ بھی نہیں پوچھا تھا لیکن ان افراد نے خود ہی اس کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہاں ایک ہندو ٹھیکیدار ہے جس کی عمر چالیس برس سے تجاوز کرچکی ہے۔ وہ بڑا ہی مالدار آدمی ہے اور عیاش، شرابی اور بدکار ہے۔ مقتولہ اپنی اس بیٹی کی شادی اس ٹھیکیدار کے ساتھ کررہی تھی۔ مقتولہ نے اس سے پچاس ہزار روپیہ مانگا تھا اور آخر 22 ہزار میں سودا طے ہوا۔ اب تک شادی ہو جانی چاہئے تھی لیکن خفیہ اطلاعات کے مطابق لڑکی رضامند نہیں ہورہی تھی اور ماں اس پر زبردستی اپنا فیصلہ ٹھونس رہی تھی۔

یہاں میں تھوڑی سی وضاحت پیش کرنا چاہتا ہوں۔ ہندوؤں میں آج بھی یہ دستور چلتا ہے کہ لڑکے والے لڑکی والوں سے منہ مانگا جہیز لیتے ہیں اور اس کے ساتھ کچھ رقم کیش

بھی مانگتے ہیں۔ میں ایسے متعدد واقعات سنا سکتا ہوں کہ لڑکوں والے لڑکیوں والوں کو کس طرح زچ اور پریشان کردیتے ہیں۔ وہ یوں کہ بارات گئی اور لڑکے کے باپ نے لڑکی کے باپ سے کہا کہ نقد رقم جو طے ہوئی تھی ادا کرو پھر شادی ہوگی۔ لڑکی کے باپ نے کہا کہ یہ رہی رقم لیکن اس میں سے دو چار ہزار کم ہیں جو وہ ہفتہ دس دن تک ادا کردے گا۔ لڑکے کے باپ نے یہ فیصلہ سنا دیا کہ رقم پوری کرو ورنہ بارات واپس چلی جائے گی۔ تصور میں لائیں لڑکی کے باپ کو کہ اس کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ ایسے باپ لڑکے کے باپ کے پاؤں تک پکڑ لیتے ہیں، روتے اور بھیک مانگتے ہیں کہ بارات واپس نہ لے جاؤ، کل باقی رقم پہنچ جائے گی لیکن عام طور پر لڑکے والے ذرا بھی رعایت نہیں کرتے۔ وہ رقم لے کر ہی شادی کرتے ہیں۔

معذرت خواہ ہوں، کہانی کوئی اور سنا رہا ہوں اور اس سے ایسی بات نکل آئی ہے جسے میں پایۂ تکمیل تک پہنچا دوں تو آپ کی دلچسپی کا سامان ہو جائے گا۔ یہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہے جو بھارت کے جنوبی علاقے مدراس کا ہے۔ لڑکی کے باپ نے لڑکے کے باپ کے ساتھ کچھ رقم طے کی تھی۔ بارات آئی اور لڑکے کے باپ نے لڑکی کے باپ سے رقم کا مطالبہ کیا۔ لڑکی کے باپ نے رقم پیش کردی لیکن اس میں پانچ ہزار روپیہ کم تھا۔ اس نے کہا کہ یہ بقایا رقم چار دنوں میں ادا کردی جائے گی۔ لڑکے کے باپ نے رعونت سے کہا کہ پوری رقم لوں گا ورنہ شادی نہیں ہوگی اور بارات واپس جائے گی۔ لڑکی کے باپ نے اس کی منت سماجت نہ کی بلکہ یوں کیا کہ اٹھا، اندر اپنے مکان میں گیا، واپس آیا تو اس کے ساتھ اس کا جواں سال گھریلو ملازم تھا۔ اس نے پنڈت سے کہا میری بیٹی کی شادی ابھی میرے اس نوکر کے ساتھ کردو۔ باراتی اور دیگر لوگ ہکے بکے رہ گئے لیکن لڑکی کے باپ نے بڑے اطمینان سے لڑکی کا بیاہ اپنے نوکر سے کردیا اور لڑکے کے باپ کو دھتکار کر وہاں سے اٹھایا اور چلتا کردیا۔

یہ تو ہندوؤں کا دستور تھا جو آج بھی چلتا ہے اور لڑکیوں والے مجبوراً اسے قبول کرتے ہیں۔ آپ نے یہ بھی اخباروں میں پڑھا ہوگا کہ کوئی لڑکی لڑکے والوں کے ساتھ کئے ہوئے وعدے سے کم جہیز لے کر سسرال گئی تو اس کے ساتھ بے حد برا سلوک کیا گیا، یہاں تک کہ اسے جلا دیا گیا اور یہ کہا گیا کہ چولہا پھٹنے سے جل گئی ہے۔ اس دستور کے خلاف

پنڈت شردھانند کے ہاں گنگا الٹی چل پڑی تھی۔ وہ کوئی امیر کبیر ٹھیکیدار تھا جس کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ ایک دو نوجوان لڑکیوں کو خرید سکتا تھا۔ اس نے کہیں شردھانند کی بیٹی کو دیکھ لیا ہوگا اور شردھانند سے رابطہ کر کے سودا طے کر لیا۔ اس کی عمر لڑکی کی عمر سے اڑھائی گنا زیادہ تھی۔

چند اور مخبروں سے مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ سودا مقتولہ نے کیا تھا۔ وہ عیاش عورت تھی اور روپیہ پیسہ اس کی کمزوری تھی۔ اس نے اس ٹھیکیدار کے ساتھ اپنی بیٹی کا سودا کر لیا۔ مجھے جب یہ پتہ چلا تو میں نے ٹھیکیدار کو مشتبہوں کی فہرست میں شامل کر لیا۔ میرا شک یہ تھا کہ مقتولہ نے اس ٹھیکیدار سے کچھ رقم پیشگی وصول کر لی ہوگی اور ادھر لڑکی شادی سے انکار کر رہی تھی جسے ٹھیکیدار یہ سمجھا کہ مقتولہ یہ رقم ہضم کر گئی ہے اور اسے اپنی بیٹی نہیں دے گی۔ وہ دولت مند آدمی تھا، اس نے کرائے کے کسی قاتل کو بھیج کر مقتولہ کو مروا دیا لیکن میں پھر اس معمے اور گورکھ دھندے میں الجھ گیا کہ آدھی رات کے وقت مقتولہ بیٹھک میں کیا کر رہی تھی اور اس نے دروازہ کیوں کھولا تھا؟ میرے ذہن میں چوکیدار کا بیان آتا تھا کہ اس نے پہلے بھی آدھی رات کے وقت ایک آدمی کو دو مرتبہ بیٹھک میں سے نکلتے دیکھا تھا۔ یہ آدمی کرائے کا قاتل نہیں ہو سکتا تھا۔ بہر حال میں ان بھول بھلیوں میں الجھا ہوا تھا۔

شام گہری ہوگئی تو میں اپنے گھر چلا گیا۔ کھانا کھا چکا تو چوکیدار اس عورت کو لے کر آ گیا۔ میں نے اسے اپنے پاس بٹھایا اور کہا کہ وہ مقتولہ اور اس کے گھر کے بارے میں جو کچھ بھی جانتی ہے، تفصیل سے بتا دے۔

یہ اُدھیڑ عمر عورت اس قبیل سے تعلق رکھتی تھی جو اپنے دل کی اصل بات کبھی شگفتہ مسکراہٹوں سے اور کبھی بہتے آنسوؤں سے چھپا لیا کرتی ہیں۔ بڑے بڑے کایاں مردوں کو انگلیوں پر نچا دیا کرتی ہیں۔ بظاہر غریب اور مسکین ہوتی ہیں اور لوگوں کے گھروں میں جھاڑو برتن کرتی ہیں لیکن اس قدر چالاک اور ہوشیار کہ گھریلو عورتوں کے دلوں سے وہ راز بھی نکال لیتی ہیں جو وہ عورتیں اپنے آپ سے بھی چھپاتی پھرتی ہیں۔

اس عورت نے بات کی تو مجھے پتہ چلا کہ یہ تو مقتولہ کی راز دار تھی۔ مجھے اس عورت کے یہ الفاظ آج تک یاد ہیں کہ عموماً مرد عورت کو داشتہ بنا کر رکھا کرتے ہیں لیکن اس گھر میں معاملہ یوں الٹ تھا کہ اس عورت یعنی مقتولہ نے اپنے منشی لائق علی کو داشتہ بنا کر رکھا

ہوا تھا۔ مقتولہ کا پنڈت خاوند اس منشی پر پورا پورا اعتماد رکھتا تھا اور یہ منشی دوسرے تیسرے دن اس کے گھر جا کر مقتولہ کے ساتھ اس کے حکم کے مطابق وقت گزارتا تھا۔ یہ غریب عورت مقتولہ کی مٹھی چاپی کیا کرتی تھی اور اس کا پیٹ بھی ملا کرتی تھی۔

اس نے ایک اور اہم انکشاف کیا۔ وہ یہ تھا کہ مقتولہ کی بیٹی اس سے باغی ہوگئی تھی۔ بیٹی کو پتہ چل گیا تھا کہ اس کی ماں کے لائق علی کے ساتھ کیسے مراسم ہیں۔ لائق علی خوبرو جوان تھا جو بیٹی کے دل کو بھا گیا اور بیٹی نے لائق علی کو اپنی محبت کے جال میں لے لیا۔ بات یہ تھی کہ اس لڑکی کے دل میں اس منشی کی محبت پیدا ہوگئی تھی۔ ایک تو یہ بغاوت تھی جو بیٹی نے ماں کے خلاف کی اور دوسری بغاوت یہ تھی کہ لڑکی نے ماں کو صاف جواب دے دیا کہ وہ اس ٹھیکیدار کے ساتھ شادی نہیں کرے گی خواہ وہ ساری دنیا کے خزانے میرے قدموں میں ڈھیر کر دے۔ ماں نے بیٹی کو پیار سے سمجھانے کی بجائے اس پر تشدد شروع کر دیا۔ ماں کو یہ بھی پتہ چل گیا تھا کہ لڑکی منشی کو چاہنے لگی ہے۔ وہ لڑکی کو مارتی پیٹتی تھی اور کہتی تھی کہ منشی کے ساتھ بات تک نہ کرے۔

اس عورت کے اس انکشاف سے میرے ذہن میں ایک اور شک آ گیا۔ منشی یقیناً اس لڑکی کو ہی پسند کرتا ہوگا۔ لڑکی نے اس طرح اپنے گھر بلانا شروع کر دیا ہوگا کہ آدھی رات کو اس کے والدین محوِ خواب ہوتے ہیں اور وہ یعنی منشی فلاں وقت بیٹھک کے سامنے آ جایا کرے اور لڑکی دروازہ کھول دیا کرے گی۔ پہلے دو مرتبہ منشی لڑکی سے ملنے آیا ہوگا۔ چوکیدار نے اسی کو دیکھا ہوگا۔ اب پھر آیا اور لڑکی کی ماں کی یعنی مقتولہ کی آنکھ کھل گئی اور لڑکی کو کمرے میں نہ پا کر بیٹھک میں جا نکلی اور وہاں بیٹی اور منشی کو اکٹھے دیکھ لیا۔ وہاں یہی ہوا ہوگا کہ منشی نے مقتولہ کا گلا گھونٹ دیا اور اس میں مقتولہ کی اس بیٹی کی رضامندی شامل ہو گی۔

میں نے یہ اور دیگر شکوک ذہن میں محفوظ کر لیے تھے اور میں اب اس کوشش میں تھا کہ شہادت مل جائے تو میں ان مشتبہوں کو پکڑوں۔ بغیر شہادت شاملِ تفتیش کرنے کا نقصان یہ تھا کہ یہ چوکنے ہو جاتے اور اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیتے۔ ابھی میں انہیں یہی تاثر دیئے جا رہا تھا کہ مجھے ان پر ذرا سا بھی شک نہیں۔

اس عورت سے میں نے پوچھا کہ مقتولہ اگر اتنی ہی عیاش اور بدکار تھی اور اس نے

اپنے بدھو خاوند کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی تھی تو مقتولہ کے ناجائز مراسم کسی اور کے ساتھ بھی ہوں گے...... اس عورت نے ایک آدمی کا نام لیا جسے میں جانتا تھا۔ وہ کوئی صاحب حیثیت نہیں تھا بلکہ اس قصبے کا ایک بدمعاش تھا، جواری اور شرابی کبابی تھا۔ وہ کوئی جرائم پیشہ نہیں تھا لیکن ہر جرم کرنے کی استطاعت رکھتا تھا اور ہر برا کام کرتا تھا لیکن معاشرے میں یعنی لوگوں میں اس نے اپنی ایک قابل عزت حیثیت بنا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں چند ایک جرائم پیشہ اشخاص تھے۔ وہ قوم اور مذہب کا عیسائی تھا اور اس کا نام ولسن تھا اور لوگ اسے ولی کہتے تھے...... اس عورت نے بتایا کہ ولسن کے ساتھ مقتولہ کے تعلقات اس وجہ سے تھے کہ مقتولہ کو ایک محافظ کی ضرورت تھی اور یہ وجہ بھی تھی کہ کوئی شخص مقتولہ کے خلاف کوئی بات زبان پر نہ لا سکے۔ اس عورت نے بتایا کہ ولسن مقتولہ کے بارے میں کچھ اور باتیں بتا سکتا ہے۔

یہ عورت تو مجھے ایسی روشنی دے گئی کہ ڈھکے چھپے راز سامنے آ گئے۔ اس نے کچھ اور باتیں بھی بتائی تھیں۔ مجھے یاد نہیں کہ اسی روز یا اگلے روز یا نہ جانے کبھی رات کے وقت میں نے ولسن کو تھانے بلایا اور وہ جب تھانے میں آیا تو مجھے یوں ملا جیسے ہم ہجولی ہوں اور ہمراز دوست...... اسے غالباً یہ احساس نہیں تھا کہ میں نے اسے مشتبہوں کی فہرست میں رکھ لیا ہے۔

میں اس شک میں حق بجانب تھا کہ یہ شخص منشی کا رقیب تھا اور منشی اسے اپنا رقیب سمجھتا تھا۔ منشی کے خلاف کچھ کر نہ سکا اور مقتولہ کو قتل کر دیا۔

''تمہاری محبوبہ تو ماری گئی ہے ولی!''—— میں نے بے تکلف دوستوں کے لہجے میں کہا—— ''تمہیں تو بہت ہی افسوس ہوگا''۔

''محبوبہ!''—— اس نے طنزیہ لہجے میں کہا اور ہنس پڑا، پھر بولا—— ''وہ محبوبہ تھی تو نہ جانے کس کس کی تھی۔ نہیں تھی تو کسی کی بھی نہیں تھی۔ چالیس برس سے اوپر تو اس کی عمر تھی۔ میرے ساتھ اس کا تعلق بس اتنا ہی تھا کہ میری بیوی جب کبھی میکے چلی جاتی تھی تو اس کے ساتھ دوستی شروع ہو جاتی تھی۔ اس کا اصل مسئلہ اس کا خاوند تھا۔ بعد میں اس کے خاوند نے دیکھ لیا ہوگا۔ اس خاوند سے وہ نفرت کیا کرتی تھی۔ اس نے کئی بار کہا کہ اسے خاوند کے جسم سے بدبو آتی ہے۔ ویسے بھی آپ نے دیکھا ہوگا کہ اس عجیب وغریب آدمی کو کون سی عورت

پسند کرے گی!''

اس شخص نے بھی وہی باتیں کیں جو چوکیدار کی لائی ہوئی عورت تفصیل کے ساتھ مجھے سنا گئی تھی۔ اس عورت نے اس نفرت اور حقارت کا ذکر کھل کر کیا تھا جو مقتولہ کے دل میں اپنے خاوند کے خلاف تھی۔ اس عورت نے یہ بھی بتایا تھا کہ مقتولہ اپنے خاوند کو اتنا خوش رکھتی تھی کہ وہ اس کے آگے پیچھے بچھ بچھ جاتا تھا۔

ولسن کو مقتولہ نے خود بتایا تھا کہ فلاں ٹھیکیدار اسے بیٹی کے بائیس ہزار روپے نقد دے رہا ہے لیکن بیٹی نہیں مانتی...... ولسن نے خاص طور پر بتایا کہ پنڈت شردھانند کا منشی لائق علی اس کا دوست ہے اور وہ اسے بتاتا رہتا تھا کہ وہ مقتولہ کے گھر دوسرے تیسرے روز جایا کرتا ہے۔ ولسن کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مقتولہ نے لائق علی کو زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ لائق علی ولسن کو ہر بات بتاتا رہتا تھا۔

''میری کچھ مدد کرو ولی''—— میں نے ولسن سے مشورہ لینے کی خاطر کہا—— ''قاتل کون ہو سکتا ہے اور قتل کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟''

''حضور راؤ صاحب!''—— ولسن نے پُر اعتماد لہجے میں جواب دیا—— ''یہ تو ذہن سے نکال دیں کہ قتل رقابت کی وجہ سے ہوا ہے۔ کوئی شخص اس عورت کی خواہش نہیں کرتا تھا بلکہ یہ عورت خود اپنی پسند کے آدمی کے ساتھ دوستی کی خواہش کیا کرتی تھی۔ البتہ اس کی بیٹی کی بات کریں۔ لائق علی میرا دوست ہے، میں اس کے خلاف کوئی شبہ پیدا کرنے کے حق میں نہیں ہوں۔ یہ بات ضرور کہوں گا کہ مقتولہ کی بیٹی لائق علی کو دل دے بیٹھی تھی۔ لائق علی نے مجھے خود بتایا تھا۔ یہ بھی ذہن سے نکال دیں کہ اس ٹھیکیدار نے کچھ رقم پیشگی دے دی ہو گی اور یہ رقم مقتولہ نے ہضم کر لی ہوگی۔ اس کی بیٹی تو مانتی ہی نہیں تھی اور ماں اسے مارتی پیٹتی تھی''۔

''لائق علی کیسا آدمی ہے؟''—— میں نے پوچھا—— ''جواب دینے سے پہلے یہ سوچ لو ولی! میں صحیح بات تمہارے منہ سے سننا چاہتا ہوں۔ اپنے دوست کی بے جا تعریف نہ کرنا۔ سوچ لو میرا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی تعلق ہے اور تم جانتے ہو میں کیا کر سکتا ہوں''۔

ولسن میرا اشارہ سمجھ گیا جو دراصل شریفانہ انداز میں ایک دھمکی تھی۔ اس نے میری

بات رکھ لی اور یہ بتایا کہ لائق علی ایک اچھا اور مخلص دوست ہے لیکن جہاں وہ چار سو بیسی کرنے کا ارادہ کر لے تو پھر اس کی عقل تک ہم جیسوں کے فرشتے بھی نہیں پہنچ سکتے۔ مختصر یہ کہ وہ کایاں اور استاد آدمی ہے۔

ولسن میرے شکوک کی تائید کر گیا اور اس عورت نے جو انکشافات کئے تھے، ان کی بھی تصدیق کر گیا۔ اب منشی لائق علی کے ساتھ مقتولہ کی بیٹی بھی مشتبہوں کی فہرست میں آ گئی تھی۔ اس لڑکی کا نام ارملا دیوی تھا۔ میں نے ان دونوں کو شامل تفتیش کرنا ہی تھا لیکن سوچا کہ مقتولہ کے خاوند پنڈت شردھانند اور اس کے بیٹے کے ساتھ پہلے کچھ باتیں کر لوں۔ اگر مجھے صحیح یاد ہے تو قتل کو چار پانچ دن گزر گئے تھے۔ پہلے روز خاوند اور اس کا بیٹا اس حالت میں نہیں تھے کہ ان سے میں ہر بات پوچھ سکتا۔ بیٹا تو ابھی ویسے بھی چھوٹا تھا۔ بارہ تیرہ سال تو اس کی عمر تھی، رو رو کر اس کی ہچکی بندھی ہوئی تھی۔

مقتولہ کا خاوند تو یہ معلوم کرنے کے لیے تھانے آتا ہی رہتا تھا کہ قاتل کا کوئی سراغ ملا ہے یا نہیں۔ حسب معمول وہ آ گیا اور میں نے اسے کہا اپنے بچے کو بھی ساتھ لے آئے...... وہ بیٹھا بھی نہیں اور واپس چلا گیا...... کچھ دیر بعد اپنے بچے کو ساتھ لے کر آ گیا۔ میں نے بچے کو باہر بٹھا دیا اور پنڈت کو اپنے دفتر میں بٹھایا۔ وہ اشکوں بھری آنکھوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے اس پر غصہ آ گیا، بلکہ حقارت آمیز غصہ کہوں تو زیادہ مناسب ہو گا۔

''اب میری باتیں غور سے سنو پنڈت جی مہاراج!''___ میں نے کہا___ ''کاروبار کی اپنی جگہ اہمیت ہے جسے میں تسلیم کرتا ہوں لیکن انسان کو خصوصاً اس انسان کو جو باپ بھی ہو اور خاوند بھی، گھر کا بھی کچھ خیال کرنا چاہئے۔ میں نے اتنے دن آپ کو نہیں چھیڑا کہ آپ غم زدہ ہیں لیکن میں آرام سے نہیں بیٹھا رہا، آپ کے گھر کے بارے میں معلومات اکٹھی کرتا رہا ہوں۔ آپ نے اپنی بیوی کو لگام نہ ڈالی جس کا نتیجہ آپ دیکھ رہے ہیں۔ مجھے اس سے کوئی غرض واسطہ نہیں کہ آپ کے گھر کے حالات کیا تھے اور کیوں تھے اور آپ نے ان کی طرف توجہ کیوں نہ دی، میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی بیوی کیوں اور کس کے ہاتھوں قتل ہوئی۔ کیا آپ کو اپنی بیوی پر اعتماد تھا؟''

''میں بیوی کے ہاتھوں مجبور ہو گیا تھا''___ اس نے جواب دیا___ ''مجھے میری

جاتی کے تین چار آدمیوں نے کہا تھا کہ میری بیوی بدنام ہو رہی ہے اور میں اسے گھر میں پابند کروں لیکن جناب! میں جب گھر آتا تھا تو بیوی میرے آگے اس طرح بچھ بچھ جاتی تھی جیسے بیوی نہ ہو میری نوکرانی ہو۔ میرے ساتھ اتنا پیار کرتی تھی کہ میں اپنے دل سے کہتا تھا کہ جو لوگ اس بیوی کو بدنام کرتے ہیں، وہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس نے میرے ساتھ لڑائی جھگڑا تو دور کی بات ہے، اونچی آواز میں بھی کبھی بات نہیں کی تھی''۔

''کیا آپ کو اس منشی پر بھی اعتماد تھا؟''___ میں نے پوچھا___ ''کیا آپ ہر روز یا ایک دو دن چھوڑ کر اسے اپنے گھر بھیجتے تھے؟''

''نہیں حضور!''___ اس نے کہا___ ''میں اسے ہر روز یا ایک دو دن چھوڑ کر نہیں بھیجتا تھا بلکہ آٹھویں دسویں روز کسی ضروری کام کے لیے بھیجا کرتا تھا۔ یہ صحیح ہے کہ مجھے اس پر سولہ آنے اعتماد تھا۔ کبھی رقم گھر لے جا کر رکھنی ہوتی تھی اور کبھی گھر سے رقم دکان پر منگوانی ہوتی تھی۔ یہ منشی پیسے میں ہیرا پھیری نہیں کرتا تھا''۔

''اب یہ بتائیں پنڈت جی!''___ میں نے پوچھا___ ''کیا اس ٹھیکیدار سے آپ نے کچھ رقم پیشگی لی تھی جس کے ساتھ اپنی بیٹی کا بائیس ہزار روپے پر سودا کیا تھا؟''

''نہیں حضور!''___ اس نے جواب دیا___ ''پیشگی تب لیتے کہ ہماری بیٹی مان جاتی۔ بیٹی تو بالکل ہی باغی ہو گئی تھی...... ماں نے اسے مارا پیٹا بھی اور ہر جتن کر دیکھا لیکن وہ انکار پر ہی قائم رہی''۔

جس طرح مقتولہ نے ہر جتن کر ڈالا تھا اور بیٹی انکار پر ہی قائم رہی، اسی طرح میں نے پنڈت شردھانند پر ہر جتن کر ڈالا، اس کی زبان پر کوئی نئی بات نہ آئی۔ وہ ان ہی باتوں کی تصدیق کرتا رہا جو مجھے پہلے ہی معلوم ہو چکی تھیں۔ یہ پنڈت نہ کسی پر شک بتاتا تھا نہ کوئی ایسا اشارہ دے رہا تھا جس کا تجزیہ کر کے میں کسی سراغ پر پہنچ جاتا۔ اس شخص کے بارے میں میری رائے پختہ ہو گئی کہ اصل اُلو کا پٹھا ہے اور بیوی اس کی آنکھوں میں دھول جھونکتی رہی ہے۔

میں نے اسے کہا کہ اپنے بچے کو اندر لے آئے۔ بچہ آیا تو میں نے اور پنڈت نے لل کے ساتھ بہت پیار کیا اور بہلا پھسلا کر بیان دینے کے لیے تیار کر لیا۔ پنڈت کو میں نے باہر نکال دیا۔ اس بچے کے ساتھ خاصی دماغ سوزی کرنی پڑی۔ اس نے جو باتیں بتائیں، ان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس نے ایک روز کا واقعہ یوں سنایا کہ منشی ان کے

ہاں اس وقت جاتا تھا جب یہ بچہ سکول گیا ہوا ہوتا تھا۔ لڑکی ارملا بھی سکول جاتی تھی۔

بچے نے بتایا کہ ایک روز وہ سکول سے ذرا جلدی واپس آ گیا۔ اس نے سونے کے کمرے کا دروازہ بند دیکھا تو اسے کھولنا چاہا لیکن اندر سے بند تھا۔ اس نے دروازے پر ہاتھ مارا تو دروازہ کھلا۔ اندر سے منشی اور اس کی ماں باہر آئی۔

اپنی بہن ارملا کے بارے میں اس نے بتایا کہ ماں اسے مارتی پیٹتی اور کہتی تھی آئندہ اس کے ساتھ بات بھی کی تو جان سے مار ڈالوں گی...... میں نے بچے سے پوچھا کہ تمہاری ماں تمہاری بہن کو کس سے ملنے سے روکتی تھی؟ بچے نے بتایا کہ اسے معلوم نہیں، شاید منشی سے ملنے سے روکتی تھی۔ بچے نے یہ بھی بتایا کہ اس کی بہن نے اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے دو تین موقعوں پر اپنی ماں کے بارے میں کہا تھا کہ خود اسے کمرے میں لے جا کر کمرہ بند کر لیتی ہے اور مجھے کہتی ہے کہ اس کے ساتھ بات نہ کرو اور ملیچھ ماں مجھے بڈھے کے ساتھ بیاہنا چاہتی ہے۔ بچے نے یہ بھی بتایا کہ ارملا نے چار پانچ مرتبہ کہا تھا کہ میں اس گھر سے ہی بھاگ جاؤں گی۔

میں نے باپ بیٹے کو رخصت کر دیا اور سوچوں میں کھو گیا۔ میں نے پہلے کہا ہے کہ یہ واردات میری فہم و فراست کی کڑی آزمائش بن گئی تھی۔ میرے ہاتھ میں اب پنڈت کا منشی لائق علی رہ گیا تھا اور پنڈت کی بیٹی ارملا۔ انگریزوں کے دور حکومت میں قتل اور ڈاکہ زنی جیسی وارداتوں کو آج کی طرح گول نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قتل کی تفتیش تو دن رات کرنی پڑتی تھی۔ انگریز افسر سر پر سوار رہتے تھے۔ میرے لیے ایک بڑا ہی خطرناک مسئلہ یہ تھا کہ میں مسلمان تھا اور قتل ہونے والی ایک ہندو کی بیوی تھی۔ میں نے آپ کو بتایا ہی نہیں کہ آڑھت کی منڈی کے سرکردہ ہندو کس طرح وفد کی صورت میں میرے پاس آتے اور قاتل کو پکڑنے کا مطالبہ کرتے تھے۔ وہ مجھے نوکری سے ہی نکلوا سکتے تھے۔

یہ روئیداد چلانے سے پہلے اپنے قارئین کرام سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ ہر تھانیدار کی سروس وارداتوں کی تفتیش کرتے گزر جاتی ہے۔ اکثر وارداتیں ایک جیسی ہی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک آدمی قتل ہو گیا، تھانیدار نے تفتیش کی اور قاتل کو پکڑ لیا، مقدمہ چلا، اسے سزا ہوئی اور آخر ہائی کورٹ میں سزا بحال رہی یا وہ بری ہو گیا۔ دوسری وارداتوں میں بھی ایسے ہی ہوتا تھا لیکن میں صرف وہ وارداتیں سنانا چاہتا ہوں جن میں کوئی ندرت اور

انوکھا پن ہو۔ میں نے آپ کو پہلے جو کہانی سنائی ہے، آپ نے وہ پڑھ کر محسوس کیا ہو گا کہ وہ جرم اور سراغرسانی کی کہانیوں سے الگ تھلگ تھی اور اس میں ایک عجوبہ تھا۔ اب یہ کہانی جو آپ کو سنا رہا ہوں، اس میں بھی آپ ایک چونکا دینے والی نئی بات دیکھیں گے۔

اب میں نے پنڈت کے منشی لائق علی اور اس کی بیٹی ارملا کو شامل تفتیش کرنا تھا۔ یہ کام فوراً کر لیتا تو اچھا تھا لیکن ایک اور واردات آ گئی اور میں ایسا الجھا کہ دو دن اسی میں پھنسا رہ گیا۔ اس کے بعد اگلے روز صبح تھانے گیا تو پنڈت شردھانند کو ایک جواں سال آدمی کے ساتھ اپنا منتظر پایا۔ مجھے دیکھتے ہی پنڈت بچوں کی طرح رو پڑا۔ میں سمجھا کہ روزمرہ کی طرح آیا ہے اور آج بے چارہ کچھ زیادہ ہی مغموم ہے۔ میں نے اسے کہا، حوصلہ کریں مہاراج، مرنے والی تو واپس نہیں آئے گی، اس کے قاتل کو ایک دو دنوں میں پکڑ کر لٹکا دوں گا۔

"حوصلہ کیسے کروں جناب!" ـــــ اس نے سسکتے ہوئے کہا ـــــ "بیٹی لاپتہ ہو گئی ہے"۔

میں تو جہاں تھا وہیں سن ہو کے رہ گیا۔ اس کی بیٹی کی تو مجھے ضرورت تھی لیکن وہ لاپتہ ہو گئی تھی۔ میں نے پوچھا کہ وہ کس طرح لاپتہ ہوئی ہے، کیا اغوا ہو گئی ہے؟

"نہیں حضور!" ـــــ اس نے جواب دیا ـــــ "اغوا ہوئی ہوتی تو اتنا ڈھیر سارا زیور اور تین ہزار روپیہ ساتھ نہ لے جاتی"۔

میں نے یہ سنا تو میرا دھیان فوراً پنڈت کے منشی کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ منشی کہاں ہے؟ کیا وہ بھی گھر سے غیر حاضر ہے؟

"نہیں حضور!" ـــــ اس نے کہا ـــــ "اس بے چارے نے کہاں جانا ہے۔ یہ میرے ساتھ ہے ہر مشکل اور مصیبت میں یہی میرا ساتھ دیتا ہے"۔

میں منشی کو پنڈت کے ساتھ دیکھ کر پریشان ہو گیا بلکہ مجھے کہنا یوں چاہئے کہ اسے اپنے سامنے دیکھ کر مایوسی ہوئی۔ اگر پنڈت یہ کہتا کہ اس کی بیٹی کے ساتھ اس کا منشی بھی لاپتہ ہو گیا ہے تو میں سمجھ لیتا کہ اس کی بیٹی منشی کے ساتھ چلی گئی ہے۔ اگر منشی یہیں تھا تو پھر اس کی بیٹی کس کے ساتھ گئی؟...... میں نے منشی لائق علی کو بڑے غور سے دیکھا۔ اس علاقے کے لوگوں کے رنگ عام طور پر سانولے تھے لیکن لائق علی کا رنگ کھلتا ہوا گندمی تھا اور اس رنگ کو لوگ بڑا اچھا اور پُرکشش رنگ کہا کرتے تھے۔ چہرے مہرے اور جسم کے لحاظ سے

بھی لائق علی جاذب نظر تھا۔ اگر ارملا جیسی حسین لڑکی اس جوان کو چاہتی تھی تو یہ کوئی عجیب بات نہیں تھی۔

میں نے منشی اور پنڈت کے ساتھ آئے آدمی کو باہر بھیج دیا اور پنڈت سے پوچھا کہ اسے کب اور کس طرح پتہ چلا تھا کہ لڑکی لاپتہ ہے۔ اس نے بتایا کہ وہ صبح اپنے روزمرہ وقت پر اٹھا اور بچوں کے کمرے میں گیا تو وہاں صرف بچہ سویا ہوا تھا اور ارملا نہیں تھی۔ کچھ دیر انتظار کیا، غسل خانے میں دیکھا، اوپر کی منزل میں دیکھا لیکن وہ کہیں بھی نہیں تھی۔ پھر پنڈت نے باہر والا دروازہ دیکھا۔ وہ کھلا ہوا تھا۔ اسے شک ہوا تو وہ دوڑتا ہوا واپس آیا اور اس کمرے میں گیا جس کمرے کی ایک الماری میں زیورات اور رقم رکھی ہوتی تھی۔ اس نے دیکھا کہ جو زیورات ارملا کے لیے تیار کروائے گئے تھے وہ غائب تھے اور رقم میں سے تین ہزار روپیہ کم تھا۔ سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ یہ زیورات اور کیش ارملا اپنے ساتھ لے گئی ہے...... آج تین ہزار روپیہ کوئی رقم ہی نہیں سمجھی جاتی لیکن جس وقت کا یہ وقوعہ ہے اس وقت کا تین ہزار روپیہ آج کے تین لاکھ کے برابر تھا۔

پنڈت نے بیان دیتے ہوئے پہلی بار اقرار کیا کہ اسے اپنے اس منشی پر شبہ تھا۔ وہ اس توقع پر منشی کے گھر گیا کہ منشی اپنے گھر نہیں ہوگا لیکن منشی اپنے گھر سویا ہوا ملا۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر نکلا۔ پنڈت کو کم از کم یہ اطمینان ہو گیا کہ وہ اگر اس منشی پر اعتماد کرتا ہے تو غلط نہیں کرتا۔

اس قسم کے وقوعہ کی تفتیش میں قدرتی طور پر جو سوال فوراً دماغ میں آتے ہیں، وہ میں نے پنڈت سے پوچھے لیکن وہ تو ہر سوال کے جواب میں کوری سلیٹ دکھا دیتا تھا۔ منشی پر شبہ کرنے کی بجائے وہ اس کی تعریف اور اس کے اعتماد کی بات کرتا تھا اور کسی پر شک و شبہ کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ اسے تو جیسے اس دنیا سے ذرا سی بھی واقفیت نہیں تھی۔ وہ اندر باہر سے تاجر اور بنیا تھا جس کا دھرم صرف پیسہ تھا۔ کتنا پیسہ آیا، کتنا گیا، منافع کتنا ہوا اور کیا منافع زیادہ ہو سکتا ہے۔ اس کی دلچسپیاں بس اسی تنگ سے دائرے میں محدود تھیں۔ کبھی تو وہ مجھے اس طرح نظر آتا تھا جیسے وہ اس معاشرے میں ہی نہیں بلکہ اس دنیا میں اجنبی ہو اور بھولے بھٹکے ادھر آ نکلا ہو۔

اسے باہر بھیجا اور اس کے بچے کو بلایا۔ بچے نے بھی کوئی کام کی بات نہ بتائی۔ وہ تو بے چارہ بلک بلک کر روتا تھا۔ اس کی ماں قتل ہو گئی تھی اور ایک بہن رہ گئی تھی وہ نہ جانے

کدھر کھو گئی۔ بچے کو باہر بھیجا اور منشی کو بلایا۔

میرے ذہن میں ایک شک ابھرتا تھا۔ وہ یہ تھا کہ ارملا اس منشی کے ساتھ گئی ہوگی۔ منشی نے اسے اپنے کسی دوست کے گھر چھپا دیا ہوگا یا اپنے کسی دوست کے ساتھ باہر بھیج دیا ہوگا۔ میں نے اس شک کا تجزیہ کیا تو عملاً مجھے یہ ناممکن نظر آیا۔ وہ ہندوؤں کی غالب اکثریت کا علاقہ تھا۔ مسلمان بہت تھوڑے تھے جن میں زیادہ تر غریب اور مزدور تھے اور کچھ گھرانے مڈل کلاس کے تھے۔ کوئی مسلمان یہ جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ اتنے مالدار تاجر کی بیٹی کو کہیں چھپا لیتا۔

میں نے منشی لائق علی سے مقتولہ کے بارے میں بات کی تو اس نے کچھ بھی نہ چھپایا اور کہا کہ مقتولہ اسے ایک نوکر سمجھ کر ہر طرح استعمال کرتی تھی۔ منشی کو اس کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ مقتولہ کے تعلقات اور کس کس کے ساتھ تھے؟...... منشی لائق علی نے ولسن کا نام لیا اور ساتھ یہ بھی کہا کہ ولسن اس کا دوست ہے۔

اس کے بعد منشی نے مقتولہ کے بارے میں وہی باتیں بتائیں جو ولسن نے میرے ساتھ کی تھیں۔ اس نے کہا کہ کوئی ایسی بات نہیں تھی جس پر کوئی شخص رقابت کے جذبے کے تحت کسی کو یا مقتولہ کو ہی قتل کر دیتا۔

''ارملا کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔

''وہ مجھے چاہتی تھی''۔۔۔ منشی نے جواب دیا۔۔۔ ''اور میرے دل میں اس کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ تو میرے ساتھ شادی کا ارادہ کر چکی تھی لیکن میں ڈرتا تھا۔ اگر یہ ہندو لڑکی میری محبت کی خاطر مسلمان ہو جاتی تو یہاں کے ہندو شہر کے مسلمانوں پر حملہ کر دیتے اور خون خرابہ ہو جاتا۔ آپ تو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں کہ ایسے واقعات ہو چکے ہیں۔ مسلمان لڑکی کو ہندو اگر اغوا کر کے ہندو بنا لیں اور کسی کے ہندو کے ساتھ بیاہ دیں تو کچھ نہیں ہوتا لیکن کوئی ہندو لڑکی اپنی رضا اور رغبت سے مسلمان ہو کر مسلمان کے ساتھ شادی کر لے تو ہندو اسے اپنے دھرم کی توہین کہہ کر مسلمانوں کے گھروں کو آگ لگا دیتے ہیں اور پھر جو تباہی بپا کرتے ہیں وہ آپ جانتے ہیں''۔

مقتولہ کے بارے میں مزید بات ہوئی تو منشی نے بتایا کہ مقتولہ صرف اپنی بیٹی کو ہی مارتی پیٹتی نہیں تھی بلکہ اس نے منشی کو بھی دھمکی دی تھی کہ وہ اس کی بیٹی سے نظریں ہٹا لے

ورنہ وہ اسے مروا دے گی۔

یہ تو میرا مشاہدہ ہے کہ کوئی عورت خود کتنی ہی عیاش اور بدکردار کیوں نہ ہو جائے، اپنی بیٹی پر بڑی سخت پابندیاں عائد کر دیتی ہے کہ وہ مردوں سے دور رہے اور اپنے آپ کو پاکیزہ رکھے۔ یہی حالت مقتولہ کی تھی۔

منشی کے بولنے کا انداز پختہ اور پُراعتماد تھا۔ وہ اپنی عمر سے زیادہ عقل کی باتیں کرتا تھا اور اس نے مجھے یہ تاثر دیا کہ دُنیا میں اس نے بہت کچھ دیکھا ہے اور اس کی رائے معقول ہوتی ہے جس کی کوئی تردید نہیں کر سکتا۔ میں نے منشی پر ایسے سوالوں کی بوچھاڑ کی کہ اسے کھنگال ڈالا لیکن وہ پورے اعتماد کے ساتھ ہر سوال کا جواب دیتا رہا۔ اس نے ارملا کی گمشدگی کے بارے میں آخری رائے یہ دی کہ ارملا نے اس کے ساتھ گھر سے بھاگنا تھا لیکن یوں لگتا ہے جیسے وہ درپردہ کسی اور کے ساتھ رابطہ رکھے ہوئے تھی اور اس کے ساتھ چلی گئی ہے۔ منشی نے یہ بھی کہا کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ارملا اکیلی ہی نکل گئی ہو۔

منشی لائق علی نے مجھے متاثر تو کر لیا تھا لیکن میں نے ذہن میں اسے مشتبہ کی حیثیت ہی دیئے رکھی اور اسے یہ تاثر دیا کہ مجھے اس پر شک نہیں۔ میں پنڈت کے ساتھ اس کے گھر چلا گیا۔ میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ اس مکان میں کسی اور طرف سے داخل ہونے کا راستہ ہے یا نہیں۔ موہوم سا شک ہوتا تھا کہ لڑکی کو زبردستی اغوا کیا ہو گا۔ میں اس مکان میں اس وقت آیا تھا جب مقتولہ قتل ہوئی تھی لیکن اس وقت مکان کو زیادہ غور سے نہیں دیکھا تھا۔ اب دیکھا تو مجھے ایسا کوئی راستہ نظر نہ آیا جدھر سے کوئی اندر آیا ہو یا اوپر سے نیچے اترا ہو اور سوئی ہوئی لڑکی کو اٹھا کر اور الماری سے کچھ زیورات اور کچھ رقم لے کر صدر دروازے کے راستے نکل گیا ہو۔ اس کام کے لیے دو یا تین آدمیوں کی ضرورت تھی۔

میں اس کمرے میں گیا جہاں ارملا رات سوئی تھی۔ پہلی چیز یہ دیکھی کہ اس نے رات جو کپڑے پہنے تھے وہ اس کی چارپائی پر پڑے ہوئے تھے اور پنڈت نے دیکھ کر مجھے بتایا کہ وہ کپڑے تبدیل کر کے گئی ہے۔ پھر میں نے اس کی چارپائی کے چاروں طرف دیکھا۔ اگر اسے زبردستی لے جایا گیا ہوتا تو اس کی جوتی یا چپل چارپائی کے پاس پڑی ہوئی ملتی۔

تھانے واپس آ کر میں نے پہلی کارروائی یہ کی کہ اردگرد کے تھانوں کے لیے ایک نوٹس تحریر کیا جسے پولیس کی زبان میں اشتہار شور وغوغا کہا جاتا ہے اور انگریزی میں اسے

Hue and cry نوٹس کہتے ہیں۔ اس نوٹس کی بہت سی نقلیں تیار کر کے اردگرد کے تھانوں کو بھیج دی جاتی ہیں۔ یہ ایک خاص قاعدے اور ضابطے کے تحت نوٹس تیار ہوتا ہے جس کی تفصیلات میں جانا بے محل ہو گا۔ اس کے علاوہ میں نے اردگرد کے تھانوں کو بذریعہ ٹیلی فون اطلاع دے دی۔ نوٹس میں اور زبانی فون پر بات کرتے ہوئے ارملا کا حلیہ وغیرہ واضح بتایا گیا تھا۔

میں نے ایک کارروائی یہ بھی کی کہ دو مخبروں کو بلا کر بتایا کہ انہیں منشی لائق علی کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی ہے اور رات کے وقت اسے زیادہ دیکھنا کہ وہ کہاں کہاں جاتا ہے اور ہو سکتا ہے کہ کسی وقت اسے گمشدہ لڑکی کے ساتھ دیکھ لیا جائے۔

میں نے جو مزید کارروائیاں کیں، ان کی تفصیلات اس کہانی کو طویل کر دیں گی اس لیے ان کا ذکر مناسب نہیں۔ یہ شک ایک یقین کی صورت میں میرے ذہن میں اٹک گیا تھا کہ مقتولہ کا قتل اور اس کی بیٹی کی گمشدگی ایک ہی واردات کی دو کڑیاں ہیں۔ مجھے اس ٹھیکیدار پر بھی شک تھا جس کے ساتھ ارملا کا سودا ہوا تھا لیکن یہ شک خاصا کمزور تھا کیونکہ تقریباً یہ ثابت ہو چکا تھا کہ لڑکی کو اٹھایا نہیں گیا بلکہ لڑکی پوری تیاری کے ساتھ گھر سے خود گئی ہے۔

سرکردہ ہندوؤں کا ایک وفد انگریز ڈی ایس پی کے ہاں جا پہنچا اور یہ شکایت کی کہ تھانے دار تفتیش میں کوتاہی برت رہا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ابھی تک وہ قاتل کو نہیں پکڑ سکا اور مقتولہ کی بیٹی کو اغوا کر لیا گیا ہے...... انگریز کانوں کے اتنے کچے نہیں تھے۔ میں نے ڈی ایس پی کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا تھا۔ اس نے ان ہندوؤں کو تسلی و تشفی دے کر رخصت کر دیا اور مجھ سے پوچھا کہ تفتیش کس پوزیشن میں ہے۔ میں نے اسے پوری کہانی سنا دی اور اپنی جو کاوش تھی اس کی تفصیل بھی سنائی۔ وہ مطمئن ہو گیا اور اس نے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ راؤ، احتیاط کرنا، تم مسلمان ہو اور یہ ہندو تمہارے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ یہ کہہ کر ڈی ایس پی نے مجھے حوصلہ دیا اور یہ بھی کہا کہ میں کوشش جاری رکھوں اور وہ اپنا ہاتھ میرے سر پر رکھا رہنے دے گا۔

میرے سر پر تو اللہ کا ہاتھ تھا اور اسی کی ذاتِ باری نے میری مدد کی۔ مدد یوں کی کہ میں نے جن تھانوں کے تھانیداروں کے ساتھ فون پر رابطہ کیا تھا، ان میں سے ایک کا فون آ گیا۔ وہ علی پور کے قصبے کا ایس ایچ او تھا جس نے فون کیا تھا۔ یہ سب انسپکٹر منوہر کشن تھا اور وہ پٹنہ کا

رہنے والا تھا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ وہ میرا دوست تھا لیکن کبھی اچھی سلام و دعا تھی۔ تھانیدار ویسے بھی ایک دوسرے کے ساتھ خطرے مول لے کر بھی تعاون کیا کرتے تھے۔

”راؤ بھیا!“ — منوہر کشن نے فون پر کہا — ”تمہاری ایک عورت قتل ہو گئی ہے!...... میرے پاس فوراً پہنچو، تمہیں قاتل دوں“۔

میں نے تفصیل پوچھی کہ وہ بتائے کہ وہ کون ہے، کہاں ہے لیکن منوہر کشن نے کہا کہ فون پر بتانے کی بات نہیں تم فوراً میرے پاس پہنچو...... علی پور مجھ سے خاصا دور تھا۔ دور اور نزدیک کا معاملہ نہیں تھا، معاملہ یہ تھا کہ ایسے ہو نہیں سکتا کہ کسی تھانے کا ایس ایچ او اپنے آپ ہی اٹھ کر چل پڑے اس کے لیے اوپر سے اجازت لینی ہوتی ہے اور اس کا جواز بھی پیش کرنا پڑتا ہے۔ بہر حال میں نے یہ انتظامات کر لیے اور ایک کانسٹیبل لے کر روانہ ہو گیا۔ دن بھر کا ریل کا سفر تھا۔

میں شام کو وہاں پہنچ گیا اور ریلوے سٹیشن سے سیدھا تھانے چلا گیا۔ منوہر کشن ابھی تھانے میں ہی تھا۔ بڑے تپاک سے ملا اور اپنے ایک مسلمان کانسٹیبل کو بھیج کر میرے لیے اور کانسٹیبل کے لیے بڑا ہی پُر تکلف کھانا منگوایا۔ کھانے کے دوران باتیں ہوتی رہیں لیکن وہ ابھی بتا نہیں رہا تھا کہ وہ قاتل کہاں ہے۔

کھانے کے بعد وہ مجھے اپنے گھر لے گیا اور کہا کہ میں وردی اتار کر ذرا نہالوں اور کپڑے بدل لوں۔ میں اپنے کانسٹیبل کو کانسٹیبلوں کی بارک میں چھوڑ آیا تھا۔ میں نے وردی اتاری نہایا اور کپڑے بدل لئے تب منوہر کشن نے بات شروع کی۔ اس نے کہا کہ تمہاری ایک لڑکی بھی لاپتہ ہے۔ میں حیران کہ اسے قتل کی اور لڑکی کی گمشدگی کی اطلاع کس نے دی ہے اور یہ کیا ڈرامہ کھیل رہا ہے۔ اس نے کہا کہ وہ لڑکی تمہیں مل سکتی ہے۔ اگر اسے پولیس کے قانون اور قاعدے کے مطابق برآمد کراؤ گے تو پھر تمہیں قاتل نہیں ملے گا۔ میں نے جھنجھلا کر کہا، منوہر بھیا، کیوں مجھے گورکھ دھندوں میں ڈال رہے ہو، سیدھی بات کرو۔

”راؤ بھیا!“ — اس نے کہا — ”میں اس وقت تمہارے ساتھ دوست نہیں بلکہ بھائی کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں اور ایک درخواست ہے، مان لو تو ساری عمر احسان مند رہوں گا۔ میں نے ایک سودا کیا ہے اور اس امید پر کیا ہے کہ اس میں تمہارا فائدہ ہے“۔

”تم بات کرو منوہر!“ — میں نے کہا — ”تم نے جو کچھ بھی کیا ہے میں قبول کر

لوں گا“۔

وہ مسکراتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ دو تین منٹ بعد واپس آیا تو اس کے ساتھ ایک بڑی ہی خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی اور ساتھ ایک خوش شکل جواں سال آدمی تھا۔ میں نے لڑکی کو غور سے دیکھا تو یوں لگا جیسے میں چکرا کر گر پڑوں گا...... وہ پنڈت شردھانند کی بیٹی ارملا تھی...... میں حیران کہ اس کے ساتھ یہ آدمی کون ہے۔ میں نے سوالیہ نگاہوں سے سب انسپکٹر منوہر کشن کی طرف دیکھا۔ اس نے ان دونوں کو بٹھایا اور میری طرف توجہ کی۔

”میں تمہاری حیرت ابھی رفع کر دیتا ہوں راؤ بھیا!“ — منوہر کشن نے کہا — ”تم نے بادل رہزن کا نام تو سنا ہوگا...... یہ اس کا بیٹا زیبا رہزن ہے...... اور اس لڑکی کو تم نے پہچان ہی لیا ہوگا“۔

میں نے اگر مکالموں کے انداز سے یہ بات سنائی تو طوالت ناقابل برداشت ہو جائے گی، میں مختصر مگر جامع اور واضح انداز سے سنا دیتا ہوں...... یہ جواں سال آدمی جو ارملا کے ساتھ تھا، اس کا نام اورنگ زیب تھا لیکن زیبا رہزن کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی عمر ابھی پورے تیس سال نہیں ہوئی تھی۔ اس کا باپ اس علاقے کا نامی گرامی رہزن تھا جس کا نام بدرالدین تھا لیکن بادل رہزن کے نام سے مشہور تھا۔ زیبا رہزن کا دادا بھی رہزن تھا۔ یعنی یہ ان لوگوں کا خاندانی پیشہ تھا۔ اس زمانے میں ڈکیتی ایک الگ پیشہ، رہزنی الگ اور اسی طرح مختلف جرائم الگ الگ پیشے تھے۔ یہ لوگ معاشرے میں شرفاء کی طرح اٹھتے بیٹھتے تھے اور وارداتیں سوچ سمجھ کر اور شکار دیکھ کر تے تھے۔ زیبا کا باپ بادل مر چکا تھا اور اب زیبا نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ زیبا کا لباس اس کی شکل وصورت اور اس کا انداز دیکھ کر کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ یہ خوبرو اور جواں سال آدمی رہزن ہے۔

میں نے وہیں دونوں کے بیان لئے تو بات یہ سامنے آئی کہ ارملا کے دل میں منشی لائق علی کی محبت پیدا ہو گئی تھی۔ میں اب ان باتوں کو دہراؤں گا نہیں جو پہلے سنا چکا ہوں۔ ماں نے ارملا کا سودا بائیس ہزار پر کر لیا اور پھر اسے لائق علی سے ہٹانے لگی اور پھر اسے مارنے پیٹنے لگی تو ارملا نے گھر سے بھاگنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ لائق علی نے اسے کہا کہ وہ اسے کلکتہ لے جائے گا اور وہاں کوئی کاروبار کریں گے۔ کلکتہ تو وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا اور وہ شہر کراچی سے بھی بڑا تھا اور وہاں چلا جاتا تو وہ اس شہر میں گم ہو جاتا۔

ارملا کی ماں نے لائق علی کو قتل تک کی دھمکیاں دی تھیں اور اس کے ساتھ ہی اسے اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے بھی استعمال کرتی رہی۔ ارملا اور لائق علی نے انتقام لینے کا ارادہ کر لیا اور اس لیے بھی ماں کو قتل کرنا ضروری سمجھا کہ وہ تو ان کے راستے میں پہاڑ بن گئی تھی۔ ارملا کی ماں منشی کو کبھی کبھی آدھی رات کے وقت اپنی بیٹھک میں بلایا کرتی تھی۔ اب لائق علی نے خواہش ظاہر کی کہ وہ آج رات بیٹھک میں آئے گا۔ ارملا کی ماں نے اسے کہہ دیا کہ آجانا۔

لائق علی آدھی رات کے وقت گیا اور ارملا کی ماں نے بیٹھک کا دروازہ کھولا۔ لائق علی کے ہاتھ میں رومال تھا جسے اس نے مروڑ کر رسہ بنا لیا۔ اندر جاتے ہی لائق علی نے پلنگ کی طرف اشارہ کیا اور مقتولہ جوں ہی پلنگ کی طرف مڑی تو لائق علی نے پیچھے سے رومال اس کے گلے میں ڈالا اور اس وقت چھوڑا جب وہ مر چکی تھی۔

اب ارملا لائق علی سے کہنے لگی کہ بھاگ چلیں۔ میں نے جب ارملا کے چھوٹے بھائی سے بیان لیا تھا تو اس بچے نے گھر جا کر ارملا کو بتایا کہ تھانیدار نے کیا باتیں کی تھیں۔ ارملا نے لائق علی کو بتایا، تب دونوں نے محسوس کیا کہ اب بھاگ جانا چاہئے کیونکہ تھانیدار کو کچھ شک ہو گیا ہے۔ وہ رات کو نکل گئے۔ ارملا نے اپنے زیورات اور تین ہزار روپیہ گھر سے چرا لیا تھا۔

لائق علی نے کہا کہ یہاں سے ریل گاڑی میں نہیں بیٹھیں گے بلکہ سٹیشن تک پیدل جائیں گے اور وہاں سے گاڑی مل جائے گی۔ لائق علی نے یہ عقل کی بات سوچی تھی۔ دونوں ریلوے لائن سے دور دور ایک راستے پر چل پڑے۔ آگے علاقہ کچھ ویران اور جنگل تھا۔ وہاں پہنچے تو دو گھوڑ سوار آ گئے اور انہوں نے انہیں روک لیا۔ چاندنی پورے چاند کی تھی جس میں ارملا کچھ زیادہ حسین نظر آ رہی تھی۔

ایک گھوڑا سوار زیبا رہزن تھا۔ اس نے ارملا کو دیکھا تو گھوڑے سے اتر آیا اور اس کا ساتھی بھی گھوڑے سے اترا۔ اس نے قریب ہو کر ارملا کو دیکھا اور پھر لائق علی سے پوچھا کہ تمہارے پاس کوئی مال ہے؟ لائق علی نے جھوٹ بولا اور اسے کہا کہ ہم میاں بیوی ہیں اور اتنے غریب ہیں کہ پیدل گھر کو جا رہے ہیں لیکن جو چھوٹی گٹھڑی لائق علی نے اٹھا رکھی تھی وہ زیبا نے جھپٹ کر لے لی اور جب کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اسے

زیورات اور رقم نظر آ گئی تھی۔ زیبا نے یہ اتنا قیمتی مال اپنے قبضے میں لے لیا اور لائق علی سے کہا کہ تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے تو ہمارا مقابلہ کر لو تاکہ تمہیں کوئی افسوس نہ رہے۔ زیبا نے اپنا نام بھی بتایا۔

ارملا لائق علی کے پیچھے ہو گئی اور اسے کہا کہ وہ ان کا مقابلہ کرے اور وہ زندہ نہیں جائے گی...... لائق علی کے پاس لمبا چاقو تھا جو اس نے نہ نکالا۔ کچھ دیر مکالمہ بازی ہوئی اور اس دوران ارملا لائق علی کو اکساتی بھڑکاتی رہی اور یہ بھی کہا کہ مر جاؤ اور زندہ مجھے ان لوگوں کے حوالے نہ کرو، لیکن لائق علی نے ایسی حرکت کی جس کی ارملا کو قطعاً توقع نہیں تھی۔

لائق علی نے یوں کیا کہ زیبا رہزن سے کہا کہ زیورات اور یہ لڑکی تم لے جاؤ، یہ نقد رقم مجھے دے جاؤ، میں واپس چلا جاتا ہوں۔ ارملا نے اور زیادہ چیخ و پکار شروع کر دی اور زیبا رہزن ہنس پڑا۔ اس نے ارملا کا بازو پکڑا اور اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا کہ اس گیدڑ کے ساتھ گھر سے نکلی ہو۔ میرے ساتھ آؤ پھر تمہیں کوئی افسوس نہیں ہو گا۔

مختصر بات یوں ہوئی کہ زیبا نے ہنستے ہنستے ڈیڑھ ہزار روپیہ لائق علی کو دے دیا اور کہا، جا بزدل، تو اس لڑکی کے قابل تھا ہی نہیں۔ لائق علی پکا ہوشیار اور فریب کار آدمی تھا، وہ ڈیڑھ ہزار روپیہ لے کر وہاں سے واپس اپنے گھر آ گیا۔ اس طرح میرے ذہن میں اس کے خلاف یہ شک ابھرا ہی نہیں کہ ارملا کو یہ لے گیا تھا۔

زیبا نے ارملا کو اپنے آگے گھوڑے پر بٹھا لیا۔ تصور میں لایا جا سکتا ہے کہ ارملا کس طرح تڑپی، چیخی اور روئی ہو گی لیکن زیبا رہزن جب اسے اپنے گھر لے گیا تو وہ ایک شریفانہ اور بڑا ہی صاف ستھرا اور بڑی اچھی قسم کا گھر تھا۔ زیبا نے ارملا سے کہا کہ میں تمہیں داشتہ نہیں بناؤں گا نہ کسی اور طریقے سے خراب کروں گا بلکہ تمہیں مسلمان کر کے شادی کروں گا پھر دیکھنا کہ تم اپنے پچھلوں کو اور اپنے فریب کار عاشق کو کس طرح ذہن سے اتارتی ہو۔

ارملا کو اپنی ماں نے بھی تشدد کا نشانہ بنائے رکھا تھا اور جس سے محبت ہوئی وہ ڈیڑھ ہزار پر اس کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ ارملا نے زیبا کو قبول کر لیا اور اسلام بھی قبول کر لیا اور اسی مولوی نے ان کا باقاعدہ نکاح بھی کر دیا جس نے ارملا کو مسلمان کیا تھا۔ زیبا کی دوستی سب انسپکٹر منوہر کشن کے ساتھ تھی۔ وہ اگلے روز منوہر کشن سے ملا اور یہ ساری واردات اسے

سنائی۔ ارملا نے منوہر کشن کو بتایا کہ لائق علی نے کس طرح اس کی ماں کو قتل کیا تھا۔

زیبا رہزن نے دو تین بڑی سنگین وارداتوں کی تفتیش میں منوہر کشن کی بہت ہی مدد کی تھی۔ منوہر کشن یہ احسان لوٹانا چاہتا تھا۔ وہ دونوں کو ایک مجسٹریٹ کی عدالت میں لے گیا اور ارملا کا بیان قلمبند کرادیا کہ میں اپنی مرضی اور رضا و رغبت سے زیبا کے ساتھ گھر سے نکلی تھی اور مسلمان ہو کر اس کے ساتھ شادی کرلی ہے۔ نکاح نامہ بھی پیش کیا گیا۔ زیبا مجسٹریٹ کے سامنے پیشہ ور رہزن کی صورت میں نہیں گیا تھا بلکہ ایک معزز شہری کی صورت میں گیا تھا......

اس کارروائی کے بعد منوہر کشن نے مجھے فون پر اطلاع دی اور میں وہاں چلا گیا......

زیبا رہزن نے ارملا کا اسلامی نام عابدہ رکھا تھا۔ مجھے بہت ہی خوشی ہوئی کہ ایک ہندو لڑکی نے اسلام قبول کیا ہے۔ میں دیکھ رہا تھا کہ ارملا بہت ہی خوش تھی۔ اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا اور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر چپک کے رہ گئی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ کیا کہ اس ساری واردات کو گول کر جاؤں گا...... میں واپس آ گیا۔ وہاں اپنے تھانے میں جا کر پہلا کام یہ کیا کہ لائق علی کو پنڈت کی دکان سے اٹھا کر اس کے گھر لے گیا اور اس کے گھر پر باقاعدہ چھاپہ مارا اور اسے کہا کہ وہ ڈیڑھ ہزار روپیہ برآمد کر دے۔ اس نے پس و پیش کی تو میں نے اسے بتایا کہ اس کے پاس ڈیڑھ ہزار روپیہ کس طرح آیا ہے۔ تب اس نے خاموشی سے یہ روپے دو گواہوں کی موجودگی میں برآمد کر دیئے۔ میں نے اسے پنڈت شردھانند کی بیوی کے قتل کے جرم میں باقاعدہ گرفتار کرلیا لیکن اس ڈیڑھ ہزار کی برآمدگی پر پردہ ڈال لیا۔

پنڈت شردھانند کو میں نے بتایا کہ اس کی بیٹی اپنی مرضی سے ایک آدمی کے ساتھ گھر سے نکلی تھی اور اس نے اسلام قبول کر کے اس آدمی کے ساتھ شادی کرلی ہے اس لیے وہ بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ واپس لے لے اور یہ بھی بھول جائے کہ اس کی بیٹی گھر سے زیورات اور رقم لے گئی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ چوری ثابت نہیں ہو سکتی اور اس کی بیٹی عدالت میں آکر اسے ذلیل و خوار کر دے گی۔ اچھا ہوا کہ پنڈت مان گیا۔ اس نے کہا کہ اسے اتنا تو بتا دوں کہ اس کی بیٹی ہے کہاں، میں نے اسے نہ بتایا اور مزید ڈرایا کہ اس نے زیادہ اصرار کیا تو ایسا ہو سکتا ہے کہ وہ آدمی پنڈت کو کچھ نقصان پہنچائے۔ ہندو لالہ ڈر گیا اور چپ ہو گیا اور پھر اس نے میری لکھی ہوئی تحریر پر دستخط کر دیئے جو یہ تھی کہ میں بیٹی کی گمشدگی کی رپورٹ واپس لیتا ہوں۔

اب میرا مسئلہ یہ تھا کہ لائق علی کے خلاف جرم ثابت کرنے کے لیے شہادت کہاں سے لاؤں اور شہادت اتنی مضبوط ہو کہ یہ شخص اپیل میں بھی بری نہ ہو سکے۔ پہلے تو میں نے اپنی استادی سے اور کچھ پولیس کے دوسرے بلکہ تیسرے طریقے سے جسے تھرڈ ڈگری کہتے ہیں، اس سے اقبالی بیان لیا۔ مجھے بڑی ہی سخت محنت اور بھاگ دوڑ کرنی پڑی اور کچھ پیڈنگ بھی کی تب جا کر میرا مقدمہ تیار ہوا اور میں نے عدالت میں چالان پیش کر دیا۔

میں نے مقدمے میں ارملا اور زیبا کا ذکر تک نہیں کیا تھا۔ بہر حال یہ معاملہ آپ کی دلچسپی کا نہیں، یہ پولیس کا معاملہ ہے جسے آپ پولیس کے اندر خانے کی باتیں کہہ سکتے ہیں...... سیشن کورٹ نے لائق علی کو سزائے موت دے دی لیکن ہائی کورٹ نے یہ سزا تبدیل کر کے عمر قید کر دی۔

دو اڑھائی سال بعد اتفاق سے منوہر کشن کے ساتھ ملاقات ہو گئی۔ وہ اس وقت انسپکٹر ہو چکا تھا۔ مجھے ارملا اور زیبا یاد آ گئے۔ منوہر سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ بڑے خلوص اور پیار سے رہ رہے ہیں اور ارملا ایک بیٹے کی ماں بھی بن چکی ہے اور بہت ہی خوش ہے۔

***

پٹنہ کی ناگن

میں اُس وقت بھارت کے صوبہ بہار کے مرکزی شہر پٹنہ کے اس تھانے کا انچارج تھا جس میں عصمت فروشوں کا بازار بھی آتا تھا۔ میری یہ تفتیشی کہانی چونکہ خاصی طوالت کی حامل ہے اس لیے میں چھوٹی چھوٹی تفصیلات اور جزیات کو حذف کرتا جاؤں گا۔ پٹنہ کا وہ بازارِ حسن ویسا ہی تھا جیسا پاکستان میں راولپنڈی، لاہور اور کراچی میں ہے۔ یہاں تو پابندیاں عائد ہو چکی ہیں۔ وہاں کوئی پابندی نہیں تھی۔ جنگِ عظیم کو ختم ہوئے دو سال گزر گئے تھے۔ جنگِ عظیم کے دوران اس بازار کی رونق میں سو فیصد تو نہیں پچاس فیصد اضافہ یقیناً ہو گیا تھا۔

طوائفوں کے یہ علاقے دنیا کے کسی بھی شہر میں ہوں، حساس اور خطرناک سمجھے جاتے ہیں۔ وجہ صاف ہے، چھوٹے بڑے جرائم پیشہ لوگ وہاں جاتے ہیں، نشے کی حالت میں وہاں دنگا فساد ہوتا ہے، جیب تراشی کی وارداتیں ہوتی ہیں، کوئی کمسن یا نوجوان لڑکی اغوا ہو جائے اور سراغ ملے کہ اسے طوائفوں کے بازار تک پہنچا دیا گیا ہے تو پولیس وہاں چھاپے مارتی ہے۔ بعض طوائفیں بغیر لائسنس دھندا کرتی ہیں۔ انہیں پکڑنا ہوتا ہے۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ان علاقوں کے تھانیداروں کو ہر وقت چوکس رہنا پڑتا تھا۔ کچھ لعنتیں جنگِ عظیم چھوڑ گئی تھی جن میں سب سے بڑی یہ تھی کہ لوگوں کے پاس پیسہ اتنا زیادہ آ گیا تھا کہ بعض اوچھے لوگ تو اتنا بھی سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ پیسہ کہاں خرچ کریں۔ شراب کی بو بھی جنہوں نے کبھی نہیں سونگھی تھی وہ بھی شراب پینے لگے تھے۔

جس وقت کی یہ واردات ہے اس وقت نے پولیس کے لیے ایک اور ہی دشواری پیدا کر دی تھی۔ 1947ء کا ماہ جولائی تھا۔ تقسیم ہند کا اعلان 3 جون کو ہو چکا تھا اور اب آزادی ملنے میں ایک مہینہ اور کچھ دن ہی باقی تھے۔ بہار کے ہندوؤں نے مسلمانوں پر

مطالبۂ پاکستان اور دو قومی نظریہ پر عمل کرنے کی پاداش میں قاتلانہ حملے شروع کر دیئے تھے۔ جولائی کے اوائل میں ایسی وارداتیں اِکا دُکا ہوتی تھیں جن میں اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ قارئین کرام کو یاد ہو گا کہ زیادہ تر مسلم کشی اِدھر پنجاب میں ہوئی تھی اور اُدھر صوبہ بہار میں۔ بہار سے مسلمانوں نے مشرقی پاکستان کی طرف ہجرت شروع کر دی تھی لیکن ابھی چھوٹے پیمانے پر اجتماعی ہجرت بعد ہوئی تھی۔

ان حالات میں ایک رات دس بج رہے تھے جب تھانے سے ایک ہندو کانسٹیبل میرے گھر آیا اور اطلاع دی کہ ایک طوائف کے قتل کی رپورٹ آئی ہے۔ میں نے کچھ ہی دیر پہلے وردی اتاری تھی اور سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ فوراً وردی پہنی اور تھانے چلا گیا۔ ابھی انگریزوں کا ہی دورِ حکومت تھا جس میں کوئی تھانیدار کسی نہایت معمولی سی واردات کی رپورٹ کو بھی ٹالنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ تو قتل کی واردات تھی۔

تھانے پہنچا تو وہاں دو آدمیوں کو منتظر پایا۔ مجھے اس تھانے میں ایک سال سے زیادہ عرصہ ہو گیا تھا اس لئے عصمت فروشوں کے علاقے کے چیدہ چیدہ افراد کو میں اچھی طرح جانتا تھا۔ اس علاقے کی کسی بھی واردات کی تفتیش میں یہ لوگ مدد و معاون ثابت ہوتے تھے۔ یہ جو دو اشخاص میرے انتظار میں بیٹھے تھے، ان میں ایک عصمت فروشوں کا پنچ یا چوہدری تھا۔ عصمت فروشوں نے اسے اپنا سربراہ یا بزرگ بنا رکھا تھا۔ وہ ان کے آپس کے جھگڑے اور دیگر امور نپٹاتا تھا۔ دوسرا شخص ایک طوائف کا آدمی تھا جسے آپ دلال کہہ لیں یا دَلاّ کہہ لیں اور اگر آپ زیادہ شریف اور شائستہ ہیں تو اسے ایجنٹ کہہ لیں۔

میں نے انہیں دیکھتے ہی پوچھا کہ کون سی طوائف قتل ہو گئی ہے؟

''کنول'' ــــ طوائف کے آدمی نے کہا ــــ ''ہم تو لٹ گئے حضور!''

وہ اچانک اس طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا جیسے ہنستا کھیلتا بچہ گر پڑتا ہے تو چیخ چیخ کر رونے لگتا ہے۔ اسے ایسا کوئی غم نہیں تھا کہ ایک لڑکی یا انسان کی بچی قتل ہو گئی ہے بلکہ اسے دکھ یہ تھا کہ سونے کے انڈے دینے والی مرغی ماری گئی تھی۔ کنول کو تو میں بہت ہی اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی اور بہت ہی خوبصورت لڑکی تھی۔ عام طور پر چہرے کے پُرکشش نقش و نگار کو اور گورے رنگ کو خوبصورت سمجھا جاتا ہے۔ کنول میں چہرے اور رنگ کی کشش تو تھی ہی، اس کے جسم کی ساخت اور اس کی لمبوتری گردن

میں طلسماتی سا تاثر تھا جسے کوئی زاہد یا پارسا ہی نظر انداز کر سکتا تھا۔ خوبصورتی کا اپنا ایک تاثر ہوتا ہے لیکن کنول جیسی عصمت فروش لڑکیاں خوبصورتی کے استعمال کو خوب جانتی تھیں۔ ایک بار کوئی اس کے جال میں آ جاتا تو پھر وہ نکل نہیں سکتا تھا۔ کنول اس کا وہی حال حلیہ بنا دیتی تھی جو مکڑی اپنے جالے میں آئی ہوئی مکھی کا بنایا کرتی ہے۔

کنول کے آدمی کو میں نے دَلاّل بھی کہا ہے، دَلاّ بھی اور ایجنٹ بھی۔ بہتر ہے آپ اس کا نام یاد رکھ لیں۔ نام بیدار بخت تھا۔ نام سے تو یوں لگتا ہے جیسے مغلیہ خاندان کی نسل سے تھا لیکن اس کا جو ذریعۂ معاش تھا وہ میں بتا چکا ہوں۔

طوائفیں تین قسموں کی ہوتی تھیں۔ ایک تو تھرڈ کلاس تھیں جن کے پاس تھرڈ کلاس لوگ ہی جاتے تھے۔ دوسری قسم کو آپ مڈل کلاس کہہ لیں۔ یہ قدرے بہتر ے اور صاف ستھری تھیں جن کے پاس اچھی قسم کے لوگ جاتے تھے۔ ان کے ریٹ بھی زیادہ تھے۔ تیسری قسم کنول جیسی عصمت فروش لڑکیوں کی تھی۔ یہ بازار میں نہیں بیٹھتی تھیں بلکہ اسی علاقے میں بڑے ہی اچھے اور امیرانہ مکانوں میں رہتی تھیں۔ ان کے دو درجے تھے۔ ان کا ریٹ اتنا زیادہ تھا جو متوسط طبقے کا کوئی آدمی برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ ایک وہ تھیں جو ہر گاہک کو قبول کر لیتیں اور منہ مانگے دام وصول کرتی تھیں۔ دوسرے درجے کی وہ طوائفیں تھی جو اعلیٰ اور بڑے ہی امیروں کا درجہ تھا۔ ہر طوائف نے دو یا تین اور زیادہ سے زیادہ چار گاہک مستقل طور پر پھانس رکھے تھے۔ ان کے پاس وہی جا سکتا تھا جس کے پاس دولت کا کوئی شمار نہ ہو اور بے دردی سے دولت لٹانے کی ہمت رکھتا ہو۔ بعض لوگ ان لڑکیوں کو پرائیویٹ بھی کہتے تھے۔

ان میں سے کوئی بھی لڑکی شائستہ اور مہذب سوسائٹی میں چلی جاتی تو کسی کو ذرا سا بھی شک نہیں ہوتا تھا کہ یہ لڑکی اس بازار سے آئی ہے اور عصمت فروش ہے۔ ان کی شائستگی اور آداب سے لوگ متاثر ہوتے تھے۔ کنول اسی درجے کی عصمت فروش لڑکی تھی۔

میں نے بیدار بخت سے پوچھا کہ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی یا دشمنی جیسی کاروباری رقابت ہو گی۔ اس نے اور اس علاقے کے پنچ نے پورے وثوق سے بتایا کہ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں تھی۔ دشمنی یہی ہو سکتی تھی کہ کنول نے کسی اپنے جیسی طوائف کا کوئی مستقل گاہک ادھر سے توڑ کر اپنی مٹھی میں لے لیا ہو گا۔ مجھے جواب ملا کہ کسی کے ساتھ کوئی دشمنی

نہیں تھی۔

یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ کنول کی کلاس کی ہر طوائف جس کے دو چار ہی مستقل گاہک ہوتے تھے۔ ہر گاہک کو یہ تاثر دیئے رکھتی تھی کہ وہ اس کی والہانہ محبت میں گرفتار ہو گئی ہے اور اس کے بغیر ایک پل چین سے نہیں رہ سکتی۔ شاید بعض قارئین کو یہ یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایسی ہر عصمت فروش لڑکی اپنے گاہکوں کو کالے جادو کے ذریعے اپنی مٹھی میں رکھتی تھی۔ ان میں سے کسی کو بھی ہر روز نئے گاہک کی ضرورت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ان کے گاہک امیر زادے، بے پناہ دولت والے جاگیردار اور سمگلر ہوتے تھے...... معذرت خواہ ہوں کہ بات سے بات نکلی چلی جا رہی ہے اور ابھی میں اصل کہانی تک نہیں پہنچا۔ میں پاکستان کی اپر کلاس سوسائٹی کی ایک بات کہنا چاہتا ہوں۔ اب تو اس قسم کی عصمت فروشی ہماری اپر کلاس کی عورتوں میں بھی آ گئی ہے۔ یہ اچھی قسم کے خاندانوں کی عورتیں ہیں۔ ایسی ہر عورت کسی امیر کبیر آدمی کو پھانس لیتی ہے اور اسے تھوڑے سے عرصے میں کنگال کر کے الگ پھینکتی اور ایسے ہی ایک اور کو پھانس لیتی ہے۔ اگر میں کہوں کہ ایسی عورتوں نے پاکستان کی حکومت اور انتظامیہ کو اپنے زیر اثر لے رکھا ہے تو یہ مبالغہ نہ ہو گا۔

میں مطلوبہ کاغذی کارروائی اور رپورٹ کا اندراج وغیرہ کر کے بیدار بخت اور اس کے پنچ کے ساتھ جائے واردات پر چلا گیا۔ عام قسم کی طوائفوں کے بازار کے قریب ہی بڑا ہی اچھا اور صاف ستھرا مکان تھا جس میں کنول رہتی تھی۔ مجھے اس کمرے میں لے جایا گیا جہاں اس کی لاش پڑی تھی۔ مجھے شک تھا کہ کوئی مستقل گاہک آیا ہو گا اور کوئی وجہ پیدا ہو گئی جس کی بناء پر وہ کنول کو قتل کر کے بھاگ نکلا لیکن مجھے بتایا گیا کہ ابھی وہ تیار ہو رہی تھی اور ابھی کوئی گاہک نہیں آیا تھا۔ آنے والے نے ڈیڑھ دو گھنٹے بعد آنا تھا۔ جس کمرے میں لاش پڑی ہوئی تھی۔ وہ کنول کا میک اپ کا کمرہ تھا۔ گاہکوں کو بٹھانے اور ان کی خاطر و مدارت کے لیے الگ کمرہ تھا۔

لاش فرش پر پڑی ہوئی تھی۔ فرش پر خاصا قیمتی قالین بچھا ہوا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل بہت خوبصورت، ایسا ہی عمدہ پلنگ اور اس پر بچھا ہوا بستر اور پلنگ پوش تھا اور اس کمرے کی ہر چیز امیرانہ ٹھاٹھ والی تھی۔ کمرے میں ایسی خوشبو پھیلی ہوئی تھی جو کم از کم میرے لیے نئی تھی۔ یہ رومانی تاثر پیدا کرنے والی خوشبو تھی۔

لاش ایک پہلو کے بل پڑی تھی۔ مقتولہ نے ساڑھی باندھ رکھی تھی اور اس کے بال کھلے ہوئے اور اس طرح بکھرے ہوئے تھے کہ اس کی گردن بھی ڈھکی ہوئی اور چہرہ بھی ڈھکا ہوا تھا۔ میں نے لاش کے قریب بیٹھ کر اس کے بال اس کے چہرے اور گردن سے ہٹائے۔ میں تو اس کے بالوں کی ملائمت سے ہی حیران رہ گیا۔ ریشم کے تار اس سے زیادہ ملائم کیا ہوں گے۔ اکثر خواتین و حضرات حیران ہو جاتے ہیں کہ فلاں عورت نے فلاں شخص کو شاہ سے گدا بنا دیا ہے۔ کبھی میں بھی حیران ہوا کرتا تھا کہ آدمی اتنا بے وقوف بھی نہیں بن سکتا کہ دولت اور جائیدادیں بھی لٹا دے لیکن میں نے جب اس عصمت فروش لڑکی کے بال اس کے چہرے سے ہٹائے اور اس کے بالوں سے اٹھتی ہوئی خوشبو سونگھی تو مجھے بڑا صحیح جواب مل گیا کہ عورت کس طرح ایک بادشاہ کو تخت سے اٹھا کر خاک پر پھینک دیتی ہے۔

مقتولہ کی لمبوتری گردن پر صاف نشانات تھے کہ اس کا گلا گھونٹا گیا ہے۔ پھر میں نے اس کی ساڑھی اچھی طرح دیکھی۔ بالکل صحیح بندھی ہوئی تھی، کہیں سے بھی پھٹی ہوئی، کھنچی ہوئی یا اُٹھی ہوئی نہ تھی۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس پر مجرمانہ حملہ نہیں ہوا اور اسے صرف قتل کیا گیا ہے۔ یہ بھی نوٹ فرمائیں کہ بیدار بخت نے خاص طور پر مقتولہ کے زیورات اور دیگر قیمتی اشیاء دیکھی تھیں۔ وہ سب جوں کی توں ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں پڑی ہوئی تھیں۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ قتل ڈکیتی کی خاطر نہیں ہوا، اس کا باعث کچھ اور ہو سکتا ہے۔

میں نے لاش کے ارد گرد دیکھا۔ پلنگ پوش دیکھا۔ اس پر ایسی سلوٹیں نہیں تھیں جن سے یہ ظاہر ہوتا کہ پلنگ پر کوئی لیٹا رہا ہے۔ پلنگ پوش پر کوئی سلوٹ تھی ہی نہیں۔ قاتل اپنا کوئی سراغ نہیں چھوڑ گیا تھا۔

کمرے کا ایک دروازہ تھا جو ایک اندرونی کمرے میں کھلتا تھا ایک کھڑکی تھی جو باہر کو کھلتی تھی۔ کھڑکی کے آگے بڑا ہی خوشنما اور بڑا قیمتی پردہ لٹکا ہوا تھا۔ یہ پردہ دو حصوں میں تھا۔ دونوں حصے ذرا ذرا ہٹے ہوئے تھے اور درمیان سے کھڑکی نظر آ رہی تھی جو کھلی ہوئی تھی۔

کھڑکی کے دونوں کواڑ کھلے ہوئے تھے۔ ایک پورا اور دوسرا آدھا یا اس سے کچھ زیادہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے کھڑکی میں جھک کر باہر دیکھا۔ پیچھے کشادہ گلی تھی۔ سامنے دو

مکانوں کے دروازے تھے اور آگے جا کر تین چار دکانیں تھیں جن میں ایک یا غالباً دونوں پان سگریٹ کی تھیں۔ اس کھڑکی سے دس بارہ قدم کے فاصلے پر بجلی کا کھمبا تھا جس کے ساتھ ایک بلب جل رہا تھا۔ پولیس کے آنے کی وجہ سے لوگوں کو پتہ چل گیا کہ کنول قتل ہو گئی ہے۔ تماشائی گلی میں اکٹھے ہو رہے تھے۔

میرے ساتھ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور تین کانسٹیبل تھے۔ وہ باہر گلی میں کھڑے تھے۔ وہ بیکار نہیں کھڑے تھے بلکہ اپنا کام کر رہے تھے۔ وہ لوگوں میں گھل مل گئے تھے اور ان کی باتیں بھی سن رہے تھے اور کچھ ان سے پوچھ بھی رہے تھے۔ وہ اپنے طور پر سراغ رسانی کر رہے تھے۔ میں نے اپنے سٹاف کو یہ ٹریننگ دے رکھی تھی۔ اس کے مطابق وہ اپنا کام کر رہے تھے۔

میں نے لاش پوسٹمارٹم کے لیے بھجوا دی۔ میں اس کام کے لیے ایک اور ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبل کو ساتھ لایا تھا۔ دونوں کو لاش کے ساتھ بھیجا کہ راستے میں کوئی گڑبڑ نہ ہو اور ڈاکٹر وقت ضائع کیے بغیر پوسٹمارٹم کر دے۔ اس دور میں ڈاکٹروں کو یہ کہنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوتی تھی کہ وہ پوسٹمارٹم جلدی شروع کر دیں۔ پوسٹمارٹم لاش پہنچتے ہی شروع کر دیا جاتا تھا۔ پاکستان میں یہ خبر پڑھ کر افسوس ہوتا ہے کہ لاش دو دن سرکاری ہسپتال کے مردہ خانے میں پڑی رہی اور پوسٹمارٹم نہیں ہوا۔

میں نے پوچھا کہ یہ کھڑکی اسی طرح کھلی رکھی جاتی ہے؟ جواب ملا کہ کھڑکی عام طور پر بند رہتی ہے، البتہ مقتولہ کسی کسی وقت کھڑکی کھول کر باہر دیکھنے لگتی تھی اور جب وہاں سے ہٹتی تو کھڑکی بند کر دیا کرتی تھی۔ میں نے ان سے کچھ اور معلومات لیں۔ ان کے مطابق بات یوں سامنے آئی کہ اس کمرے کا دروازہ جو اندر کی طرف کھلتا تھا، بند تھا لیکن اندر سے چٹخنی نہیں چڑھی ہوئی تھی۔ باہر والا دروازہ بند رہتا تھا اور اندر سے دونوں چٹخنیاں چڑھا کر رکھی جاتی تھیں۔ یہ اس لئے کہ کوئی ناپسندیدہ آدمی اس گھر کو طوائف کا گھر سمجھ کر دستک دیئے بغیر ہی اندر نہ آ سکے۔ مجھے بتایا گیا کہ جب انہیں پتہ چلا کہ کنول قتل ہو گئی ہے تو بیدار بخت نے پہلا کام یہ کیا کہ باہر والا دروازہ دیکھا۔ اندر والی دونوں چٹخنیاں چڑھی ہوئی تھیں جس کا مطلب یہ تھا کہ باہر سے کوئی نہیں آیا تھا۔ اگر کھلا ہوتا تو یوں ہو سکتا تھا کہ قاتل باہر سے آیا اور دیکھا کہ صحن میں کوئی نہیں اور کنول بھی نہیں اور کنول اپنے کمرے میں

ہوگی تو نظر بچا کر اس کمرے میں چلا گیا اور کنول کا گلا گھونٹ کر دروازے کی طرف سے یا کھڑکی کی طرف سے فرار ہو گیا۔

یہ امکان بھی میرے ذہن میں آیا کہ قاتل اسی گھر کا کوئی فرد ہو گا یا کسی آدمی کو جوان کی آمدنی کا حصہ دار ہو گا، ان لوگوں نے کوئی تنازعہ پیدا کر کے اسے الگ کر دیا ہو گا اور اس شخص نے یہ تنازعہ اس طرح ختم کیا کہ کنول کو اس کے کمرے میں تنہا دیکھ کر اس کا گلا گھونٹا اور کھڑکی کے راستے نکل گیا۔ اس شک کو ذہن میں رکھ کر میں نے بیدار بخت سے پوچھا کہ گھر میں اور کون کون رہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ ایک تو بیدار بخت تھا، دوسری کنول کی ماں تھی اور تیسرا ایک نوکر تھا جس کی عمر سولہ سترہ سال تھی۔ وہ گھر کے دوسرے کام کے علاوہ کھانا پکانا بھی کر دیا کرتا تھا۔ میں نے کنول کی ماں کو دیکھا۔ اس کی عمر پینتالیس برس سے ذرا اوپر ہی ہو گی، کم نہیں تھی۔ اس کی شکل وصورت کنول سے اتنی ملتی جلتی تھی کہ اس میں ذرا سا بھی شک نہیں رہتا تھا کہ یہ کنول کی ماں ہے۔ اس عمر میں بھی وہ خوبصورت لگتی تھی۔

بیدار بخت کے متعلق پوچھا تو پتہ چلا کہ اس کا ان لوگوں کے ساتھ خون کا کوئی رشتہ نہیں صرف کاروباری تعلق ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ جذباتی بن گیا ہے۔ بیدار بخت کا گہرا تعلق اس علاقے کے پیشہ ور غنڈوں اور بدمعاشوں کے ساتھ تھا۔ یہ ایک پاور تھی جو اس پیشے میں ضروری سمجھی جاتی تھی۔ بیدار بخت پر بھی شک کیا جا سکتا تھا۔ یہ پیشہ ہی ایسا تھا کہ کسی بھی وقت کوئی سا بھی جھگڑا یا تنازعہ پیدا ہونے کا امکان موجود تھا۔ میں نے اسی شک کو ذہن میں رکھ کر کنول کی ماں سے پوچھا کہ اس وقت گھر کا ہر فرد کیا کام کر رہا تھا اور کہاں کہاں تھا۔

ماں نے بتایا کہ بیدار بخت نہانے کے لیے غسل خانے میں چلا گیا تھا۔ اسے بھی تیار ہونا تھا۔ نوکر باورچی خانے میں مصروف تھا اور وہ ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں آیا۔ میرے ایک سوال کا ماں نے جواب دیا کہ اسے یقین تھا کہ جس وقت بیدار بخت غسل خانے میں گیا اس وقت کنول اپنے کمرے میں میک اپ کر رہی تھی۔

میں نے نوجوان نوکر کو بھی اچھی طرح دیکھا تھا۔ اس کے خلاف یہ شک ذہن میں آتا تھا کہ نوجوان ہے اور کنول بہت ہی خوبصورت اور اس جیسے نوجوان کو مشتعل کر دینے والی لڑکی تھی۔ ہو سکتا تھا کہ نوکر نے چپکے سے واردات والے کمرے میں جا کر کنول پر دست

درازی کی ہو اور اس کی مزاحمت پر یا اس خطرے کے پیش نظر کہ اسے پکڑوا دے گی، نوکر نے اس کا گلا گھونٹ دیا لیکن کنول کی ماں نے پُر اعتماد لہجے میں بتایا کہ نوکر باورچی خانے میں ہی مصروف رہا اور وہ اس وقت باہر نکلا تھا جب شور اٹھا تھا کہ کنول کو کوئی مار گیا ہے۔

یہ تو ان لوگوں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ان کی کسی کے ساتھ دشمنی نہیں۔ جائے واردات پر تفتیش کے دوران ان لوگوں کا پنچ بھی موجود تھا۔ میں نے وہاں ایک بار پھر دشمنی کی بات کی تو اس پنچ نے کہا کہ ان لوگوں کے کچھ اپنے اصول ہیں جن پر وہ سختی سے کاربند رہتے ہیں۔ کنول کی کلاس کی طوائفیں ایک دوسری کو دھوکہ نہیں دیا کرتی تھیں اور ان کے مالک یا دلال بھی ان اصولوں کی پابندی کیا کرتے تھے۔

میں نے پہلے کھڑکی کا ذکر کیا ہے کہ یہ کھلی ہوئی تھی۔ اب دیکھا کہ میرے ذہن میں جو شکوک ابھرے تھے وہ صاف ہو گئے ہیں تو میں نے کھڑکی کی طرف پوری توجہ دی۔ یہ یقین ہو گیا تھا کہ باہر والے دروازے سے کوئی اندر نہیں آیا تھا۔ گھر کا کوئی بھی فرد اس قتل میں ملوث نہیں تھا پھر یہی ایک صورت رہ جاتی تھی کہ قاتل کھڑکی کے راستے اندر آیا اور مقتولہ کا گلا گھونٹ کر کھڑکی کے راستے ہی نکل گیا۔ میں نے کھڑکی کے دونوں پردے پوری طرح دائیں بائیں کر دیئے تاکہ کمرے میں روشنی پوری کھڑکی پر پڑے۔

کھڑکی کی دہلیز پر پاؤں کا صاف نشان تھا۔ پاؤں ننگا نہیں تھا بلکہ جوتی میں تھا۔ یہ نشان اتنا مدھم تھا کہ اسے کوئی تفتیشی افسر ہی دیکھ سکتا تھا۔ دہلیز پر ذرا سی گرد تھی۔ اس نہایت معمولی سی گرد پر رگڑ سی تھی اور بلا شک وشبہ کہا جا سکتا تھا کہ اس کھڑکی میں سے کوئی آیا اور گیا ہے۔ باہر گلی پکی تھی اس لیے کسی کے قدموں کے نشان ملنا ممکن نہیں تھا۔

یہ تو مجھے معلوم تھا اور پھر مجھے بیدار بخت نے بتا بھی دیا تھا کہ ان کا کاروبار ایسا نہیں تھا کہ ایک گاہک آیا، کچھ دیر بعد وہ چلا گیا اور ایک اور آ گیا اور یہ آنا جانا لگا رہا۔ میں پہلے بتا چکا ہوں کہ کنول کس درجے کی عصمت فروش لڑکی تھی۔ انہوں نے میرے استفسار پر بتایا کہ ان دنوں ان کے پاس تین مستقل گاہک تھے۔ انہوں نے جب ان تینوں آدمیوں کے نام بتائے اور تھوڑا تھوڑا تعارف سنایا تو میری آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ یہ تینوں حیران کن حد تک دولت مند لوگ تھے۔

قارئینِ کرام اگر کنول کے کاروبار کو اچھی طرح نہیں سمجھ سکے تو میں ایک بار پھر بتا دیتا ہوں۔ میں جنہیں گاہک کہہ رہا ہوں، ان کے ساتھ ان لوگوں کا رویہ گاہکوں والا نہیں ہوتا تھا۔ یہ دوستی والا انداز ہوتا تھا۔ مثلاً ایک گاہک یا دوست آیا اور کنول کو کسی پہاڑی مقام پر لے گیا۔ اس طرح ساتھ جانے کی اُجرت طے نہیں کی جاتی تھی۔ گاہک خود ہی کیش پیش کر دیتا تھا اور پھر طوائف اپنی فرمائشیں پوری کرواتی تھی جو گاہک بڑی خوشی سے پوری کرتا تھا۔ زیورات کی کوئی آئٹم طوائف کو اچھی لگے تو وہ بھی گاہک لے دیتا تھا۔ یہ طوائف کا کمال ہوتا تھا کہ وہ گاہک کو اپنی دلکش بلکہ طلسماتی اداکاری اور حرکتوں سے یہ تاثر دیئے رکھتی تھی کہ وہ اس پر مرمٹی ہے اور اس کے بغیر رہ ہی نہیں سکتی۔

میں نہایت قابلِ فہم الفاظ میں بیان کر سکتا ہوں کہ کنول جیسی طوائف اپنے گاہک پر کس طرح غالب آتی تھی اور شراب پلا پلا کر کس طرح اس کے ذہن لاشعور میں اتر جاتی تھی۔ یہ طوائفیں اپنے اس قسم کے گاہکوں کو کٹھ پتلیوں کی طرح نچایا کرتی تھیں۔ میں چونکہ واردات اور تفتیش کی روئیداد سنا رہا ہوں اس لیے برین واشنگ اور سوچوں پر قبضہ کر لینے کا یہ عمل تفصیل سے بیان نہیں کروں گا۔

میرے ذہن میں یہ شک آیا کہ ان کے تین میں سے کسی ایک گاہک نے کنول سے کہا ہوگا کہ وہ دوسروں کو چھوڑ دے اور صرف اس کے ساتھ تعلق رکھے یعنی اس کی داشتہ بنی رہے۔

میں نے اپنا یہ شک بیدار بخت اور کنول کی ماں کے سامنے رکھا اور پوچھا کہ وہ کسی ایسے گاہک کی نشاندہی کر سکتے ہیں؟...... ان دونوں نے غمزدہ آواز میں کہا کہ یہ مطالبہ تو ہر گاہک کرتا ہے۔ ہر وہ گاہک جو ایک ایک رات کے ہزار ہا روپے دے دیتا ہے، وہ اپنا حق سمجھتا ہے کہ لڑکی کو مستقلاً اپنی داشتہ بنا لے۔

میں نے واردات والے کمرے میں بیٹھ کر ہی تفتیش شروع کر دی تھی لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ بیدار بخت اور کنول کی ماں اس قدر غمزدہ تھے کہ مسلسل روئے جا رہے تھے۔ میں نے ان سے ابھی یہ توقع رکھی ہی نہیں تھی کہ وہ ابھی پورا دھیان تفتیش کے سلسلے میں مجھے دیں۔ میں نے پہلے کنول کو سونے کے انڈے دینے والی مرغی کہا ہے۔ کنول ان کا ذریعہ معاش ہی نہیں تھی بلکہ وہ تو خزانے پیدا کرنے والی مشین تھی۔ اس کے مر جانے سے ان

دونوں کی تو قسمت ہی تاریکی میں ڈوب گئی تھی۔ ان کی یہ جذباتی کیفیت دیکھ کر میں نے یہ طے کیا کہ ابھی ان سے تعارفی پوچھ گچھ کر لی جائے پھر اس بنیاد پر اگلے روز تھانے میں جا کر تفصیلی بیان لوں گا۔ ابھی تو میں نے اپنی مخبری اور جاسوسی کی خفیہ مشینری کو بھی حرکت میں لانا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم تھا کہ باہر گلی میں جو تماشائی اکٹھے ہو گئے ہیں، ان میں میرے مخبر بھی موجود ہیں اور وہ کان کھڑے کر کے لوگوں کی باتیں سن رہے ہوں گے۔

یہ تو میں جانتا ہوں کہ کسی امیر کبیر گاہک نے خود قتل نہیں کیا ہوگا بلکہ اس نے کرائے کا قاتل استعمال کیا ہوگا۔ ان لوگوں کے پنچ نے کہا کہ بعض اوقات کوئی مستقل گاہک ہاتھ سے نکل جاتا ہے جس کی وجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوتی کہ وہ اس عیاشی میں کنگال ہو جاتا ہے اور کوڑی کوڑی کا محتاج ہو کر پھر اِدھر کا رُخ نہیں کرتا۔

اس شخص نے یہ بات ذرا تفصیل سے کی اور بیدار بخت نے اس کی تائید میں اس بات کو کچھ اور آگے بڑھا دیا۔ اس سے میرے ذہن میں ایک اور شک اُبھرا۔

شک یہ تھا کہ کوڑی کوڑی کا محتاج ہو جانا قتل کا باعث ہو سکتا ہے۔ قارئین کرام نے ایسی کہانیاں سنی ہوں گی اور فلمیں دیکھی ہوں گی کہ ایک آدمی کسی طوائف پر دولت لٹاتا رہا اور عیاشی جاری رکھنے کی خاطر جائیداد بھی بیچ ڈالی اور وہ رقم بھی اُڑ گئی اور پاس پلے پھوٹی کوڑی بھی نہ رہی تو طوائف نے اسے دھتکار دیا۔ ذرا اپنے آپ کو تصور میں اس پوزیشن میں لائیں کہ جس پر آپ نے لکھوکھہا روپیہ برباد کر دیا، وہ آپ کو اپنے گھر میں داخل بھی نہ ہونے دے تو آپ کے ذہن میں یہی ایک ارادہ آئے گا کہ اسے قتل کر کے اپنی بربادی اور بے عزتی کا انتقام لیا جائے۔ میں نے تو ایسے تباہ حال شہزادے اور راجکمار اپنی آنکھوں ایڑیاں رگڑتے اور اپنا ماتم کرتے دیکھے ہیں۔

میں نے بیدار بخت سے کہا کہ ان کا کوئی ایسا دیرینہ یا سابقہ گاہک ہو تو مجھے اس کا نام پتہ بتائیں...... بیدار بخت نے فوراً ایک مسلمان تاجر کے بیٹے کا نام لیا۔ میری ڈائری میں یہ نام محفوظ ہے۔ نام منہاج الدین۔ بیدار بخت نے بتایا کہ وہ ایک بڑے ہی دولت مند مسلمان تاجر کا بیٹا ہے۔ یہ کاروبار اناج، بناسپتی گھی، تیل اور ایسی ہی ایک دو اشیاء کی آڑھت تھی جسے کمشن ایجنسی کہا جاتا تھا۔ کاروبار دور دور تک پھیلا ہوا تھا اور آمدنی بے اندازتھی۔ چار پانچ سال پہلے منہاج الدین کا باپ مر گیا۔ بیٹا اکلوتا تھا۔ عمر ستائیں

اٹھائیس برس تھی۔ ابھی شادی نہیں کی تھی۔ باپ کے بعد کاروبار اس کے ہاتھ میں آ گیا اور اتنی زیادہ دولت پا کر وہ عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ اس نے کنول کو دیکھ لیا اور اس کے حسن و جوانی کا اسیر ہو گیا۔

تین ساڑھے تین برسوں میں اس نے باپ کی دولت کنول پر لٹا دی اور پھر جائیداد بھی بیچ ڈالی اور کنول نے اس کا وہی حال کر دیا جو مکڑی اپنے جالے میں آئی ہوئی مکھی کا کیا کرتی ہے۔

اس کا کاروبار چلتا تو رہا لیکن وہ بات نہ رہی جو باپ کے وقتوں میں تھی۔ کاروبار مقروض ہو چکا تھا۔ وہ پھر بھی کنول کے پاس آتا رہا لیکن کنول نے اسے گھر سے نکالا نہیں۔ اسے ملاقات والے کمرے میں بٹھا لیتی تھی اور خود اس کے ساتھ لگ کر بیٹھنے کی بجائے الگ ہٹ کر بیٹھتی اور اس کے ساتھ اس طرح رسمی سی باتیں کرتی تھی جیسے کوئی ملنے والا آیا ہو اور یہ ذرا جلدی چلا جائے تو اچھا ہے۔ کہاں وہ بات کہ یہ شخص آتا اور کنول اس کے آگے بچھ بچھ جاتی تھی اور کہاں یہ وقت کہ کنول اس کے ساتھ روکھی پھیکی سی کچھ باتیں کر کے معذرت کر لیتی کہ ایک صاحب کے آنے کا ٹائم ہو گیا ہے۔

منہاج الدین نے کنول کے پاس تیسرے چوتھے روز آنا اپنا معمول بنا لیا اور کنول کا معمول یہ ہو گیا کہ اسے کچھ دیر بٹھا کر چلتا کر دیتی تھی۔ بیدار بخت نے مجھے بتایا کہ اس نے اور ماں نے کنول سے کہا کہ اس کی چھٹی کراؤ، اور صاف کہہ دو کہ اب یہاں نہ آیا کرے۔ کنول نے انہیں کہا کہ ابھی اس کی بہن کا ایک مکان ہے جو اس کے باپ نے بہن کو دیا تھا، میں وہ بھی بکوانا چاہتی ہوں اس لیے اسے ابھی دھتکاروں گی نہیں۔

منہاج آتا رہا اور کنول اسے کمرے میں بٹھاتی رہی۔ کنول کی ماں نے اور بیدار بخت نے یہ بھی دیکھا کہ منہاج جب کنول کے کمرے سے نکلتا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو ہوتے تھے۔ ان لوگوں نے مجھے بتایا کہ کنول پر فریفتہ سب ہی ہوتے تھے لیکن منہاج تو اس لڑکی کے عشق میں دیوانہ ہو گیا تھا۔

بیدار بخت نے بتایا کہ اسے اور خاص طور پر کنول کی ماں کو یہ شک ہونے لگا کہ ایسا تو نہیں کہ کنول منہاج کی محبت دل میں پیدا کر بیٹھی ہو۔ منہاج خوبرو جوان تھا اور کنول بھی جوانی کے عالم میں تھی اور آخر انسانی جذبات رکھتی تھی۔ ایک روز ماں نے اسے سختی سے کہا

کہ یہ شخص آئندہ یہاں نہ آئے۔ کنول خاموش ہو گئی۔

کنول کی ماں کی بات ابھی یہیں تک پہنچی تھی کہ ہیڈ کانسٹیبل اندر آیا۔ اس نے کنول کی ماں کی طرف دیکھ کر کہا کہ وہ کچھ دیر کے لیے اندر چلی جائے...... اس کے جانے کے بعد ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے اطلاع دی کہ باہر تماشائیوں میں تین آدمی ہیں جنہوں نے اسے بتایا ہے کہ انہوں نے ایک آدمی کو کھڑکی کے راستے اندر جاتے دیکھا تھا۔ ان میں سے ایک نے اسے کھڑکی سے باہر آتے بھی دیکھا تھا۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ تینوں کو اندر لے آئے۔

آج کے زمانے میں لوگ پولیس پر بھروسہ نہیں کرتے بلکہ پولیس کا کردار ایسا بگڑ چکا ہے کہ لوگ پولیس کے ساتھ ذرا سا بھی تعاون نہیں کرتے۔ کسی واردات کا کوئی سراغ کسی کو معلوم ہو تو وہ بھی پولیس سے چھپائے رکھتا ہے۔ سب ڈرتے ہیں کہ پولیس کا کچھ پتہ نہیں، ملزم اثر و رسوخ والا ہوا یا اس نے تھانیدار کے ساتھ مک مکا کر رکھا ہو، تو پولیس ملزم کا ساتھ دے گی اور اس کے خلاف شہادت یا سراغ دینے والے کو ڈرا دھمکا کر بھگا دے گی۔ ہندوستان میں بھی آج کل پولیس کا رویہ یہی ہے۔ ہمارے وقتوں میں یہ بات نہیں تھی۔ لوگ پولیس کا کام آسان کر دیا کرتے تھے۔

تینوں آدمی اندر آئے۔ دو کو میں نے کمرے سے باہر بٹھا دیا اور ایک سے پوچھا کہ اس نے کیا دیکھا تھا۔ اس کے بعد باقی دونوں کو باری باری بلایا اور ان کے بیان لئے۔ ان کے بیانات سے جو سوالات پیدا ہوئے وہ میں نے ان سے پوچھے اور اس طرح کارآمد شہادت مل گئی۔

ان سے یہ معلومات حاصل ہوئیں کہ ان میں سے دو آدمیوں نے ایک آدمی کو کھڑکی میں سے اندر جاتے دیکھا تھا۔ اس کے اندر کود جانے کے بعد انہوں نے کنول کو دیکھا جس نے کھڑکی کے کواڑ اپنے ہاتھوں بند کر دیئے تھے اور پھر پردہ آگے کر دیا تھا۔ یہ دو آدمی یہ منظر دیکھ کر اس پر تبصرہ کرتے ہوئے آگے چلے گئے۔

تیسرا آدمی اس گلی میں سے گزر رہا تھا اور وہ اس کھڑکی سے کم و بیش بیس قدم دور تھا۔ اس نے ایک آدمی کو کھڑکی میں سے باہر کودتے دیکھا۔ اس آدمی نے گلی میں دائیں بائیں دیکھا اور ایک طرف کو تیز تیز چل پڑا۔ اس شخص نے یہ بھی بتایا کہ یہ شخص اس کے

سامنے لایا جائے تو وہ اسے پہچان لے گا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اس نے کھڑکی بند ہوتے دیکھی تھی یا کھڑکی کھلی رہی تھی۔

اس نے جواب دیا کہ اسے معلوم تھا کہ یہ کنول کا گھر ہے۔ چونکہ کنول بڑی خوبصورت لڑکی تھی اس لیے اس شخص نے اشتیاق سے کھڑکی کی طرف دیکھا تھا کہ کنول کی جھلک نظر آ جائے گی لیکن کھڑکی میں وہ نہ آئی اور کھڑکی کے کواڑ کھلے رہے۔ یہ دیکھ کر یہ شخص اپنی راہ لگ گیا۔

یہ تعین ممکن نہیں تھا کہ جو آدمی کھڑکی میں سے اندر گیا تھ وہ کتنی دیر اندر رہا اور کتنی دیر بعد باہر آیا۔ دو آدمی اسے اندر جاتا دیکھ کر چلے گئے تھے جہاں وہ جا رہے تھے۔ تیسرے آدمی کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ جسے وہ باہر نکلتے دیکھ رہا ہے اسے اندر جاتے بھی کسی نے دیکھا تھا۔

میں نے تینوں سے پوچھا تھا کہ اس شخص کا حلیہ کیا تھا۔ جن دو اشخاص نے اسے اندر جاتے دیکھا تھا، وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکے تھے۔ ان کی طرف اس کی پیٹھ تھی۔ انہوں نے وثوق سے بتایا کہ وہ سر سے ننگا تھا، اس نے ہلکے نیلے رنگ کا کرتہ پہن رکھا تھا اور نیچے کھلا پاجامہ تھا جو اس وقت مقبول عام تھا۔ ایسا پاجامہ زیادہ تر مسلمان پہنا کرتے تھے۔

تیسرے آدمی نے بھی بالکل یہی لباس بتایا۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کو آسمانی رنگ کہا تھا۔

میں اس گھر سے باہر نکلا اور ان تینوں آدمیوں کو ساتھ لے کر اس جگہ چلا گیا جہاں سے انہوں نے اس آدمی کو اندر جاتے اور باہر آتے دیکھا تھا۔ میں ہیڈ کانسٹیبل کو کمرے میں ہی چھوڑ آیا تھا اور اسے کہا تھا کہ میں باہر سے آواز دوں گا تو وہ کھڑکی کے راستے باہر آئے۔

میرے پکارنے پر ہیڈ کانسٹیبل نے میری ہدایت پر عمل کیا۔ میں نے یہ نوٹ کیا کہ کمرے کی پوری روشنی اس پر پڑتی تھی اور گلی کے بلب کی روشنی بھی اس پر پڑتی تھی لیکن یہ روشنی کمزور تھی، تاہم چہرہ پہچانا جا سکتا تھا اور عمر کا بھی اندازہ ہو سکتا تھا۔ میں نے اس آدمی سے جس نے اس شخص کو باہر آتے دیکھا تھا، پوچھا کہ اندازاً کس عمر کا تھا۔ اس نے اتنا ہی بتایا کہ وہ جوان آدمی تھا۔ میرے کریدنے پر اس نے حتمی طور پر بتایا کہ اس کی عمر تیس برس

سے کم ہو سکتی ہے زیادہ نہیں۔

میں نے ان تینوں آدمیوں کے نام اور پتے لکھ لیے اور ان کی خوب حوصلہ افزائی کی، ان کے تعاون کا شکریہ بھی ادا کیا اور خراج تحسین بھی پیش کر کے کہا کہ وہ کل صبح سورج طلوع ہوتے ہی تھانے پہنچ جائیں اور دل میں کسی قسم کا وہم اور خوف نہ رکھیں۔ میرا انداز ایسا دوستانہ بلکہ مشفقانہ تھا کہ انہوں نے بصد شکریہ کہا کہ وہ کل علی الصبح تھانے میں موجود ہوں گے۔

میں کنول کے کمرے میں چلا گیا۔ اب یہ واضح ہو چکا تھا کہ یہ شخص کنول کی رضامندی سے کھڑکی کے راستے اندر گیا تھا۔ ان دو آدمیوں نے بڑے واضح الفاظ میں مجھے بتایا کہ وہ شخص کھڑکی کے اندر چلا گیا تو کھڑکی کنول نے خود بند کی تھی اور پردہ بھی آگے کر دیا تھا۔ اب سوال یہ تھا، کیا یہی شخص قاتل تھا؟ یہاں آ کر میرا ذہن الجھ گیا۔ اگر وہ قتل کی نیت سے کمرے میں گیا تھا تو کنول کو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ یہ شخص کسی وجہ سے اس سے نالاں ہے اور انتقامی کارروائی کر سکتا ہے۔ اس صورت میں کنول اسے کھڑکی میں سے نہ آنے دیتی اور وہ شخص زبردستی اندر جانے کی کوشش کرتا تو کنول وہاں سے اندر کو بھاگتی اور شور مچاتی۔

اس سے مجھے یہ شک ہوا کہ اس کے ساتھ کنول کے خفیہ مراسم ہوں گے۔ یہ شخص چلا گیا اور کھڑکی کھلی رہ گئی ہو گی اور کوئی ایسا شخص آ گیا جو کنول کو کسی وجہ سے قتل کرنا چاہتا ہو گا۔ کھڑکی کھلی دیکھ کر اور کنول کو میک اپ کرتے دیکھ کر وہ دبے پاؤں کھڑکی سے اندر گیا اور کنول کو گردن سے دبوچ کر ہلاک کر گیا...... وہ کون تھا؟

میں نے کنول کی ماں کو کمرے میں بلایا اور اسے کہا کہ وہ اس منہاج الدین کے متعلق باقی بات سنائے...... اس نے سنایا کہ اگلی شام دروازے پر دستک ہوئی تو کنول کی ماں دروازہ کھولنے کے لیے اس توقع پر گئی کہ یہ منہاج ہو گا۔ اس نے دروازہ کھولا تو وہ منہاج ہی تھا۔ کنول کی ماں نے اسے کہا کہ آج کنول اسے نہیں مل سکے گی۔ منہاج نے پہلی سی بے تکلفی سے ماں سے کہا کہ وہ ذرا سی دیر کے لیے کنول کے پاس جانے دے لیکن اس عورت نے نمایاں بے رخی کا مظاہرہ کرتے ہوئے انکار کر دیا۔ منہاج نے منت سماجت کی تو اس عورت نے رسماً کہہ دیا کہ پھر کبھی آنا۔ منہاج مایوسی کے عالم میں چلا گیا۔ ماں نے

اندر آ کر کنول کو بتایا کہ منہاج آیا تھا اور اس نے اسے یہ کچھ کہہ کر چلتا کیا ہے۔ کنول نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا۔

اس کے بعد منہاج وہاں جاتا رہا۔ کتنی بار گیا؟ یہ گنتی بتانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی نہ کنول کی ماں نے صحیح گنتی بتائی تھی، اس نے کہا تھا کہ وہ کئی بار آیا اور ہر بار ماں نے یا بیدار بخت نے اسے باہر سے ہی چلتا کیا۔ اس عورت نے بتایا کہ تین چار مرتبہ وہ رو پڑا اور ہاتھ جوڑ کر کہا کہ صرف اندر آنے دو، کنول کو دیکھوں گا اور چلا جاؤں گا۔ ماں نے آخر ایک روز اسے سختی سے کہا کہ وہ یہاں نہ آیا کرے۔ دو مرتبہ بیدار بخت نے بھی اسے آنے سے روکا۔

اب کنول کی ماں نے ایک ایسا انکشاف کیا کہ یوں لگا جیسے آسمانی بجلی بڑی زور سے چمکی ہو اور گھپ اندھیرے میں مجھے زمین و آسمان کا ذرہ ذرہ پتا پتا نظر آ گیا ہو۔ اس نے بتایا کہ آج رات بھی منہاج الدین آیا تھا۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کے آنے کا وقت ہمیشہ یہی رہا ہے، ساڑھے سات اور آٹھ بجے کے درمیان۔ قتل کی شام بھی وہ اسی وقت آیا تھا۔ اس شام بیدار بخت نے کنول کی ماں سے کہہ دیا کہ آج اسے سختی سے کہہ دو کہ یہاں پھر کبھی نہ آئے اور وہ پھر کبھی آیا تو اسے یہاں سے مار پیٹ کر اور اپنے دوستوں سے پٹوا کر اور پھر اٹھا کر اس علاقے سے باہر پھینک دیا جائے گا۔

دستک پر دروازہ کنول کی ماں نے کھولا اور اسے دیکھتے ہی اس پر برس پڑی اور یہی دھمکی دی جو اسے بیدار بخت نے بتائی تھی۔ اس عورت نے بتایا کہ منہاج کا ردعمل یہ تھا کہ وہ پہلے کی طرح رویا نہیں اور نہ اس نے بھکاریوں کے لہجے میں بات کی اور نہ ہی منت سماجت کی بلکہ قہر بھری نظروں سے اس عورت کو دیکھا اور اس طرح سر اوپر نیچے آہستہ سے ہلایا جیسے اس نے اس عورت کا چیلنج قبول کر لیا ہو اور وہ انتقامی کارروائی یا جوابی حملہ کرے گا۔ یہ بھی ذہن میں رکھیں کہ کنول کی ماں گھریلو عورت نہیں تھی، وہ گناہوں میں جنی پلی اور یہ عمر گناہوں میں ہی گزار دی تھی۔ اس نے پتھروں جیسے مردوں کو موم کیا تھا اور اچھے اچھوں کو تگنی کا ناچ نچایا تھا۔ چہرے سے کسی کے دل کا حال معلوم کر لینا اس کا ایک خصوصی کمال تھا جو گناہوں کی اس دنیا کی ہر عورت میں ہوتا ہے۔ مجھے زیادہ کرید نہ کرنی پڑی، اس عورت نے خود ہی بتا دیا کہ منہاج کا ردعمل ایسا نہیں تھا کہ وہ شکست خوردہ ہو کر اور مایوسی سے سر

جھکا کر چلا گیا ہو۔

اس عورت نے فوراً ہی اندر آ کر بڑے غصے سے دروازہ کھڑاک سے بند کیا اور دونوں چٹخنیاں چڑھا دیں۔ اس وقت کنول اپنے کمرے میں تھی اور بیدار بخت غسل خانے میں جا چکا تھا۔ بیدار بخت نہا کر نکلا۔ وہ کپڑے پہن رہا تھا اور کنول کی ماں کنول کے کمرے میں دیکھنے گئی کہ وہ کیا کر رہی ہے اور کیا وہ تیار ہو چکی ہے۔ دروازہ کھولا ہی تھا کہ اس نے کنول کو فرش پر پڑے دیکھا اور اس کی چیخ نکل گئی۔ بیدار بخت دوڑا آیا اور باورچی خانے سے نوکر بھی آ گیا۔

بیدار بخت نے کنول کی نبض دیکھی۔ پھر دوسرے بازو کی نبض دیکھی اور اس نے سر جھکا لیا۔ ماں نے تڑپ کر پوچھا کہ اسے اٹھاتے کیوں نہیں۔ اس وقت بیدار بخت کی دھاڑیں نکل گئیں اور اس نے بتایا کہ یہ تو مری پڑی ہے۔ دونوں نے کھڑکی کی طرف دیکھا تو کھڑکی کھلی پائی۔

میں نے کنول کی ماں سے پوچھا کہ منہاج الدین نے کپڑے کیسے پہن رکھے تھے۔ اس نے وہی کپڑے بتائے یعنی نیلے رنگ کا کرتہ اور کھلا پاجامہ۔ وہ سر سے ننگا تھا۔

مجھے فوراً خیال آیا جو ایک یقین کی صورت اختیار کئے ہوئے تھا کہ کھڑکی میں جو شخص کنول کے کمرے میں گیا تھا وہ منہاج ہی تھا لیکن میرے اس یقین کو یہ بات متزلزل کر رہی تھی کہ دیکھنے والوں نے دیکھا تھا کہ کنول نے اسے رضامندی سے کھڑکی میں سے اندر کو گزارا تھا اور پھر اس نے کھڑکی بند کر کے پردے آگے کر دیئے تھے۔ اس سے قدرتی طور پر یہ شک ابھرتا تھا کنول کی ماں کو یہ جو وہم تھا کہ کنول منہاج کی محبت میں پھنس گئی ہے، ٹھیک ہے لیکن وہ قتل کیوں ہوئی؟ کس طرح ہوئی؟ قاتل کون تھا؟ کیا یوں ہوا ہو گا کہ منہاج الدین نے مقتولہ کی ماں سے بے عزتی کروا کے کنول کو انتقامی طور پر قتل کیا؟ ایک خیال یہ بھی آیا کہ بیدار بخت نے منہاج الدین کو کنول کے ساتھ کمرے میں دیکھ لیا ہو گیا اور کنول کو برا بھلا کہا ہو گا اور کنول نے بدتمیزی کی ہو گی اور اسے ڈرانے کے لیے بیدار بخت نے اس کی گردن دبائی ہو گی۔ کنول نازک اندام لڑکی تھی، ذرا سی گردن دبانے سے مر گئی ہو گی اور منہاج بھاگ گیا ہو گا۔

یہ میرے دماغ کا بڑا ہی سخت امتحان تھا۔ دماغ پر یوں زور دیا جس طرح لیموں

نچوڑا جاتا ہے اور آخر میں آخری قطرہ نچوڑ لینے کے لئے پورا زور لگایا جاتا ہے۔ میرے ذہن میں ہلکے نیلے رنگ کا کرتہ اور کھلا پاجامہ اٹک گیا۔ پھر یہ بات کہ کنول کی ماں نے منہاج کو دھتکار دیا تھا اور منہاج کا ردعمل پُرخطر تھا...... میں نے بیدار بخت سے پوچھا کہ وہ جانتا ہے کہ منہاج کہاں رہتا ہے؟

اس نے بتایا کہ اس کی بہت بڑی حویلی تھی جو بک چکی ہے اور اب وہ ایک اور محلے میں کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ بیدار بخت کو صرف محلّہ معلوم تھا، مکان معلوم نہیں تھا۔ یہ معلوم کرنا پولیس کے لیے کوئی دشوار مہم نہیں تھی۔

میرا ارادہ تو یہ تھا کہ بیدار بخت اور کنول کی ماں بری طرح صدمے کی حالت میں ہیں اور اس حالت میں میری پوچھ گچھ پوری طرح چل نہیں رہی تو میں اگلے روز ان سے تفتیش کروں گا لیکن ایسا انکشاف ہو گیا کہ میں نے طے کر لیا کہ آج رات سوؤں گا ہی نہیں۔ بیدار بخت کو، ہیڈ کانسٹیبل اور کانسٹیبلوں کو ساتھ لیا اور ہم منہاج کے محلے کی طرف چل پڑے۔ فاصلہ کچھ زیادہ تھا لیکن میں نے اس کی پرواہ نہ کی۔ چلنے لگے تو بیدار بخت نے یہ کہہ کر روک لیا کہ تانگہ مل جائے گا اور گلیوں کی بجائے سڑک سے چلتے ہیں، جلدی پہنچ جائیں گے۔

وہ ہمیں کھلے بازار کی طرف لے گیا۔ اس نے تانگے والے سے بات کی اور ہم سب سوار ہو گئے۔ کنول کا قتل بری طرح مشہور ہو گیا تھا۔ تانگے والے نے پہلی بات یہ پوچھی کہ کچھ پتہ چلا کہ قاتل کون ہے۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ رات کے بارہ بج چکے تھے...... پندرہ بیس منٹ بعد بیدار بخت نے ایک جگہ تانگہ رکوایا۔ تانگے والے کو پیسے اسی نے دیئے اور ہمیں اتار کر ایک گلی میں لے گیا۔ آدھی رات کا وقت، گلیاں ویران اور سنسان پڑی تھیں۔ بیدار بخت نے ایک گلی کی نکڑ پر پہنچ کر کہا کہ گلی شاید یہی ہے۔ میں نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ کسی دروازے پر دستک دو۔ اس نے ایک دروازے پر دستک دی اور کچھ دیر بعد دروازہ کھلا۔ گلی میں کھمبے کے بلب کی روشنی تھی۔ دروازہ کھولنے والا غالباً ہندو تھا۔ پولیس کو دیکھ کر وہ تو ہکلانے اور تھتھیانے لگا اور میرا خیال ہے کہ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اسے ہم نے صرف اس لیے زحمت دی ہے کہ

ایک شخص کا گھر معلوم کرنا ہے۔ بیدار بخت نے منہاج الدین کے باپ کا نام لیا اور پھر منہاج کا نام لے کر پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ بڑا اچھا اتفاق ہوا کہ اسے اس گھر کا علم تھا۔

منہاج کے دروازے پر ہاتھ مارا اور ایک منٹ بعد ایک خاتون نے دروازہ کھولا۔ اس گلی میں بھی تھوڑی دور ایک بلب جل رہا تھا۔ جس کی روشنی میں یہ نظر آ رہا تھا کہ ہم پولیس کی وردی میں ہیں۔ ہمیں دیکھ کر وہ باہر آ گئی اور گھبرائے ہوئے لہجے میں پوچھا کہ ہم کیوں آئے ہیں۔ میرے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ منہاج کی ماں ہے۔

میں نے اسے نہ بتایا کہ اس کے بیٹے پر ایک طوائف کے قتل کا شبہ ہے اور اسے تھانے لے جانا ہے۔ میں نے اسے مسلمان خاتون سمجھتے ہوئے پورے ادب اور احترام سے بات کی۔ میں نے کہا کوئی سنگین معاملہ نہیں، منہاج کو تھانے لے جا کر کچھ پوچھنا ہے۔ پھر میں نے پوچھا کہ منہاج گھر میں ہی ہوگا۔ ماں نے بتایا کہ وہ شام سات بجے سے کچھ پہلے نکل گیا تھا اور ابھی تک واپس نہیں آیا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ یہ سمجھ کر نکلی تھی کہ منہاج آ گیا ہے۔

میں نے ماں سے پوچھا کہ منہاج ہر رات دیر سے آتا ہے یا آج ہی ایسا ہوا ہے کہ آدھی رات تک نہیں آیا؟...... ماں نے آہ بھر کر کہا یہ تو اس کا معمول ہے اور کوئی ایسی رات بھی آ جاتی ہے کہ وہ گھر آتا ہی نہیں۔ وہ شائستہ خاتون تھی، اس نے ایسی کوشش نہ کی کہ ہمیں باہر ہی سے ٹال دیتی، اس کی بجائے اس نے کہا کہ آپ اندر آ کر بیٹھیں، باہر کھڑے اچھے نہیں لگتے۔

ہم اندر چلے گئے۔ چھوٹا سا مکان تھا۔ چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ اس نے ہمیں ایک کمرے میں بٹھایا۔ فرنیچر اچھی قسم کا اور ہر چیز بتا رہی تھی کہ امیروں کا گھر ہے لیکن یہ مکان امیروں والا نہیں تھا

''یہ دن بھی دیکھنا تھا'' ــــــ منہاج کی ماں نے غمزدہ آواز میں کہا ــــــ ''منہاج اس باپ کا بیٹا ہے جسے پولیس والے ادب و احترام سے سلام کیا کرتے تھے مگر آج بیٹے کو پولیس ڈھونڈتی پھر رہی ہے''۔

ماں کے آنسو بہہ نکلے۔ میں نے پھر اسے تسلیاں دیں جو سراپا جھوٹ تھیں لیکن ماں

تو بے قصور تھی۔ میں نے اس معزز خاتون سے کہا کہ منہاج گھر میں ہے تو اسے میرے سامنے لے آئیں، ہم اسے گرفتار تو نہیں کریں گے۔ ماں نے کہا کہ یہ کون سا محل ہے جس کے بیسیوں کمرے ہوں گے، غلام گردشیں اور راہداریاں ہوں گی اور ان بھول بھلیوں میں کسی بندے کا سراغ ہی نہ ملے گا، دو کمروں کا مکان ہے، آپ خود دیکھ لیں۔

اس خاتون کے ساتھ باتیں ہوئیں تو پتہ چلا کہ اس کی ایک شادی شدہ بیٹی ہے جو اسی شہر میں اپنے مکان میں رہتی ہے۔ یہ مکان اسے ماں باپ نے جہیز میں دیا تھا۔ اس خاتون کی اور کوئی اولاد نہیں تھی۔ اس ماں نے کوئی ڈھینگ نہ ماری کہ وہ کبھی بہت ہی امیر ہوا کرتے تھے اور اب غریب ہو گئے ہیں۔ اس کا انداز پُر وقار تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا اب کیا کارروائی یا اقدام کروں۔

میں اس سوچ میں الجھا ہوا ہی تھا کہ دروازے میں ایک جواں سال آدمی آن کھڑا ہوا۔ مجھے یوں دھوکہ ہوا جیسے میں خواب یا تصویر دیکھ رہا ہوں۔ اس خوبرو جوان نے ہلکے نیلے رنگ کا کرتہ اور کھلا پاجامہ پہن رکھا تھا۔ وہ سر سے ننگا تھا۔ اس نے بغیر جھینپ اور جھجک کے السلام علیکم کہا اور آگے آ کر میرے ساتھ ہاتھ ملایا۔ خاتون نے کہا کہ یہ ہے میرا منہاج بیٹا۔ میں نے شگفتہ اور دوستانہ انداز سے اس کے ساتھ ہاتھ ملایا اور اسے کھینچ کر اپنے ساتھ لگا لیا اور دوسرے ہاتھ سے اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

منہاج کے کرتے سے ایک خاص خوشبو اٹھ رہی تھی۔ جس نے مجھے چونکا دیا۔ یہی خوشبو کنول کے کمرے میں پھیلی ہوئی تھی اور جب میں نے اس کے بال اس کے گردن اور چہرے سے ہٹائے تھے تو بالوں سے یہی خوشبو اٹھ رہی تھی۔ ضروری نہیں تھا کہ اس خوشبو سے میں یہ تاثر لیتا کہ یہی کنول کا قاتل ہے۔ کنول نے رضامندی سے اپنے کمرے میں کھڑکی کے راستے داخل کیا تھا اور اس نے کنول کو اپنے ساتھ لگایا ہو گا، اسے بازوؤں میں لیا ہو گا اور اس طرح اس کے بال منہاج کے کرتے کے ساتھ مس کرتے رہے اور چار گھنٹوں بعد بھی مقتولہ کے بالوں کی خوشبو منہاج کے کرتے میں موجود تھی۔ یہ خوشبو قتل ثابت نہیں کر سکتی تھی۔

میں نے منہاج سے پوچھا کہ وہ کہاں سے آ رہا ہے؟...... اس نے ایک مسلمان کا نام لیا اور کہا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ وہاں تاش کھیل رہا تھا اور یہ وقت ہو گیا ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ وہ اپنے دوستوں کے نام اور پتے بتائے اور میں ان سے بھی دریافت کروں گا۔ اس نے چار نام لئے جن میں دو ہندو اور دو مسلمان تھے۔ پانچواں بھی مسلمان تھا اور منہاج کے بیان کے مطابق اس کے گھر تاش کھیلتے رہے تھے۔

میں نے منہاج کو ساتھ لیا اور اسے کہا کہ وہ مجھے اپنے ہر دوست سے ملوائے۔ میں پوری تفصیل سے بیان کروں تو بات بہت لمبی ہو جائے گی، مختصراً یوں ہوا کہ ہم چار گھروں تک گئے، باری باری ہر دروازے پر دستک دی اور اس طرح منہاج کے چاروں دوست مجھے مل گئے۔ ہر گھر کے سامنے یہ تماشا ہوا کہ گھر کے افراد باہر نکل آئے اور پولیس کو دیکھ کر اتنے پریشان ہوئے کہ سب کی حالت غیر ہونے لگی۔ میں نے سب کو تسلیاں دیں کہ ان کے بیٹے پر کوئی الزام نہیں۔ میں ان چاروں دوستوں کو ساتھ لے کر چلا تو ان کے خاندانوں کے ایک ایک دو دو آدمی بھی پیچھے پیچھے چل پڑے لیکن میں نے انہیں روک دیا۔ پھر میں نے منہاج سے کہا کہ وہ ہمیں اس گھر لے چلے جہاں وہ تاش کھیلے رہے تھے...... وہ مجھے ایک گھر تک لے گئے، دستک دی اور اندر سے ایک آدمی نکلا۔ منہاج نے بتایا کہ یہ دوست اکیلا رہتا ہے اور وہ اس کے گھر تاش کھیلا کرتے ہیں۔

میں نے یہ انتظام کیا کہ خود اس آدمی کے گھر کے اندر ایک کمرے میں بیٹھ گیا اور باقی سب کو گلی میں ہیڈ کانسٹیبل کی نگرانی میں چھوڑ دیا۔ بیدار بخت ابھی تک میرے ساتھ تھا۔ مجھے اس وقت اس کی ضرورت نہیں تھی اس لیے اسے جانے کی اجازت دے دی اور کہا کہ وہ اگلے روز تھانے آ جائے۔

میں منہاج کے جس دوست کے گھر میں بیٹھ گیا تھا، اسی کو پاس بٹھا لیا اور پوچھا کہ منہاج یہاں شام کتنے بجے آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ یہ سب دوست سات ساڑھے سات بجے کے درمیان اکٹھے آئے تھے اور پھر یہیں بیٹھے تاش کھیلتے رہے۔ یہ سب امیر زادے تھے۔ ان کا کوئی دین دھرم تھا ہی نہیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں نے اکٹھے کھانا کھایا اور پتہ چلا کہ وہ جب بھی اکٹھے ہوتے ہیں، کھانا بھی مل کر کھاتے ہیں۔ یہ شخص جس کے گھر میں یہ تاش کھیلتے رہے تھے، ان میں سے ایک کے باپ کا منیم تھا اور گھر میں اکیلا رہتا تھا۔

پھر میں نے چاروں دوستوں کو باری باری بلایا اور یہی باتیں پوچھیں جو منیم سے پوچھی تھیں۔ سب نے وہی وقت بتایا جو منیم نے بتایا تھا۔ میں نے ہر ایک کی بات سے بت

نکالی اور الٹے سیدھے سوال کئے اور ہر ایک سے یہ بھی کہا تھا کہ ان کی گواہی جھوٹی ثابت ہوئی تو انہیں اس کی سزا ملے گی جو دو سال تک ہو سکتی ہے لیکن کسی ایک نے بھی ڈر کر اپنا بیان نہ بدلا۔

میں نے ہر ایک سے الگ الگ یہ پوچھا تھا کہ اس دوران منہاج کچھ دیر کے لیے کہیں چلا گیا ہوگا۔ سب نے کہا کہ وہ ایک منٹ کے لیے بھی باہر نہیں نکلا۔

میں یہاں ایک خاص بات کہنا چاہتا ہوں۔ میں قتل کی اس واردات کی تفتیش تندہی سے کر رہا تھا۔ آدھی رات گزر گئی تھی اور میں نے تفتیش جاری رکھنے کا تہیہ کر لیا تھا لیکن مجھ میں وہ یکسوئی ناپید تھی جو ہر واردات کی تفتیش میں ہوا کرتی تھی۔ میں تو یہ بھی کہوں گا کہ اس تفتیش سے مجھ میں کچھ بددلی بھی پیدا ہو گئی تھی۔ وجہ یہ تھی جو میں پہلے بتا چکا ہوں کہ 1947ء ماہ جولائی تھا جب آزادی ملنے میں ایک مہینہ اور کچھ دن رہ گئے تھے۔ ہندوؤں نے مسلمانوں پر قاتلانہ حملے شروع کر دیئے تھے۔ بہار کے کچھ علاقوں سے اطلاعیں مل رہی تھیں کہ وہاں ہندو باقاعدہ منظم طور پر مسلمانوں کے دیہات پر حملے کر رہے ہیں۔ میرے دل میں تلخی سی پیدا ہو گئی تھی اور میں سوچتا تھا کہ انگریزوں کا قانون چند دنوں کا مہمان ہے اور اس کے بعد ہندوستان آزاد ہو گا۔ میں اس ہندوستان کے قانون کو تسلیم ہی نہیں کرتا جہاں مسلمانوں کو صرف اس لیے قتل کیا جا رہا ہے کہ انہوں نے الگ اسلامی مملکت حاصل کر لی ہے۔ منہاج الدین اگر مسلمان نہ ہوتا تو پھر شاید مجھ میں یکسوئی بھی آ جاتی اور میں ملزم کو ایک رات کے اندر اندر اس مقام پر لے آتا جہاں وہ میرے قدموں میں بیٹھ کر جرم کا اقبال کر لیتا۔ میرے وہ قارئین کرام جن کا تعلق پولیس کے ساتھ ہے، یہ محسوس کرتے ہوں گے کہ میں نے یہ تفتیش بددلی کے عالم میں کی تھی۔

میں نے تسلیم کر لیا کہ منہاج الدین قتل کے وقت کہیں اور تھا اور اس کی گواہی پانچ آدمی دے رہے تھے پھر بھی میں منہاج الدین کو اپنے ساتھ تھانے لے گیا اور اس کے پانچوں دوستوں کو کہہ گیا کہ وہ شہر سے باہر کہیں نہ جائیں کیونکہ کسی بھی وقت ان کی تھانے میں طلبی ہو سکتی ہے۔

سحر کے ساڑھے تین بج چکے تھے۔ منہاج کو میں نے کانسٹیبلوں کے حوالے کیا اور کہا کہ اسے رات اپنے ساتھ آرام سے رکھیں اور صبح اسے ناشتہ واشتہ بھی کرا دیں۔ میں ذرا

آرام کے لئے گھر چلا گیا۔

اگلی صبح تھانے آیا تو منہاج ناشتہ کر چکا تھا۔ میں نے اسے اپنے دفتر میں بلا کر بٹھایا۔ اس نے پوچھا کہ یہ معاملہ کیا ہے اور اسے کس شبہے میں تھانے رکھا ہے۔ میں نے ہنستے مسکراتے ہوئے اسے کہا کہ اس پر کوئی الزام نہیں، میں ایک تفتیش کر رہا ہوں جس میں مجھے اس کی ضرورت ہے۔

''کنول کو جانتے ہو؟'' ـــــ میں نے پوچھا۔

''کنول طوائف؟'' ـــــ منہاج نے پوچھا اور میرے جواب کا انتظار کئے بغیر بولا ـــــ ''کنول طوائف کو تو میں ساری عمر نہیں بھولوں گا۔ اپنی سب دولت اور جائیداد اس پر قربان کر دی ہے''۔

اتنی سی بات پوچھ کر میں باہر نکلا اور ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ ان تینوں آدمیوں کو فوراً تھانے لے آئے جنہوں نے رات ایک آدمی کو کنول کی کھڑکی میں سے اندر جاتے اور باہر آتے دیکھا تھا۔

ویسے ہی میری نظر منہاج کے کرتے پر گئی تو مجھے اس کی دائیں آستین پر ہلکا سرخ نشان نظر آیا جیسے کسی بچے نے رنگ والا برش مارا ہو۔ نشان کچھ لمبوترا اور بے ترتیب سا تھا اور ایسا نمایاں بھی نہیں تھا کہ آنکھ اسے فوراً دیکھ لیتی۔ میں نے منہاج سے پوچھا کہ یہ کیسا نشان ہے۔ اس نے کرتے کی دائیں آستین دیکھی اور کہنے لگا کہ آج دکان پر مال آیا تھا اور وہ ڈبے دیکھتے اور الٹ پلٹ کرتے یہ داغ لگ گیا ہوگا۔ اس کی دکان دراصل کمیشن ایجنسی تھی۔

منہاج نے جھنجھلا کر اور بہت ہی پریشانی کے لہجے میں پوچھا کہ یہ آخر معاملہ کیا ہے اور کنول کے متعلق مجھ سے کیوں پوچھا جا رہا ہے؟...... میں نے اسے بتایا کہ تمہاری کنول قتل ہو گئی ہے۔

''ہائیں!'' ـــــ منہاج نے حیرت زدگی کے لہجے میں کہا ـــــ ''کب؟ کہاں؟ کس طرح؟...... اللہ تیرا شکر، اس خوبصورت ڈائن کا یہی انجام ہونا چاہئے تھا''۔

''لیکن قتل کا الزام تم پر ہے'' ـــــ میں نے کہا ـــــ ''شہادت بھی کچھ ایسی ہی چلی آ رہی ہے''۔

"لاحول ولا!"۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ "میں نے اسے قتل کر کے کیا لینا تھا۔ کوڑی کوڑی کا محتاج ہو گیا ہوں۔ اس نے تو مجھے نہیں لوٹا، میں خود لٹتا رہا ہوں"۔

"سنا ہے وہ تمہاری محبت میں مبتلا ہو گئی تھی"۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ "اور تم اسے چوری چھپے ملتے جاتے تھے"۔

"مجھ سے نہیں"۔۔۔ منہاج نے کہا۔۔۔ "اسے میرے روپے پیسے سے محبت تھی۔ میں اسی خوش فہمی میں اندھا ہو کر کہ وہ مجھے چاہتی ہے، لٹتا رہا اور اب نہ پیسہ رہا نہ جائیداد رہی"۔

میں ایک بات خاص طور پر دیکھ رہا تھا۔ وہ پُر اعتماد لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس کے چہرے پر اور انداز میں گھبراہٹ کا شائبہ تک نہ تھا۔ میں نے اس پر بہت جرح کی اور بال کی کھال اتارنے کے انداز سے بہت کچھ پوچھا لیکن وہ بلا جھجک جواب دیتا رہا۔

مجھے ہیڈ کانسٹیبل نے اشارے سے بتایا کہ وہ تینوں آدمی آ گئے ہیں۔ میں باہر نکلا اور ان تینوں آدمیوں سے کہا کہ وہ باری باری اس طرح میرے دفتر میں آئیں جیسے کوئی بات کرنے آئے ہوں لیکن وہ منہاج کو غور سے دیکھیں اور بتائیں یہ تھا کہ وہ شخص جو کھڑکی میں سے اندر گیا اور باہر آیا تھا؟...... میں دفتر میں آ کر بیٹھ گیا اور منہاج سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔

ایک آدمی اندر آیا۔ اس نے اپنا منہ میرے کان کے ساتھ لگایا اور میں ویسے ہی سر ہلاتا رہا۔ اس آدمی نے منہاج کو دیکھا اور باہر نکل گیا۔ پھر دوسرا آدمی آیا اور بولا کہ وہ میرے ساتھ کوئی بات کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ وہ باہر بیٹھے، میں اسے بلاؤں گا۔ پھر تیسرا آدمی آیا اور اس نے بھی یہی اداکاری کی اور دفتر سے نکل گیا۔

میں باہر نکلا اور تینوں سے پوچھا کہ انہوں نے کیا دیکھا ہے۔ جن دو آدمیوں نے ایک شخص کو کھڑکی میں سے اندر جاتے دیکھا تھا، انہوں نے کہا کہ کپڑے اسی قسم کے تھے لیکن وہ چہرہ نہیں دیکھ سکے تھے۔ تیسرے آدمی نے چہرہ دیکھا تھا۔ اس نے وثوق سے کہا کہ وہ یہی آدمی تھا۔ اس نے ذرا سے بھی شک وشبہ کی بات نہ کی۔ اسے یقین تھا کہ وہ یہی تھا۔

میں نے اب منہاج پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ میں اسے اقبال جرم کی طرف لا رہا تھا۔

"آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں"۔۔۔ منہاج نے کہا۔۔۔ "مجھ میں کسی کو قتل کرنے کی ہمت نہیں نہ میرے پاس کنول کو قتل کرنے کی کوئی وجہ ہے۔ میں نے اپنی ماں کو بہت دکھ دیئے ہیں۔ یہ بے چاری روح کش اذیت میں مبتلا ہے۔ میں باقی عمر اس کی خدمت کرنا چاہتا ہوں اور میری نجات کا یہی ایک ذریعہ ہے۔ میں آپ کو ایک راستے پر ڈال سکتا ہوں۔ کنول کا قاتل اس کے سوا اور کوئی ہو نہیں سکتا"۔

اس نے ایک آدمی کا نام لیا۔ نام تھا نوابزادہ شہزاد علی۔ اس نوابزادے کو میں جانتا تھا۔ اس کی اس وقت عمر چالیس برس کے قریب تھی۔ بہت بڑا جاگیردار تھا۔ یہ جاگیر اس کے دادا پردادا کو انگریزوں نے دی تھی۔ اس کا باپ مر چکا تھا اور اب وہ بلا شرکت غیرے اتنی بڑی جاگیر کا مالک تھا۔ عیاش اور بدکردار آدمی تھا جیسا کہ عام طور پر جاگیردار ہوا کرتے ہیں۔ اس نے پیشہ ور غنڈے پالے ہوئے تھے۔ اپنی جاگیر میں آنے والے دیہات میں اس نے اپنی ایک ریاست بنا رکھی تھی اور اچھے اچھے لوگ بھی اس سے ڈرتے تھے۔

منہاج نے بتایا کہ وہ کنول کا مستقل گاہک ہے اور اس پر دولت نچھاور کرتا رہتا ہے۔ یہ بھی کہ موسم گرما میں وہ کنول کو شملہ اور ڈلہوزی لے جایا کرتا اور دس دس پندرہ پندرہ دن وہاں رکھتا تھا۔

ان ہی دنوں منہاج بھی کنول کا گاہک تھا۔ منہاج نے مجھے بتایا کہ ایک بار اس نوابزادے نے اسے دھمکی آمیز لہجے میں کہا تھا کہ وہ کنول کے پاس نہ جایا کرے کیونکہ کنول کلی طور پر اس کی ملکیت ہے۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ میں کنول کے ہاں جاتا رہا اور ایک روز نوابزادے کے ایک غنڈے نے منہاج کو دھمکی دی کہ اس نے کنول کے پاس جانا ترک نہ کیا تو اسے قتل کر دیا جائے گا۔

منہاج نے یہ بھی بتایا کہ نوابزادہ شہزاد علی کنول کی ماں کو اور بیدار بخت کو بھی ایسی ہی دھمکیاں دیتا رہتا تھا۔

مختصراً یہ انکشاف یوں ہوا کہ منہاج نے نوابزادہ کے رویے کے متعلق اتنی زیادہ باتیں بتائیں اور ایسے پُر اثر انداز سے بتائیں کہ میں اس لائن پر سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ قارئین کرام کی اکثریت ایسی ہو گی جو عصمت فروشوں، خصوصاً اعلیٰ درجے کی طوائفوں کی

دنیا کو تصور میں بھی نہیں لا سکتے۔ یہ باتیں ایسے قارئین سمجھنے میں ذرا دشواری محسوس کریں گے۔ ہندوستانی اور پاکستانی معاشرے کے دو شعبے ایسے ہیں جنہیں صرف پولیس جانتی ہے۔ جاننے کا مطلب یہ ہے کہ پولیس ان کے دلوں کے بھید بھی اور ان کی اصلیت بھی نہایت اچھی طرح جانتی ہے۔ منہاج نے جب اس نوابزادے کا ذکر چھیڑا تو میں اس لیے تسلیم کرتا چلا گیا کہ ایسے نوابزادوں کی زندگی اسی طرح گزرتی ہے اور بے تاج بادشاہ بن کر گناہوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔

دوسرا شعبہ پیروں اور شاہ صاحبوں اور عاملوں کا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ہمارا تمام تر دیہاتی علاقہ پیروں کے کنٹرول میں ہے۔ دیہات میں ہی نہیں شہروں میں بھی لوگ پیر پرستی کو مذہب کا حصہ بنائے ہوئے ہیں۔ پیروں کی دنیا اتنی پُراسرار اور خفیہ ہے کہ اسے اچھے اچھے تعلیم یافتہ لوگ بھی نہیں سمجھ سکتے۔ صرف پولیس ان کے اندر کے کردار اور ابلیسی کارگزاریوں کو جانتی ہے۔ اکثر بڑے یعنی سنگین جرائم کے پیچھے ان جاگیرداروں اور پیروں کا ہاتھ ہوتا ہے۔

منہاج نے نوابزادہ شہزاد علی کے جن دو تین آدمیوں کے نام لئے تھے، وہ مشہور معروف غنڈے اور پختہ کار جرائم پیشہ تھے۔ ان میں ایک کا ریکارڈ تھانے میں موجود تھا میرے اس تھانے میں آنے سے چند برس پیشتر یہ شخص قتل کی ایک واردات میں گرفتار ہوا تھا۔ ملزم چار پانچ تھے۔ اس شخص نے اس وعدے پر اقبال جرم کر لیا کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنایا جائے گا جو اسے بنایا گیا اور اس نے اقبالی بیان دے کر سب کو سزا دلا دی اور خود قاتل ہوتے ہوئے بھی سزا سے بچ گیا تھا۔

میں نے ابھی مقتولہ کی پوسٹ مارٹم کی رپورٹ کا حوالہ نہیں دیا۔ اب دیتا ہوں۔ مقتولہ کی موت گلا گھونٹنے سے واقع ہوئی تھی۔ موت کا وقت آٹھ ساڑھے آٹھ بجے کے درمیان لکھا گیا تھا یعنی وہ آٹھ بجے کے بعد اور ساڑھے آٹھ سے پہلے قتل ہوئی۔ اس کی آبرو ریزی نہیں ہوئی تھی۔

اب تو یہ سو فیصد ثابت ہو گیا کہ کنول انتقامی کارروائی کی شکار ہوئی ہے۔ یہ ڈکیتی کی واردات نہیں تھی کیونکہ قیمتی اشیاء کمرے میں جوں کی توں موجود تھیں۔ اس کے بعد قتل کا باعث صرف یہ رہ جاتا تھا کہ قاتل اس پر مجرمانہ حملہ کرنا چاہتا تھا لیکن اس کی مزاحمت پر

قاتل نے اسے گلا گھونٹ کر قتل کر ڈالا اور بھاگ گیا۔ ڈاکٹر نے میرے اس شک کو رد کر دیا۔ بات صاف ہو گئی کہ قتل کا باعث انتقام تھا یا فوری اشتعال۔

میں نے ان تینوں آدمیوں کو جنہوں نے کسی شخص کو کنول کی کھڑکی میں سے اندر جاتے اور باہر آتے دیکھا تھا، فارغ کر دیا اور پھر منہاج سے پوچھ گچھ شروع کر دی۔ ابھی میں نے اسے پوری طرح اپنی تفتیش کی لپیٹ میں نہیں لیا تھا۔

اب میں نے اس سے انتہائی اہم بات پوچھی۔ وہ یہ کہ کنول کی ماں اور بیدار بخت کے بیانات کے مطابق منہاج کنگال ہو کر ان کے ہاں جاتا رہا ہے اور وہ اسے ٹرخاتے رہے ہیں۔ منہاج نے میرا سوال سنتے ہی فوراً جواب دیا کہ آپ ان کنجروں کی باتیں صحیح تسلیم کر رہے ہیں اور مجھ پر قتل کا شبہ کرتے ہیں۔ اس نے بتایا کہ وہ جب بالکل ہی خالی ہو گیا تو تین یا چار مرتبہ کنول کے ہاں گیا تھا اور کنول نے اسے ایک عام اور بے غرض ملنے والا سمجھ کر کچھ دیر اپنے پاس بٹھایا تھا۔ منہاج نے یہ بھی کہا کہ کنول اسے اتنی سی بھی اجازت نہیں دیتی تھی کہ اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیتا۔ پھر وہ سمجھ گیا کہ یہاں پیار نہیں پیسہ چلتا ہے جو اس کے پاس نہیں رہا۔ اسے دکھ تو بہت ہوا کہ لاکھوں روپیہ اس لڑکی پر بہا دیا اور اب یہ بیگانگی کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ اس نے اپنے دوستوں کو بتایا تو دوستوں نے اسے کہا کہ اب وہاں جانا چھوڑ دو ورنہ ایک روز وہ خود تمہیں دھتکار دے گی۔

میں نے منہاج سے پوچھا کہ گذشتہ رات جو قتل کی رات تھی، وہ کنول کے ہاں گیا تھا اور کنول کی ماں نے اسے دھمکیاں بھی دی تھی اور واضح الفاظ میں دھتکار دیا تھا۔

''محترم انسپکٹر صاحب!'' ــــ منہاج نے بڑی پختہ آواز میں کہا ــــ ''میں تو باوضو ہو کر قرآن ہاتھ میں لے کر اس الزام کی تردید کر دوں گا لیکن میں یہ برداشت نہیں کروں گا کہ یہ کنجر قرآن کو ہاتھ بھی لگائیں۔ ان کا تو کوئی دین ہی نہیں نہ ان میں ایمان ہے۔ ان کے ہاں کافر اور مسلمان برابر ہیں۔ آپ انہیں قرآن ہاتھ میں لے کے حلفیہ بیان دینے کو کہیں گے تو وہ قرآن ہاتھ میں لے کر سو فیصد جھوٹ بولیں گے۔ کیا آپ ایک مسلمان کی حیثیت سے اللہ کے پاک کلام کی یہ توہین برداشت کر لیں گے؟''

میں اپنے آپ کو بہت ہی چالاک، عقل مند اور ہوشیار سمجھا کرتا تھا۔ یہ اوصاف نہ ہوتے تو مجھے پولیس انسپکٹری بھی نہ ملتی لیکن منہاج کا انداز اتنا پراثر تھا کہ دل چاہتا تھا کہ

اس کا تاثر قبول کرلیا جائے۔ یہ صحیح ہے کہ عصمت فروشوں سے سچ اور خلوص کی توقع رکھنا ایسا ہی ہے جیسے یہ تسلیم کرلیا جائے کہ آگ پر پانی رکھو تو پانی یخ ہو کر جم جائے گا۔

میں نے گذشتہ رات کنول کی ماں اور بیدار بخت سے کہا تھا کہ وہ تھانے آ جائیں۔ وہ اس وقت آئے جب میں نے منہاج کو پاس بٹھا رکھا تھا۔ منہاج کو باہر بھیج کر ان دونوں کو بلا لیا۔ انہیں یہ نہ بتایا کہ منہاج تو مانتا ہی نہیں کہ گذشتہ رات ان کے ہاں گیا تھا۔ اس کی بجائے میں نے نوابزادہ شہزاد علی کی بات شروع کر دی اور ان سے پوچھا کہ نوابزادے نے کبھی انہیں کوئی دھمکی دی تھی؟ مجھے اس نوابزادے پر شبہ ہو گیا تھا اور یہ شبہ بہت حد تک پختہ تھا۔

بیدار بخت اور کنول کی ماں اکٹھے ہی بولنے لگے۔ میں نے انہیں کہا کہ باری باری بولیں اور مجھے چھوٹی چھوٹی باتیں بھی بتائیں۔

انہوں نے اس نوابزادے کے رویے کے متعلق جو انکشافات کئے، ان سے منہاج الدین کے بیان کی تصدیق ہوتی تھی۔ مختصراً یوں ہے کہ نوابزادہ کنول کو مستقل داشتہ بنانا چاہتا تھا اور اس کا تقاضہ یہ تھا کہ کنول بیوی کی طرح زیادہ دن اس کے ہاں رہے اور ایک دو دنوں کے لیے اپنی ماں کے پاس رہ لیا کرے۔ ان لوگوں نے اسے کہا کہ وہ کنول کو دِلی اور شملہ تک بھی لے گیا ہے اور کنول آٹھ آٹھ دس دس دن تک اس کے ساتھ رہی ہے، اس سے زیادہ وہ اور کیا چاہتا ہے۔ نوابزادہ اس پر راضی نہیں ہو رہا تھا۔ بیدار بخت نے اعتراف کیا کہ جتنی دولت انہیں نوابزادے سے ملتی تھی اتنی انہیں کبھی کسی گاہک نے نہیں دی تھی لیکن وہ کنول کو مستقل طور پر اس کے حوالے نہیں کر سکتے تھے کیونکہ کنول ان کے لیے دولت کمانے کا ذریعہ تھا۔ وہ تو اس انتظار میں تھے کہ منہاج کی طرح نوابزادہ بھی خالی ہو جائے اور ان کے ہاں آنے کے قابل نہ رہے اور پھر اس جیسا کوئی اور گاہک پھانس لیا جائے۔

نوابزادے نے ان لوگوں کے ہاں اپنے دو غنڈے بھیجے جو شرفاء کے انداز سے ان کے ہاں یہ معاملہ طے کرنے گئے کہ کنول کو نوابزادے کی داشتہ بنا دیں۔ بیدار بخت، کنول اور اس کی ماں نے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ان دونوں بدمعاشوں نے یہ جرأت بھی کہ کنول کو الگ بٹھا لیا اور اسے قائل کرنے لگے کہ وہ نوابزادہ صاحب کے

ہاں آ جائے اور اس کی منہ مانگی قیمت ادا کی جائے گی۔ کنول نہ مانی تو ان دونوں بدمعاشوں نے اسے الگ اور بیدار بخت اور ماں کو الگ اغوا اور قتل کی دھمکیاں دیں۔

پھر انہوں نے بتایا کہ قتل سے چار روز پہلے نوابزادہ خود آیا اور کہنے لگا کہ وہ کلکتہ جا رہا ہے اور کنول کو ساتھ لے جائے گا۔ یہ سلسلہ تو چلتا ہی رہتا تھا۔ نوابزادہ ہی کیا، دوسرے مستقل گاہک بھی کنول کو باہر لے جایا کرتے تھے اور بیدار بخت اور کنول کی ماں بھی ساتھ جاتے تھے۔ اب نوابزادے نے یہ فرمائش کی اور ادائیگی بھی کرنا چاہی لیکن بیدار بخت نے صاف کہہ دیا کہ وہ لڑکی کو اس کے ساتھ نہیں بھیجیں گے۔

تصور میں لایا جا سکتا ہے کہ نوابزادہ کتنا بگڑا ہوگا۔ اس نے زیادہ رقم پیش کی تو اسے کہا گیا کہ انہیں ایسی کوئی شکایت نہیں کہ نوابزادہ کم پیسے دیتا ہے، بات صرف یہ ہے کہ وہ نوابزادے کی دوسری فرمائش اور دھمکیوں کے پیش نظر لڑکی اس کے ساتھ نہیں بھیجیں گے۔

نوابزادہ یہ کہہ کر بڑے غصے میں چلا گیا کہ لڑکی کو سنبھال کر رکھنا۔ اس نے یہ بھی کہا تھا کہ تم خود لڑکی میرے قدموں میں لا کر بٹھاؤ گے اور میرے آگے سجدے کرو گے پھر بھی میں تمہیں بخشوں گا نہیں۔

انہوں نے اور بھی کچھ باتیں بتائیں لیکن جو اہم باتیں میرا شبہ پختہ کرتی تھیں وہ آپ کو سنا دی ہیں۔ ایک طرف منہاج تھا جس کے خلاف یہ شہادت قابل یقین تھی کہ وہ کنول کے کمرے میں کھڑکی کے راستے گیا اور واپس آیا تھا لیکن پانچ گواہیاں موجود تھیں جن کا بیان تھا کہ اس وقت منہاج ان کے پاس بیٹھا تاش کھیل رہا تھا۔ دوسری طرف نوابزادہ شہزاد علی تھا جس کے خلاف ان دو استاد غنڈوں کی وجہ سے شک پختہ ہوتا تھا۔ میں نے منہاج کو حوالات میں پابند نہ کیا، تھانے میں بند رکھا اور اے ایس آئی کے ساتھ دو کانسٹیبل کر دیئے اور کہا کہ نوابزادے کے ان دونوں آدمیوں کو تھانے لے آئیں لیکن احتیاط یہ کریں کہ نوابزادے کو پتہ نہ چلے۔ اسے بھی پکڑنا ہی تھا لیکن پہلے میں اس کے خلاف شہادت اکٹھی کرنا لازمی سمجھتا تھا۔

میں دوسرے کاموں میں مصروف ہو گیا۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ بعد اے ایس آئی ان دونوں کو لے آیا۔ یہ ذہن میں رکھ لیں کہ وہ نوابزادہ شہزاد کے گھر میں نہیں رہتے تھے۔ ان کے اپنے اپنے گھر تھے۔ نوابزادہ بوقت ضرورت انہیں بلا لیا کرتا تھا اور ان کا ماہوار وظیفہ

مقرر کر رکھا تھا۔

ان دونوں میں ایک وہ بھی تھا جو قتل کی واردات میں وعدہ معاف گواہ بن کر سزا سے بچ گیا تھا۔ میں نے اسے باہر بیٹھا رہنے دیا اور اس کے ساتھی کو دفتر میں بٹھایا۔ وہ نامی گرامی غنڈہ اور بدمعاش تھا۔ منہاج، بیدار بخت اور کنول کی ماں کے بیانات کو ذہن میں رکھ کر میں نے اس شخص سے پوچھنا شروع کیا۔ اس نے تسلیم کر لیا کہ نوابزادے نے ان دونوں کو کنول کے ہاں بھیجا تھا اور کام یہ تھا کہ کنول کو اس کی مستقل داشتہ بنا دیا جائے۔ اس نے یہ بھی تسلیم کر لیا کہ ان دونوں نے ان لوگوں کو دھمکیاں دی تھیں۔ یہ شخص عقل والا معلوم ہوتا تھا۔ اس نے کہا کہ نوابزادہ صاحب کو بھی آپ جانتے ہیں اور مجھ سے بھی آپ واقف ہیں۔ یہ ہمارا ذریعہ معاش ہے اور نوابزادہ صاحب تو عیش وعشرت کو اپنا جائز حق سمجھتے ہیں۔ اس شخص نے بڑی کھری اور صاف باتیں کیں۔

میں نے اس کی باتوں سے باتیں نکال کر کرید شروع کی تو اس نے بیشتر باتیں تسلیم کر لیں لیکن اس شک سے صاف انکار کر دیا کہ وہ واقعی کنول کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ اس نے کہا کہ نوابزادے نے انہیں قتل کی دھمکی دینے کو تو کہا تھا لیکن یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ کنول کو آخر قتل ہی کرنا پڑے گا اور یہ کام یہ دونوں آدمی کریں گے۔ اس شخص نے یہ بھی تسلیم کیا کہ چار روز پہلے بھی وہ کنول کے ہاں گئے تھے۔

یہ شخص ہر بات تسلیم تو کرتا چلا جا رہا تھا لیکن میرا مسئلہ یہ تھا کہ کورٹ میں ان کے خلاف شہادت بھی پیش کرنی تھی۔ وہ میرے پاس نہیں تھی۔ میرے پاس کوئی ایسا عینی شاہد نہ تھا جس نے اس کو، اس کے ساتھی کو یا ان دونوں کو گھر میں داخل ہوتے یا نکلتے دیکھا ہو۔

میں نے اس شخص کو باہر بھیج کر دوسرے کو بلا کر اندر کرسی پر بٹھایا۔ میں اس کے پاس کھڑا ہو گیا۔ یہ تھا وہ شخص جو ایک قتل کر چکا تھا اور وعدہ معاف گواہ بن کر سزا سے بچ گیا تھا۔ اس شخص نے اپنے ساتھیوں کو دھوکہ دیا تھا۔ ایسے شخص پر اعتبار کرنا بہت بڑی غلطی ہوتی ہے...... میں نے اپنی ڈائری میں چیدہ چیدہ افراد کے نام لکھ لئے تھے۔ اس شخص جیسے نام لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن اس آدمی کا نام معلوم نہیں کیوں آج تک مجھے یاد ہے۔ نام اس کا رحیم تھا لیکن رمی کہلاتا تھا اور اسی نام سے مشہور تھا۔ پولیس کے ریکارڈ میں اس کا نام عبدالرحیم عرف رمی لکھا ہوا تھا۔

میں نے اس سے پہلا ہی سوال کیا تو اس نے آنکھیں اور منہ کھول کر میری طرف دیکھا جیسے حیران ہو گیا ہو کہ میں نے اس سے ایسی بات پوچھی ہے جس کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہی نہیں۔ میں نے اس کی خاموشی کو دیکھتے ہوئے اپنا سوال دہرایا تو اس نے انکار کر دیا۔ وہ مجھے یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ وہ تو کبھی بھی کنول کے ہاں نہیں گیا۔

میں نے اس کے منہ پر بڑا ہی زوردار تھپڑ مارا اور اس کے منہ کی دوسری طرف اسی ہاتھ کا اُلٹا تھپڑ مارا۔ اس کے سر پر کپڑے کی ٹوپی تھی جو اس علاقے میں عام طور پر پہنی جاتی تھی۔ میں نے اس کی ٹوپی اتار دی اور اس کے بالوں کو مٹھی میں لے کر اوپر کو جھٹکا دیا تو وہ کرسی سے اٹھا۔ میں نے ایک طرف ہو کر پوری طاقت سے پیچھے کو جھٹکا دے کر چھوڑ دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کے ٹخنے پر اپنا پاؤں مارا۔ وہ فرش پر پیٹھ کے بل گرا۔ میں نے اپنا ایک پاؤں اس کی شہ رگ پر رکھ کر اوپر اپنا وزن ڈالا تو وہ ذبح ہوتے بکرے کی طرح تڑپنے لگا۔

اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے میرا پاؤں اپنی گردن سے ہٹانے کی کوشش کی لیکن ناکام ہو کر ہاتھ جوڑ دیئے۔ میں نے پاؤں ہٹا لیا اور وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کے بال خاصے لمبے تھے۔ میں نے ایک بار پھر اس کے بالوں کو مٹھی میں لیا اور اوپر کو کھینچ کر اسے اٹھا دیا۔ پھر اس کے بالوں کو اس طرح نیچے کو جھٹکا دیا کہ اس کی پیشانی اور ناک میری میز پر لگی۔ میں جانتا ہوں کہ یہ ضرب کتنی سخت ہوتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا اور میں نے اس کے بال چھوڑ دیئے۔ صرف اتنا کہا کہ میں نے اسے جھوٹ نہیں سچ بولنے کے لیے یہاں بلایا ہے۔

جرائم پیشہ لوگوں سے تفتیش کرنے کا ہم یہی طریقہ اختیار کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی عام شہری مشتبہ ہوتا تو کم از کم میری کوشش یہ ہوتی تھی کہ شرافت سے سچ اگل دے۔ اگر یقین ہوتا یہ جھوٹ بولنے سے باز نہیں آتا اور سچ کو چھپا رہا ہے تو اسے میں اپنے ہاتھ ذرا دکھایا کرتا تھا۔ جرائم پیشہ افراد تو ایسے پتھر ہوتے تھے کہ کئی کئی دن اذیتیں برداشت کرتے رہتے تھے۔

رمی سچ بولنے پر آ گیا لیکن وہ بچ بچ کر بات کرتا تھا۔ اس نے پھر بھی ایک موقع پر جھوٹ بولا تو میں نے اس کے ساتھی کا حوالہ دیا۔ یہ سنتے ہی اس نے معذرت خواہانہ انداز

سے صحیح بات بتا دی لیکن وہ وہاں آ کر ڈٹ گیا کہ چار روز پہلے کنول کے ہاں نہیں گیا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اس کے ساتھی نے یہ بات بتائی ہے اور بیدار بخت اور کنول کی ماں نے بھی یہی بیان دیا ہے لیکن رمی ایسا اڑا کہ وہ انکار ہی کرتا رہا اور اس نے کہا کہ یہ لوگ اور اس کا ساتھی بھی اسے پھنسانا چاہتے ہیں۔

میں جان گیا کہ ان دونوں جرائم پیشہ آدمیوں سے فوراً راز کی بات معلوم نہیں جا سکے گی۔ ان لوگوں کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا تھا کہ دیدہ دانستہ سارے ساتھی ایک دوسرے سے مختلف بیان دیتے تھے اور یہاں تک جرأت کا مظاہرہ کرتے تھے کہ ایک دوسرے کی تردید بھی کر دیتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ تفتیش کرنے والے افسر کو گمراہ کیا جائے اور وہ صحیح شہادت تک پہنچ ہی نہ سکے۔

میں نے اے ایس آئی اور ایک ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور انہیں کہا کہ ان دونوں کو لے جاؤ اور سچ اگلواؤ۔ یہ بھی کہا کہ ان دونوں کو کچھ دن یہیں مہمان رکھو۔ اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل جانتے تھے انہیں کیا کرنا ہے اور ان دو مشتبہوں کو کس عمل سے گزارنا ہے۔

وہ دن گزر گیا۔ منہاج الدین کو میں نے تھانے میں ہی پابند رکھا ہوا تھا۔ شام کے وقت اس کی ماں آ گئی۔ مجھے اطلاع ملی تو میں نے فوراً اسے اندر بلا لیا۔ منہاج کے متعلق مخبر مجھے پوری رپورٹیں دے چکے تھے۔ وہ امیر اور پُروقار شخص کا بیٹا تھا لیکن باپ کی وفات کے بعد گمراہ ہو گیا۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ یہ خاندان بڑا ہی قابل تعظیم واحترام تھا۔ اپنی شاہانہ حویلی سے اب ماں بیٹا چھوٹے سے کرائے کے ایک مکان میں آ گئے تھے۔ اس زوال بلکہ تباہی کا ذمہ دار منہاج تھا۔

اس کی ماں میرے سامنے آئی تو میں تعظیم کے لیے اٹھا اور اسے بٹھایا۔ اس کی آنکھیں اور اس کی ناک کی سرخی بتا رہی تھی کہ بدنصیب ماں روتی رہی ہے۔ مجھ سے اپنے بیٹے کے متعلق اور اس پر جو الزام تھا، اس کے متعلق پوچھنے آئی تھی۔ پہلے تو اسے کچھ معلوم ہی نہ تھا، منہاج کے کسی دوست نے اسے بتا دیا کہ اس پر ایک طوائف کے قتل کا الزام ہے۔ ایک ماں کے لیے اس سے بڑا صدمہ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں نے اسے تسلی دی اور اس کا دل مضبوط کرنے کے لیے یہی تاثر دیا کہ اس کا بیٹا محفوظ ہے اور اگر اس پر کوئی بھی الزام ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسے سزا ہو جائے گی۔ میں اسے بہلاتا اور پھسلاتا رہا

اور میں جو اسے تسلیاں دے رہا تھا وہ بڑی کچی بنیادوں کی تسلیاں تھیں۔

ماں کے آنسو بہہ نکلے اور اس نے مختصراً بتایا کہ وہ کس طرح آسمان سے گرے ہیں۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ ساری رات مصلے پر بیٹھی اللہ سے بیٹے کی رہائی اور زندگی کی بھیک مانگتی رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اب اس کا بیٹا واپس اپنے راستے پر آیا ہے یا نہیں۔

اس نے کہا کہ منہاج نے دو تین بار اس کے قدموں میں سر رکھ کر معافی مانگی اور گناہوں سے توبہ کی ہے لیکن ابھی تک کچھ آثار باقی ہیں، مثلاً شام کو نکلتا ہے اور گیارہ بارہ بجے واپس آتا ہے۔

میں پولیس آفیسر تھا۔ پولیس کا کوئی بھی آفیسر جذبات سے مغلوب ہو جائے تو وہ اپنے سرکاری فرائض صحیح طریقے سے پورے نہیں کر سکتا لیکن اس قابل تکریم خاتون نے مجھے متاثر کر لیا۔ پھر اس وقت ہندوؤں نے صوبہ بہار میں مسلم کشی کی جو مہم شروع کر دی تھی، اس کے پیش نظر میں کچھ زیادہ ہی مسلمان ہو گیا تھا اور ارادہ کر لیا تھا کہ اس ماں کی خوشی کے لیے میں جو کچھ بھی کر سکا کروں گا۔ یوں کہئے کہ میں اس خاتون کی خاطر اپنے سرکاری اور پیشہ وارانہ راستے سے کچھ ہٹ گیا تھا لیکن دیکھنا یہ تھا کہ میں کس طرح اپنے ارادے میں کامیاب ہو سکوں گا۔

ماں کو بہلا کر اور اس کا دل مضبوط کر کے رخصت کیا اور میں خود اپنے گھر چلا گیا۔

میں اگلی صبح تھانے گیا۔ کنول کے قتل کی خبر اخباروں میں بھی آئی تھی اور نمایاں کر کے چھاپی گئی تھی۔ اس طرح اس قتل کو بہت ہی شہرت حاصل ہو گئی۔ اخباری رپورٹر میرے پاس آئے تھے اور پوچھتے تھے کہ قاتل کا سراغ ملا ہے یا نہیں اور یہ بھی کہ میں انہیں اس قتل کی وجہ اور بیک گراؤنڈ بتاؤں۔ میں نے انہیں یہ کہہ کر چلتا کیا کہ میں اپنی کارروائی کی خبر چھپوا کر ملزم کو چوکنا نہیں کرنا چاہتا۔ میں تھانے گیا تو ایک رپورٹر اتنی صبح سویرے آیا بیٹھا تھا۔ جونہی اس نے اپنا تعارف کرایا، میں نے اسے معذرت کے ساتھ فوراً رخصت کر دیا۔

آپ نے پاکستان کے اخباروں میں قتل یا ڈکیتی کی وارداتوں کی خبریں پڑھی ہوں گی۔ پولیس کے اعلیٰ افسر صاحبان تفتیش کی خبریں اخباروں کو دے دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ پریس کانفرنسیں بھی کرتے ہیں اور نامہ نگاروں کو بتاتے ہیں کہ فلاں اور فلاں کو گرفتار

کرنے کے لیے چھاپے مارے جا رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ فلاں بن فلاں زمین کے نیچے چلے جاتے ہیں۔ اس قسم کی تشہیر تفتیش کو تباہ کر دیتی ہے۔

میں نے اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل کو بلایا اور پوچھا کہ رمی اور اس کے ساتھیوں نے کچھ اگلا ہے یا نہیں۔ مجھے بتایا گیا کہ دونوں ابھی اپنے پہلے بیانات پر قائم ہیں۔ انہیں ساری رات ایذا رسانی کے عمل میں رکھا گیا تھا۔ میں نے اے ایس آئی اور ہیڈ کانسٹیبل کو اس سلسلے میں مزید ہدایات دیں۔

یہ دونوں میرے دفتر سے نکلے ہی تھے کہ علاقہ ڈی ایس پی کا فون آ گیا۔ اس نے اتنا ہی کہا کہ فوراً میرے پاس آ جاؤ...... مجھے صاف طور پر ایک خطرہ نظر آنے لگا۔ یہ ڈی ایس پی ہندو تھا۔ اس کا نام مہندر پال راٹھور تھا۔ میں یہ خطرہ محسوس کرنے لگا تھا کہ یہ ہندو مجھ سے پوچھے گا کہ اس طوائف کے قاتل کو میں نے پکڑا ہے یا نہیں۔ میں اسے بتاؤں گا کہ تفتیش کس مرحلے میں ہے تو وہ مجھ پر کوتاہی کا الزام عائد کر کے لائن حاضر کر دے گا اور ہو سکتا ہے معطل بھی کر دے۔ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہندو ضائع نہیں کیا کرتے تھے۔ ان دنوں ہندو مسلمانوں کے خلاف اور ہی زیادہ متعصب ہو گئے تھے۔ متعصب بھی ایسے کہ مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہو گئے تھے۔ بہر حال میں حکم کی تعمیل کی خاطر اسی وقت ڈی ایس پی راٹھور کے دفتر میں جا پہنچا۔

اس ہندو ڈی ایس پی نے جب بات کی تو مجھے شدید دھچکا لگا۔ یوں محسوس ہونے لگا جیسے یہ افسر کچھ اور کہہ رہا ہے اور میں کچھ اور سمجھ رہا ہوں۔ اس نے بڑی سختی سے کہا کہ یہ بات کسی اور کو نہ بتاؤں...... بات اس نے یہ بتائی کہ چار پانچ دنوں بعد پٹنہ کے ہندو باقاعدہ پلان کے تحت شہر کے مسلمانوں کے گھروں پر حملے کریں گے۔ لوٹ مار ہو گی، مکانوں کو آگ لگے گی، جوان مسلمان لڑکیاں اغوا ہوں گی اور وہ سب کچھ ہو گا جو ایسے فسادات میں ہوتا ہے۔ راٹھور نے مجھے کہا کہ میں ممکن ہو سکے تو کل ہی یا پرسوں یہاں سے اپنے بیوی بچوں کو ساتھ لوں اور ڈھاکہ پہنچ جاؤں۔ اس نے یہاں تک میرا اور میری بیوی بچوں کا خیال رکھا اور وعدہ کیا کہ وہ ہمارے لئے ٹرک کا انتظام کر دے گا اور ٹرک مجھے پٹنہ سے اگلے ریلوے سٹیشن تک پہنچا دے گا اور میں وہاں سے گاڑی میں بیٹھوں...... ابھی انگریزوں کی حکومت تھی اور ریل گاڑیاں تمام ملک میں چل رہی تھیں۔

کیا یہ معجزہ تھا کہ ایک ہندو ایک مسلمان کو ہندوؤں کے اس پلان سے بچا رہا تھا جو انہوں نے مسلمانوں کے قتل عام کے لیے تیار کیا تھا؟

یہ معجزہ ہی تھا لیکن اس کی ایک بیک گراؤنڈ تھی۔ یہ تقریباً ایک سال پہلے کا واقعہ تھا کہ اس ڈی ایس پی پر ایک اتنا سنگین کیس بن گیا تھا جس کے نتیجے میں اس کے خلاف محکمانہ کارروائی ہونے کا امکان تھا۔ اس کی تنزلی بھی ہو سکتی تھی اور کوئی انگریز افسر ذرا زیادہ سختی کرنے کے موڈ میں آ جاتا تو اسے سبکدوش بھی کیا جا سکتا تھا۔ مجھے اس تھانے میں راٹھور کے ماتحت آئے ابھی چند مہینے ہی گزرے تھے۔ اس نے میرے ساتھ بات کی اور کہا کہ میں خود ایک جھوٹی گواہی دوں اور کم از کم دو اور جھوٹے گواہوں کا بندوبست کر دوں تو اس کا مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔ اللہ نے مجھے عقل سے نوازا تھا اور میں نے اپنی ذہانت اور کوشش سے تجربہ بھی خاصا حاصل کر لیا تھا۔ میں نے راٹھور کو بچانے کا پلان بنا لیا۔

اسے معطل کر دیا گیا اور انکوائری شروع ہوئی۔ اس کے بعد محکمانہ کارروائی ہونی تھی۔ میں پیش ہوا اور عقل و ہوش کو قائم رکھ کر ایسی بے بنیاد گواہی دی جو سچی لگتی تھی۔ اپنی گواہی کو تقویت دینے کے لیے میں نے تین جھوٹے گواہ پیش کر دیئے جنہوں نے میری بتائی ہوئی گواہی بڑی خوبی سے دی اور جرح کرنے والوں کو بھی مطمئن کر دیا۔ سب سے زیادہ جرح تو مجھ پر ہوئی تھی۔ میں نے جرح میں ثابت کر دیا کہ میں سچا ہوں اور ڈی ایس پی راٹھور بے گناہ ہے۔ یہ کیس انکوائری پر ہی ختم ہو گیا اور محکمانہ کارروائی تک نوبت ہی نہ پہنچی۔ راٹھور کو بے گناہ قرار دے دیا گیا اور انکوائری کی رپورٹ میں لکھا گیا کہ یہ سب ایک اتفاقیہ غلط فہمی کی بنیاد پر ہوا تھا۔ اس طرح راٹھور کا ریکارڈ بھی بے داغ رہا۔

راٹھور میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ مجھ سے ذرا سی کوتاہی یا غلطی ہو جاتی تو وہ اس پر پردہ ڈال لیا کرتا تھا لیکن ایک ہندو سے مجھے یہ توقع نہیں تھی کہ وہ اپنی قوم کے پلان سے بے وفائی کر کے مجھے بچائے گا۔

میں نے راٹھور کا شکریہ ادا کیا تو اس نے کہا کہ وہ ساری عمر اس نیکی کو نہیں بھولے گا جو میں نے اس کے ساتھ کی تھی۔ وہ دراصل ایک بڑے جاگیردار خاندان کا فرد تھا۔ اسے اگر سروس سے سبکدوش کر بھی دیا جاتا تو اسے کوئی فرق محسوس نہ ہوتا لیکن ڈی ایس پی ایک بڑا عہدہ تھا جس کے چھن جانے سے راٹھور کی بہت ہی بے عزتی اور بدنامی ہوتی۔

انگریزوں کے دورِ حکومت میں پولیس کے عہدے بڑے خاندانوں کے افراد کو دیئے جاتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اونچے خاندانوں کے لوگوں کے پیٹ بھرے ہوئے ہوتے تھے اور انہیں رشوت کا لالچ نہیں ہوتا تھا۔ انگریز بادشاہ نے یہی سوچ کر عہدے اونچے خاندانوں کو دیئے تھے۔

یہاں میں ایک اور بات واضح کر دوں۔ اکثر و بیشتر قارئین کرام نے وہ وقت نہیں دیکھا جب ملک تقسیم ہو گیا تھا اور 14 اگست کو آزادی ملنے والی تھی۔ تمام سرکاری ملازمین سے پوچھا گیا تھا کہ وہ پاکستان جانا چاہتے ہیں یا ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں۔ اسے کہتے تھے کہ Option لی گئی ہے۔ ہندوستان کے بیشتر مسلمان سرکاری ملازمین نے لکھا تھا کہ وہ پاکستان جانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح پاکستانی علاقوں کے ہندو ملازمین سے بھی یہی پوچھا گیا تھا اور پھر ہر ایک کی Option لکھ لی گئی اور دستخط کروا لئے گئے تھے۔ یہ الفاظ دفتروں میں عام بولے جاتے تھے ــــ ''میں نے پاکستان Opt کیا ہے'' ــــ میں نے بھی پاکستان ہی Opt کیا تھا اور دستخط کر دیئے تھے۔

ہندوستان سے پاکستان جانے والے ملازمین کو سرکاری انتظامات کے تحت پاکستان کو بھیجنا تھا۔ ڈی ایس پی راٹھور نے مجھے کہا تھا کہ میں نے اپنی آپشن دے دی ہے اس لیے میں کسی بھی وقت یہاں سے نکل سکتا ہوں اور مجھے پکڑنے کے لیے ڈھاکہ کوئی نہیں جائے گا۔

میں راٹھور کے دفتر سے نکلا اور بھاگم بھاگ تھانے پہنچا۔ سب سے پہلا کام یہ کیا کہ منہاج الدین کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور اسے کہا کہ وہ گھر چلا جائے اور اپنی والدہ، بہن اور اس کے خاوند اور بچوں کو ساتھ لے کر پٹنہ سے نکل جائے اور مشرقی بنگال پہنچے۔ یہ تو اسے معلوم تھا کہ بہار کے مسلمان اپنے طور پر وہاں سے نکل رہے تھے۔ یہ بالکل ویسے ہی تھا جیسے ادھر مشرقی پنجاب سے لوگ 14 اگست سے پہلے ہی نکل کر پاکستان پہنچ رہے تھے۔

منہاج کو میں نے سختی سے بتایا کہ وہ یہاں انتظار میں یا سوچ میں نہ بیٹھ جائے اور فوراً یہاں سے نکلے اور اس کا جو بھی کاروبار ہے اس کی پرواہ نہ کرے۔ میں نے اس پر یہ کرم ایک تو اس لیے کیا تھا کہ وہ مسلمان تھا اور دوسری وجہ یہ تھی کہ مجھے اس کی والدہ کا خیال آتا تھا۔ اتنے اچھے اور قابلِ احترام خاندان کی خاتون بیوہ ہو گئی اور بیٹے نے اسے وہ دکھ

دیئے جو انسان کو مار ہی ڈالتے ہیں۔ یہ بات بھی تھی کہ میں ہندوؤں سے ایک مسلمان فیملی کو بچا رہا تھا۔

آپ کو شاید یہ خیال آ جائے کہ میں نے نوابزادہ شہزاد علی کے آدمیوں کو کیوں نہ چھوڑ دیا اور اس نوابزادے کی فیملی کو کیوں نہ بچایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ نوابزادہ نام کا مسلمان تھا۔ اس کے باپ دادا انگریزوں کے پٹھو تھے اور جوتیاں چاٹنے والے غلام۔ صوبہ بہار کے مسلمان مسلم لیگ کے حامی تھے۔ کچھ تعداد کانگریسیوں کی بھی تھی لیکن نوابزادہ شہزاد علی خالصتاً انگریزوں کا آدمی تھا اور اس کے بعد ہندوؤں کی غلامی بڑے شوق اور فخر سے کرتا تھا۔ اس کی جاگیرداری میں جو گناہ ہوتے تھے، ان کی زد میں مسلمان عورتیں زیادہ آتی تھی اور اس شخص نے کبھی یہ نہ سوچا تھا کہ مسلمانوں کو تو بخش دیا کرے۔ وہ ہندوؤں کا آدمی تھا اور میں نے بہتر یہی سمجھا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ ہی رہے۔ کنول کے قتل کے سلسلے میں میرا خیال یہی تھا کہ میرے بعد آنے والا تھانیدار نوابزادے کے ان دو آدمیوں پر ہی الزام ثابت کرے گا۔

میں اپنی بیوی اور بچوں کو کس طرح پٹنہ سے لے کر ڈھاکہ پہنچا، ایک الگ اور طویل داستان ہے۔ یہ داستان دلچسپ بھی ہے اور جذبات سے لبریز بھی۔ میں نے ریل گاڑی کے سفر کے دوران راستے میں مسلمانوں کی گلتی سڑتی لاشیں پڑی دیکھی تھیں۔ ابھی قتل عام باقی تھا۔ اپنے اس سفر کو میں ان چند ایک الفاظ میں ہی سمیٹ دیتا ہوں کہ تیسری صبح ابھی تاریک ہی تھی جب میں اپنی بیوی اور تین چھوٹے چھوٹے بچوں کو ٹرک میں سوار کرا کر پٹنہ سے نکلا۔ جتنا سامان اٹھایا جا سکتا تھا وہ ساتھ لے لیا تھا۔

اگلے سٹیشن تک پہنچے اور گاڑی جلدی مل گئی۔ یہ ڈی ایس پی مہندر پال راٹھور کا انتظام تھا۔ اس نے یہ کرم بھی کیا تھا کہ میرے ساتھ دو ہندو کانسٹیبل بھیجے تھے جو ہمیں گاڑی پر سوار کرا کے واپس چلے گئے تھے۔

میں ڈھاکہ پولیس ہیڈ کوارٹر میں گیا اور اپنی سروس کے کاغذات پیش کئے۔ یہ بھی بتایا کہ میں پٹنہ سے کس طرح نکلا ہوں۔ مجھے ایس پی کے سامنے پیش کیا گیا حکم جاری ہوا کہ میری سروس جاری رہے گی اور مجھے کسی تھانے کا انچارج بنا دیا جائے۔

میری فیملی کو بڑا اچھا کوارٹر بھی مل گیا اور ایک تھانہ بھی۔ ادھر سے ہندو ہندوستان

جا رہے تھے۔ مجھے جو تھانہ دیا گیا، اس کا ایس ایچ او ہندو تھا اور ہندوستان چلا گیا تھا۔ میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ اتنا بڑا کام اور اتنا خطرناک سفر بخیر و خوبی طے پا گیا اور میں نے نئی زندگی کا آغاز کیا۔

چودہ اگست کے روز ہم آزاد ہو گئے اور مملکت خداداد پاکستان وجود میں آئی۔ مشرقی پاکستان کا نام آتا ہے تو دماغ پر کچھ عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی ہے جی میں آتی ہے کہ مشرقی پاکستان کی پیدائش سے اس کی وفات تک کی کہانی سناؤں۔ شاید کبھی سنا ہی دوں لیکن ابھی نہیں۔ ابھی تو میں کنول کے قتل کی کہانی سنا رہا ہوں۔ میں تو سمجھا تھا کہ قتل کی یہ واردات سرحد کے پار ہی رہ گئی ہے لیکن اس کے اثرات یا اس کا آسیب ڈھاکہ تک پہنچ گیا۔

جادو کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے لیکن انسانی خون کے متعلق بھی یہ کہا جا سکتا ہے یا یہی کہنا چاہئے کہ خون وہ جو سر چڑھ کر بولے۔ انسانی خون کا یہ خاصا ہے کہ کبھی نہ کبھی قاتل کے سر چڑھ کر بولتا ہے۔

ڈھاکہ کے اس تھانے میں مجھے آٹھ نو مہینے گزر گئے تھے۔ ایک روز میں پیدل ہی تھانے کی طرف آ رہا تھا کہ پیچھے سے کسی نے آ کر میرا بازو پکڑا اور ساتھ آواز آئی ـــــ "ابوبکر بھائی جان! السلام علیکم" ـــــ میں نے رک کر اُدھر دیکھا تو وہ منہاج الدین تھا۔ وہ میرے گلے لگ گیا اور میں نے دلی پیار کا اظہار کیا اور اسے اپنے بازوؤں میں بھینچا اور پھر اس کی پیٹھ تھپتھپائی۔

اس نے بتایا کہ وہ اپنی ماں، بہن، بہنوئی اور ان کے بچوں کے ساتھ پہلے ہی یہاں آ گیا تھا اور چند مہینوں میں اس نے بہنوئی کو ساتھ لے کر کاروبار بھی شروع کر دیا تھا جو ابھی اتنی آمدنی تو نہیں دیتا تھا جتنی پٹنہ میں دیا کرتا تھا لیکن اس سے باعزت روٹی اور دیگر ضروریات بڑی آسانی سے پوری ہو رہی ہیں۔ وہ میرا بار بار شکریہ ادا کرتا تھا کہ میں نے اسے قبل از وقت خبردار کر دیا اور وہ اپنے عزیزوں کے ساتھ بخیر و عافیت ڈھاکہ پہنچ گیا۔

منہاج کے ساتھ ڈھاکہ میں یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اسے میرا ممنون و مشکور ہونا ہی چاہئے تھا لیکن صرف اس لیے نہیں کہ میں نے اسے قبل از وقت خبردار کر دیا تھا بلکہ اس لیے کہ میں نے اسے کسی ہندو تھانیدار کے حوالے کرنے کی بجائے تھانے سے بھگا دیا تھا۔

اگلے ہی روز وہ تھانے میں آ گیا اور کہنے لگا کہ اس کی والدہ میرے گھر آنا چاہتی ہے۔ پہلے بتایا ہے کہ میرے دل میں منہاج کی والدہ کی عزت پیدا ہو گئی تھی۔ میں نے منہاج سے کہا کہ وہ کل شام والدہ کو ساتھ لے آئے اور دونوں کھانا میرے گھر کھائیں۔ اگلی شام وہ والدہ کو تھانے میں ہی لے آیا اور میں انہیں گھر لے گیا۔ میری بیوی رکھ رکھاؤ والی عورت تھی۔ اس نے منہاج کی والدہ کا استقبال بازو پھیلا کر کیا اور وہ اس طرح گلے لگ کر ملیں جیسے بچھڑی ہوئی ماں بیٹی ملا کرتی ہیں۔ میں نے اپنی بیوی کو منہاج اور اس کی والدہ کے متعلق سب کچھ بتا یا دیا تھا۔ اس میں بہار کی محبت بھی شامل تھی یعنی ہم ایک ہی علاقے کے رہنے والے تھے اور ہجرت کر کے ادھر آئے تھے۔ ہم نے کھانا اکٹھے کھایا اور اپنی طرف کی یعنی بہار کی بہت باتیں ہوئیں۔

تین چار دنوں بعد منہاج پھر تھانے آیا اور دعوت دی کہ اگلے روز شام کا کھانا ان کے ہاں کھاؤں اور اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لاؤں۔ میں اگلے روز اپنی بیوی اور بچوں کو ساتھ لے کر اس ایڈریس پر پہنچ گیا جو منہاج نے بتایا تھا۔ اس کا مکان بلا دقت مل گیا۔ منہاج کی بڑی بہن اور اس کے بہنوئی کے ساتھ بھی ملاقات ہو گئی۔ وہ تو بڑے ہی شائستہ اور تہذیب یافتہ لوگ تھے۔ زیادہ تر بہار کی باتیں ہوتی رہیں۔ اپنے وطن کو بھولنا آسان نہیں ہوتا جہاں انسان پیدا ہوتا اور ہنستا کھیلتا بڑا ہوتا ہے۔ اپنے گھر کو کون بھول سکتا ہے!

ہم زیادہ تر بہار کی ہی باتیں کرتے رہے۔ مجھے اور میری بیوی کو اس دعوت سے یہ ملا کہ بڑی ہی اچھی فیملی کے ساتھ دوستی ہو گئی۔ یہ لوگ اس قابل تھے کہ ان کے ساتھ محبت کی جائے اور ملاقاتیں جاری رہیں۔ منہاج کی ماں تو مجھے دعائیں دیتے تھکتی نہ تھی۔ میں نے اس کے بیٹے کو قتل کے الزام سے آزاد کرا دیا تھا اور اس کے بعد خوشی والی بات یہ تھی کہ منہاج ٹھیک راستے پر واپس آ گیا تھا۔

اس کے بعد منہاج سے دو تین اور ملاقاتیں ہوئیں۔ میرے دل میں یہ خواہش بیدار ہوئی کہ منہاج سے پوچھوں کہ کنول کو قتل اس نے کیا تھا یا نوابزادہ شہزاد علی نے اسے قتل کروایا تھا۔ کچھ دنوں بعد منہاج تھانے میں آ گیا۔ اس نے کہا کہ وہ ادھر سے گزر رہا تھا اور سوچا کہ سلام کرتا چلوں۔ میں نے اسے بٹھا لیا۔ کچھ اِدھر اُدھر کی کہنے سننے کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اس سوال کا صحیح جواب دینا پسند کرے گا کہ کنول کا قاتل کون تھا؟

میں نے اسے یہ بھی کہا کہ ہندوستان کی وارداتیں اور قانون وہیں رہ گیا ہے۔ اگر اب وہ سچ بات سنا دے گا تو اسے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ میں نے اسے بتایا کہ یہ میں اپنی دلچسپی کے لیے پوچھ رہا ہوں۔ اس نے شگفتہ لہجے میں جواب دیا کہ اسے یہ کہانی سنا کر خوشی محسوس ہو گی۔

''آپ کا جائز حق ہے کہ میں آپ کو صحیح بات بتاؤں''۔۔۔۔ منہاج نے کہا۔۔۔۔ ''آپ نے تو مجھے پھانسی کے تختے سے اتارا تھا۔ میں نے ذہنی طور پر قبول کر لیا تھا کہ پکڑا گیا ہوں اور آپ کو صحیح شہادت مل گئی ہے اور میرے بچنے کی کوئی صورت نہیں رہی لیکن آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے......''

''اب احسان اور کرم نوازی والی باتیں ختم کرو منہاج!''۔۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔۔ ''میں نے جو کچھ تمہاری بہتری کے لیے کیا تھا وہ میرا فرض تھا۔ تم اپنی بات سناؤ''۔

اس روز اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا۔ کہتا تھا کہ وہ اپنی ساری کہانی سنانا چاہتا ہے۔ پھر واضح ہو گا کہ اس نے کنول کو کیوں اور کس طرح قتل کیا تھا۔ میں نے اسے تین چار دنوں کے بعد ایک دن اور وقت بتایا اور کہا کہ وہ تھانے میں ہی آ جائے۔

اس روز وہ میرے پاس تھانے میں آ گیا۔ یہ تو اس نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ کنول کو اس نے قتل کیا تھا لیکن اب اس نے بتایا کہ وہ قتل کی نیت سے نہیں گیا تھا، وہ کنول کو دیکھنے اور چند منٹ اس کے پاس بیٹھنے کا نشہ پورا کرنے گیا تھا لیکن کنول کی زندگی کے دن پورے ہو چکے تھے اس لیے ایک ایسی بات ہو گئی کہ منہاج نے اسے قتل کر دیا۔

منہاج نے پہلے اپنی آوارگی، گمراہی اور تباہی کی داستان سنائی۔ منہاج نے بہت ہی طویل بات سنائی تھی اور ذرا ذرا سی باتیں بھی سنا ڈالی تھیں۔ میں آپ کو اختصار سے سناؤں گا۔

یہ ہمارے معاشرے میں کھیلا جانے والا ایک عام ڈرامہ ہے۔ آج کل تو یہ جیسے گھر گھر کی کہانی بن گئی ہے۔ میں اسے کہانی بھی کہہ رہا ہوں اور ڈرامہ بھی لیکن یہ ایک ٹریجیڈی ہے ایک المیہ۔

منہاج والدین کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اس نے کچھ تعلیم حاصل کی اور باپ کے ساتھ کاروبار میں شامل ہو گیا۔ ذہین آدمی تھا۔ کاروبار کے اسرار و رموز جلد ہی سمجھ گیا اور

کاروباری امور میں مہارت حاصل کر لی۔

اس کا باپ فوت ہو گیا۔ اب منہاج اتنے بڑے کاروبار کا واحد مالک تھا۔ دولت کا کوئی حساب نہ تھا۔ کچھ مکان بھی تھے اور اس کی کمیشن ایجنسی کا جو دفتر تھا وہ جگہ بھی اپنی تھی۔ منہاج کو وہ دوست مل گئے جنہیں صرف کھانے پینے میں دلچسپی ہوتی ہے۔ منہاج کی باتوں سے مجھے پتہ چلا کہ اس میں یہ خامی تھی کہ کسی کے منہ سے اپنی تعریف یا خوشامد سنتا تو اس کے آگے ڈھیر ہو جاتا تھا۔ ایسے آدمی چکنی چپڑی باتوں سے ہپناٹائز ہو جایا کرتے ہیں۔

پہلے تو اس کے گرد دوستوں نے محاصرہ کیا۔ اسے باتوں باتوں میں شہزادہ بنا ڈالا اور اس سے خوب کھایا۔ پھر ان دوستوں نے سیر سپاٹے کا شوقین بنا دیا۔ وہ اکثر دو تین دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے چلا جاتا اور چند دن سیر سپاٹا کر کے واپس آ جاتا تھا۔ اس نے کاروبار اپنے منیجر اور منیم کے حوالے کر دیا تھا۔

دوستوں نے ہی اسے شراب کا ذائقہ چکھایا تو وہ پینے بھی لگا اور پلانے بھی لگا۔ شراب کو بلاوجہ ام الخبائث نہیں کہا گیا بلکہ اس میں ایک حقیقت پوشیدہ ہے۔ شراب منہ کو لگی تو آدمی شیطان کی گرفت میں آ گیا۔ شراب ہی نہیں، نشہ کوئی سا بھی ہو، اپنے عادی انسان کو راستے سے دور خواب و خیال کی وادیوں میں لے جاتا ہے اور وہیں کہیں تباہی کی گہری کھائی میں پھینک دیتا ہے۔

ماں باپ نے منہاج کو بڑے پیار سے پالا تھا اور اس کی ہر فرمائش پوری کی تھی۔ یہ اثرات جوانی میں ابھر کر اس کی شخصیت پر سوار ہو گئے اور اس نے باپ کی کمائی ہوئی دولت کو اپنی فرمائشوں پر لٹانا شروع کر دیا۔

ایک شریف اور معزز گھرانے کا آدمی جو آوارگی کے تصور سے ہی بھاگتا تھا، عورتوں کا رسیا بن گیا۔ میں تفصیل سے نہیں سنا رہا کہ اس نے چار پانچ لڑکیوں کے ساتھ یکے بعد دیگرے کس طرح تعلقات پیدا کیے اور ان پر کس طرح پیسہ نچھاور کیا۔ ان میں تین لڑکیاں ہندو تھیں اور وہ امیر گھرانوں سے تعلق رکھتی تھیں۔ انہوں نے منہاج سے خوب روپیہ پیسہ کھینچا۔ ہر لڑکی نے اسے یہ تاثر دیا کہ وہ تو ایسا خوبصورت جوان ہے کہ پریاں بھی اس پر عاشق ہوتی ہوں گی۔ یہی منہاج کی کمزوری تھی۔

اب شراب بھی چل پڑی تھی اور بڑی چالاک ہندو لڑکیوں نے بھی منہاج کے دماغ پر قبضہ کر لیا تھا۔ منہاج بڑے حسین خواب و خیال کی دنیا کا شہزادہ بن گیا۔ حقیقت سے بالکل ہی بیگانہ ہو گیا۔

عورت بازی کا شوق اور مطلب پرست دوست اسے عصمت فروشوں کی دنیا میں بھی لے گئے۔ پہلے تو گانے بجانے والیوں کے ہاں جاتے رہے اور منہاج دولت لٹاتا رہا پھر اس کا تعارف کنول سے ہوا۔ کنول کا ایک مستقل گاہک کنگال ہو کر اس کے لیے بیکار ہو گیا تھا۔ اسے ویسا ہی ایک اور گاہک درکار تھا۔ یہ میں نے پہلے بتایا ہے کہ وہ دو تین مستقل گاہک ہی رکھتی تھی۔

منہاج اس کے پاس اگلے ہی روز اکیلا گیا۔ کنول تربیت یافتہ لڑکی تھی۔ اس نے ایسی اداکاری کی کہ منہاج کو یقین ہو گیا کہ یہ لڑکی اس پر مرمٹی ہے اور اب یہ کسی اور کے پاس نہیں جائے گی۔ منہاج کو ہٹانے سمجھانے والا کوئی نہ تھا۔ وہ کیسے سمجھ پاتا کہ وہ مکڑی کے جالے میں آ گیا ہے جس میں سے وہ اسی وقت نکل سکے گا جب اس کی ہڈیاں باقی رہ جائیں گی۔ کنول ایک آسیب کی صورت اس کے دل و دماغ پر قابض ہو گئی۔

اب چونکہ ڈھاکہ میں منہاج عقل و ہوش سے بات کر رہا تھا اور اپنی اصلیت میں واپس آ گیا تھا اس لیے اس نے اپنا تجزیہ خود کر کے مجھے سنایا۔ اس نے کہا کہ اب وہ سمجھا ہے کہ وہ کوئی حرکت اپنی سوچ سمجھ سے نہیں کرتا تھا بلکہ سوچ کنول کی ہوتی تھی اور جسم منہاج کا اس کے مطابق متحرک ہوتا تھا۔ وہ اس وقت نہ سمجھ سکا کہ کنول ایک ابلیس ہے اور ابلیس کی طاقت کا مقابلہ منہاج جیسا انسان نہیں کر سکتا بلکہ اس کی آغوش میں جا گرنے میں لذت ہی نہیں بلکہ فخر بھی محسوس کرتا ہے۔

کنول نے کہا کہ شملہ چلتے ہیں اور کچھ دن وہاں گزاریں گے۔ منہاج نے یہ نہ سوچا کہ شملہ کتنی دور ہے اور وہاں تک جانے میں ہی کتنا خرچ ہو گا اور پھر وہاں اعلیٰ ہوٹل کے اخراجات کیا ہوں گے اور دیگر اخراجات بھی تھے۔ منہاج اس طرح اچھل پڑا جیسے اسے اللہ نے صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ کنول کو شملہ لے جائے۔ کنول اسے اپنے ہاتھوں شراب پلاتی تھی اور خود بھی ایک نشہ بن کر اس کی عقل و ہوش پر غالب آ جاتی تھی۔ نشے کی حالت میں کنول پیار و محبت اور فحش حرکات سے منہاج کے ساتھ جو باتیں کرتی تھی وہ

منہاج کے ذہن لاشعور میں اتر جاتی تھیں۔ یہ تو قارئین کرام جانتے ہی ہوں گے کہ انسان کا ہر قول و فعل اس کے ذہنِ لاشعور کے تابع ہوتا ہے۔ اس حسین و جمیل اور انتہائی چالاک لڑکی نے منہاج کے شعور کو سلا دیا تھا۔ اس میں نفع نقصان کا احساس ہی مٹا ڈالا تھا۔

منہاج اپنے کاروبار سے بیگانہ ہو گیا۔ اتنا سا تعلق رکھا کہ ایجنسی میں جاتا اور پہلی بات یہ پوچھتا کہ کوئی پیسہ ویسہ ہے؟ منیجر اور منیم اسے جتنی رقم بتاتے وہ منہاج جیب میں ڈال کر غائب ہو جاتا۔ یہ ساری دولت کنول کے گھر جا رہی تھی۔ منہاج نے مجھے کنول کی کچھ فرمائشیں سنائیں۔ جو منہاج نے پوری بھی کی تھیں تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ تو سچ مچ کا پاگل ہو گیا تھا۔

منہاج کو احساس ہی نہ ہوا کہ کاروبار ٹھپ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آمدنی بہت ہی کم ہو گئی تھی اور کنول کی فرمائشیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ کنول کے کہنے پر منہاج نے مکان بیچنے شروع کر دیئے۔ اس نے مجھے سنایا کہ وہ ایک مکان بیچتا تھا تو کنول اسے بے تحاشہ داد دیتی تھی کہ منہاج نے کیسا عظیم کام کیا ہے جو کوئی اور نہیں کر سکتا۔ بیدار بخت اور کنول کی ماں تو اس کی تعریفیں کرتے تھکتے نہیں تھے۔ وہ جب انہیں بتاتا تھا کہ آج اس نے فلاں مکان بھی بیچ ڈالا ہے تو یہ تینوں خوشی کا اظہار کرتے کہ یہ تو اس نے بڑا ہی کمال کیا ہے پھر تینوں اس سے کسی بڑے ہوٹل میں دعوت کھاتے تھے۔

اس دوران منہاج کو اس کی ماں، بہن اور بہنوئی سمجھانے اور روکنے کی بہت کوشش کرتے تھے لیکن منہاج مرنے مارنے پر اتر آتا تھا۔ وہ سمجھ ہی نہ سکے کہ منہاج پر کیسے آسیب کا قبضہ ہے اور اس آسیب نے اس کے ذہن سے خون کے رشتے مٹا ڈالے ہیں۔

ایک روز آباؤ اجداد کی اتنی بڑی حویلی بھی بک گئی۔ دوسرے مکان پہلے ہی بک چکے تھے اور دکانیں بھی بک گئی تھیں۔ ابھی قرض لینے تک نوبت نہیں پہنچی تھی۔ اگر منہاج قرض اٹھانا شروع کر دیتا تو ایک نہ ایک دن قرض خواہ اسے خودکشی تک پہنچا دیتے۔

وہ ماں جس نے اپنی اتنی اچھی کشادہ حویلی میں شریفانہ اور امیرانہ زندگی گزاری تھی، بیٹے نے اس ماں کو چھوٹے سے بلکہ فضول سے ایک مکان میں کرائے پر رہنے پر مجبور کر دیا۔

ایک روز کنول نے اس سے کوئی مہنگی فرمائش کی تو منہاج کو پتہ چلا کہ اس کے پاس

تو کچھ بھی نہیں رہا۔ سوچتے سوچتے اسے یہی ایک راستہ نظر آیا کہ کچھ رقم قرض لے لی جائے۔ خیال تھا کہ اتنے بڑے اور وسیع کاروبار کی آمدنی سے وہ بڑی جلدی قرض ادا کر دے گا۔ یہ تو اسے احساس ہی نہیں تھا کہ کاروبار برائے نام ہی چل رہا ہے اور جن لوگوں کے ساتھ اس کا کاروبار چلتا تھا، وہ اس سے دور ہٹ گئے ہیں۔

منہاج اپنے والد کے ایک کاروباری دوست کے پاس گیا اور کوئی بہانہ پیش کر کے کہا کہ اسے اتنے ہزار روپیہ قرض چاہئے جو وہ پندرہ بیس دنوں میں واپس دے دے گا۔ اس شخص نے اسے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ ایک پیسہ بھی نہیں دے گا کیونکہ وہ ایک پیسہ بھی واپس کرنے کے قابل نہیں رہا۔ منہاج کو یہ جواب بہت برا لگا اور وہ غصے کے عالم میں ایک اور کاروباری آدمی کے پاس گیا جس کے ساتھ اس کا اچھا خاصا کاروبار چلتا رہا تھا۔ وہاں سے بھی اسے ایسا ہی جواب ملا۔ پھر تیسرے آدمی نے اسے اور زیادہ واضح الفاظ میں کہا کہ اسے کسی سے بھی قرض نہیں ملے گا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ وہ شرابی بھی ہے اور اس کا یارانہ طوائفوں کے ساتھ ہے۔

میں اب ضرورت نہیں سمجھتا کہ اس سے زیادہ تفصیلات بیان کی جائیں۔ ہر بات واضح کر دی ہے۔ پھر وہی بات کہنی پڑتی ہے کہ ایسے کئی لوگوں کو آپ نے اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتے دیکھا ہوگا۔ منہاج پر وہ وقت آیا کہ کنول نے اس کے ساتھ بے رخی شروع کر دی۔ تب اسے ہلکا سا احساس ہوا کہ کنول کو اس کے پیسے سے پیار ہے لیکن کنول تو ایک نشہ تھا جس کا وہ عادی ہو چکا تھا۔ نشہ مفت تو ملا نہیں کرتا۔

اب میں اس داستان کو اس مقام پر لے آتا ہوں جہاں کنول کی ماں نے منہاج کو دروازے سے ہی ٹال کر واپس بھیجنا شروع کر دیا تھا۔ منہاج نے مجھے سچی بات یوں سنائی کہ کنول نے اس کے ساتھ بے رخی تو شروع کر ہی دی تھی لیکن وہ اسے اپنی ماں کی طرح دھتکارتی نہیں تھی۔ منہاج نے بتایا کہ قتل کی رات وہ وہاں گیا تھا اور جس طرح کنول کی ماں نے اسے غصے سے دھتکارا تھا، وہ منہاج نے مجھے اپنی زبان سے سنایا۔ اسے اس قدر غصہ آیا کہ اس کا بس چلتا تو وہ اس عورت کا گلا وہیں گھونٹ دیتا۔ یہ عورت تو اندر چلی گئی اور اس نے دروازہ بند کر دیا۔ منہاج چند منٹ وہیں کھڑا رہا۔ اس کی حالت ویسی ہی ہو گئی جیسی نشے سے ٹوٹے ہوئے انسان کی ہوتی ہے۔

آخر وہ وہاں سے ہٹا اور دوسری طرف سے واپس جانے لگا تو کنول کے کمرے کی کھڑکی کھلی۔ کھڑکی کنول نے کھولی تھی۔ منہاج رک گیا۔ کنول نے مسکرا کر اسے اپنے پاس بلایا۔ وہ آگے ہوا تو کنول نے اس سے پوچھا کہ ماں نے اسے کیا کہا ہے۔ منہاج نے بڑے ہی جذباتی لہجے میں جس سے غم و غصہ بھی تھا، کنول کو بتایا کہ اس کی ماں نے اس کی بہت بے عزتی کی ہے۔ کنول نے کہا اندر آ جاؤ۔

کنول کھلی ہوئی کھڑکی سے ایک طرف ہو گئی اور منہاج کھڑکی سے اندر چلا گیا۔ کنول نے کھڑکی بند کر دی اور پردے آگے کر دیئے۔ کنول نے اسے کرسی پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

منہاج نے کہا کہ آئندہ وہ یہاں نہیں آیا کرے گا کیونکہ اس کے پاس اب کچھ نہیں رہا۔ کنول نے کہا کہ ابھی اس کے پاس بہت کچھ ہے۔ منہاج نے پوچھا اور کیا ہے؟

''تمہاری بڑی بہن کا مکان جو ہے''۔۔۔ کنول نے کہا۔۔۔ ''تم نے خود بتایا تھا کہ بہن کو یہ مکان ابا جان نے دیا تھا جو میں کسی وقت بھی واپس لے سکتا ہوں''۔

منہاج نے کہا وہ مکان لے سکتا بھی ہو تو بھی وہ بہن کا مکان نہیں بیچے گا۔ کنول نے اسے قائل کرنے کے لیے کچھ دلائل دیئے اور کہا کہ وہ مکان بیچ ڈالے۔ منہاج کو اس بات پر غصہ آنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے ذرا غصے سے کہا کہ وہ ایک طوائف کی خاطر اپنی بہن کا مکان نہیں بیچے گا۔

منہاج کی اس بات پر دونوں کے درمیان کچھ تلخی پیدا ہو گئی۔ کنول نے کہا کہ تم اس روز میرے پاس آنا جس روز تمہاری جیب میں تمہاری بہن کے مکان کی رقم ہو گی۔ منہاج نے کہا کہ میں اپنی بہن کو بے گھر نہیں کرنا چاہتا۔ ایک بار پھر دونوں کے درمیان کچھ زیادہ ہی تلخ مکالمے ہوئے۔ کنول نے غصے میں آ کر یہ الفاظ کہہ دیئے کہ مکان نہیں بیچتے تو بہن کو ہمارے بازار میں بٹھا دو۔

منہاج نے مجھے سنایا کہ اسے پہلے ہی اتنا غصہ آ گیا تھا کہ یہ طوائف اسے اس کی بہن کا مکان بیچنے کی تلقین کر رہی ہے اور جب اس نے یہ بکواس کی تو منہاج کا دماغ پاگل پن کی گرفت میں آ گیا۔ قتل کو بجا طور پر ایک لمحے کا پاگل پن کہا گیا ہے۔ منہاج اس پاگل پن کی گرفت میں آ گیا اور اسے پتہ ہی نہ چلا کہ اس نے کنول کی گردن اپنے دونوں ہاتھوں

میں لے لی ہے اور اس کے ہاتھوں کا شکنجہ سخت سے سخت ہوتا چلا جارہا ہے۔ اسے اس وقت ہوش آئی جب اس نے اپنے ہاتھ ڈھیلے کئے اور کنول کی گردن چھوڑی تو کنول فرش پر گر پڑی۔

منہاج نے کھڑکی کی طرف دیکھا اور تیزی سے کھڑکی کھولی اور باہر کود گیا۔

اس نے اپنے چاروں دوستوں کو اکٹھا کیا اور انہیں بتایا کہ وہ کیا کر آیا ہے۔ یہ سب منیم کے گھر اکٹھے ہوئے تھے۔ منہاج کے پاس چند روپے موجود تھے، وہ اس نے منیم کو دے دیئے اور سب نے فیصلہ کیا کہ کنول اگر مرگئی اور پولیس کو منہاج پر شک ہوا تو سب یہ بیان دیں گے کہ منہاج تو ان کے ساتھ سات بجے سے بیٹھا تاش کھیل رہا تھا اور بارہ بجے تک یہیں رہا۔

ان دوستوں نے منہاج کو بہت کھایا تھا اور اب بھی وہ دیکھتے تھے کہ آج منہاج کے پاس پیسے ہیں تو اس سے کھاتے تھے۔ انہوں نے دوستی کا حق ادا کر دیا اور مجھے وہی بیان دیا جو انہوں نے آپس میں طے کیا تھا۔

میں نے اس خوشبو کی بات کی جو منہاج کے کرتے سے اٹھ رہی تھی اور یہ خوشبو دراصل اس سینٹ یا عطر کی تھی جو کنول نے اپنے بالوں کو لگایا تھا۔ منہاج نے بتایا کہ اس نے سامنے سے کنول کی گردن نہیں پکڑی تھی بلکہ یوں ہوا کہ وہ جب غصے سے پھنکارتا اٹھا تو کنول بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور شاید وہ اندر یعنی دوسرے کمرے میں بھاگ جانا چاہتی تھی۔ جونہی کنول نے اندر کا رخ کیا اور پیٹھ منہاج کی طرف کی تو منہاج نے اسے پیچھے سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ یہاں مجھے ایک اور سوال کا جواب مل گیا کہ منہاج کے کرتے کی دائیں آستین پر رگڑ کا نشان کیسا تھا۔

منہاج نے خود ہی بتایا کہ اس نے جب پیچھے سے کنول کو اپنے بازوؤں میں لیا تو غالباً اس وقت یہ بازو کنول کے منہ سے رگڑا گیا اور اس کی لپ سٹک کا نشان آستین پر آ گیا۔ اسی پوزیشن میں منہاج نے کنول کی گردن دبوچی اور پوزیشن یہ ہوگئی کہ کنول کی پیٹھ منہاج کے سینے کے ساتھ لگ گئی تھی۔ کنول کے بال کھلے ہوئے تھے اور اس طرح بال منہاج کے سینے پر رگڑے جاتے رہے۔ کنول کی جب سانس رکنے لگی تو اس نے زور زور سے سر مارا تو اس طرح سر بھی منہاج کے سینے کے ساتھ رگڑا جاتا رہا۔ یوں کنول کی آخری

خوشبو منہاج کے کرتے پر آ گئی۔

یہ تھی منہاج کے جرم کی داستان جس سے مجھے پتہ چلا کہ میں نے جو شہادت اکٹھی کی تھی وہ سو فیصد صحیح تھی۔ بہرحال مجھے دلی اطمینان ہوا کہ منہاج قتل کے جرم کی سزا سے صاف بچ گیا تھا۔

لیکن یہ میرا خیال تھا، میرا وہم تھا۔ سزا انسان نہیں دیا کرتے، سزا اور جزا دینے والا اللہ ہے۔

اس کے چند دنوں بعد میں کہیں جارہا تھا۔ منہاج مجھے جس طرح مل گیا تھا اسی طرح بیدار بخت بھی مل گیا۔ بالکل منہاج کی طرح وہ بھی بڑے ہی تپاک سے ملا جیسے مدتوں سے بچھڑے ہوئے دوست ملا کرتے ہیں۔ یہ کوئی عجیب اتفاق نہیں تھا کہ ڈھاکہ میں مجھے منہاج بھی مل گیا اور بیدار بخت بھی۔ وہ لوگ جو ہجرت کر کے مشرقی پاکستان گئے تھے یا مشرقی پنجاب سے مغربی پاکستان میں آئے تھے، وہ سب اکٹھے تو نہیں آئے تھے بلکہ کنبہ کنبہ یا قافلہ قافلہ کر کے آئے تھے۔ پھر یوں ہوتا رہا کہ بچھڑے ہوئے رشتہ دار یا دوست کہیں نہ کہیں ایک دوسرے کے سامنے آ گئے۔ اسی طرح بیدار بخت بھی میرے سامنے آ گیا۔

اسے ڈھاکہ میں جو مکان ملا تھا وہ قریب ہی تھا۔ وہ مجھے وہاں لے گیا۔ مجھے ایسے آدمی کے ساتھ بے تکلفی نہیں رکھنی چاہئے تھی لیکن پولیس کو اس قماش کے لوگوں کے ساتھ دوستی رکھنی پڑتی ہے کیونکہ یہ تفتیش میں بہت مددگار ثابت ہوتے ہیں اور مخبری کا کام خوش اسلوبی سے کر لیتے ہیں۔ میں اس خیال سے اس کے ساتھ چلا گیا۔

اس نے میری خاطر تواضع کی اور سنایا کہ وہ پٹنہ سے کب اور کس طرح نکلا تھا۔ وہاں کے حالات ایسے بگڑے کہ وہ مشرقی پاکستان آ گیا۔ وہ کوئی اور کاروبار جانتا ہی نہیں تھا نہ کسی اور ذریعہ معاش سے واقف تھا۔ کنول کی ماں پٹنہ میں ہی رہ گئی تھی۔ بیدار بخت نے مجھے صاف الفاظ میں تو نہ بتایا کہ وہ یہاں کیا کام کرتا ہے، اس کی ادھوری ادھوری باتوں سے اور اس کے اشاروں سے میں جان گیا کہ اس کا پیشہ جرائم ہے۔ جوا کھیلنا اور کھلانا تو وہ خوب جانتا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ اپنے کاروبار میں ہی جائے گا لیکن ابھی ایک دو لڑکیاں خریدنے کے لیے پیسے کم پڑ رہے ہیں۔ میں نے اسے بتایا کہ میں کون سے تھانے میں ہوں

اور وہ کبھی میرے پاس آجایا کرے۔

بات کنول کے قتل کی چلی تو اس نے پوچھا کہ میری نگاہ میں قاتل کون تھا۔ میں نے نواب زادہ شہزاد علی کے آدمیوں کے نام لیے تو اس نے کہا میرے بعد ایک ہندو تھانیدار آیا تھا اور اس نے مجھے اور کنول کی ماں کو دو مرتبہ تھانے بلایا اور پھر کبھی نہیں بلایا۔ ہندو تھانیدار نے دونوں مشتبہوں کو چھوڑ دیا اور کیس دبا دیا تھا۔ میں نے بیدار بخت سے کہا کہ اس تھانیدار کے پیٹ میں نوابزادے کا پیسہ چلا گیا ہوگا۔

بیدار بخت نے پورے وثوق سے کہا کہ کنول کا قاتل منہاج الدین تھا۔ اس نے اپنے طور پر ادھر اُدھر سے شہادت اکٹھی کی تھی۔ اسے یہی یقین تھا کہ قاتل منہاج تھا۔

سات آٹھ دن گزر گئے۔ رات گیارہ سوا گیارہ بجے کا وقت تھا۔ میں سویا ہوا تھا۔ دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے دروازہ کھولا۔ میرے تھانے کا ایک کانسٹیبل آیا تھا۔ اس نے بتایا کہ ہسپتال سے ایک پولیس انسپکٹر فدا الاسلام کا فون آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ایک آدمی پر قاتلانہ حملہ ہوا ہے اور اس کا نزعی بیان لیا ہے۔ اس مضروب نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ انسپکٹر ابو بکر صاحب کو بلا لیں، وہ میرے قتل کی بیک گراؤنڈ اچھی طرح جانتے ہیں۔

انسپکٹر فدا الاسلام ڈھاکہ کے ایک اور تھانے کا انچارج تھا۔ میں حیران تھا کہ یہ کون شخص ہے جس نے اپنے نزعی بیان میں میرا نام لیا ہے۔ میں نے بڑی تیزی سے وردی پہنی اور تھانے جا کر سائیکل پکڑی اور اس پر سوار ہو کر ہسپتال پہنچا۔ ایمرجنسی وارڈ کے ڈاکٹر سے پوچھا کہ آج کوئی قاتلانہ حملے کا مضروب آیا ہے۔ ڈاکٹر نے مجھے آپریشن تھیٹر کی طرف بھیج دیا۔ میں دوڑتا ہوا وہاں گیا تو مجھے فوراً آپریشن تھیٹر کے اندر لے گئے جس میں یوں ہر کسی کو جانے نہیں دیا جاتا تھا۔

اندر جا کر دیکھا، آپریشن ٹیبل پر ایک زخمی پڑا تھا۔ اس کے ایک طرف دو ڈاکٹر کھڑے تھے جن میں سے ایک کے ہاتھ میں کاغذوں کا پیڈ اور دوسرے ہاتھ میں بال پوائنٹ تھا۔ ٹیبل کے دوسری طرف انسپکٹر فدا الاسلام کھڑا تھا۔ میں ٹیبل تک گیا تو زخمی کا چہرہ دیکھ کر یوں لگا جیسے کسی نے میرے دل میں خنجر اتار دیا ہو۔ وہ منہاج الدین تھا۔

میں نے اسے آہستہ سے آواز دی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرا۔ اس کی بند آنکھیں

ذرا سی کھلیں اور میں نے اس کے دائیں بازو میں حرکت دیکھی۔ وہ میرے ساتھ ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کا وہ ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ منہاج کی نیم وا آنکھیں پوری کھل گئیں۔ اس کے حلق سے ہلکا سا خراٹا نکلا۔ اس کی آنکھیں جو پوری کھل گئی تھیں وہ وہیں پتھرا گئیں۔ منہاج فوت ہو گیا تھا۔

انسپکٹر فدا الاسلام نے ڈاکٹر کے ہاتھ سے پیڈ لے کر مجھے دیا۔ اس پر منہاج الدین کا نزعی بیان تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ وہ ایک گلی میں سے گزر رہا تھا تو پیچھے سے دو آدمیوں نے اس پر خنجروں یا چاقوؤں سے حملہ کر دیا۔ ایک آدمی نے کہا کہ تم کنول کے قتل کی سزا سے بچ آئے تھے۔ یہ لو سزائے موت۔ منہاج نے بیان میں لکھوایا کہ وہ اس آدمی کو جانتا ہے۔ اس کا نام بیدار بخت ہے۔

یہ بیان دے کر منہاج فوت ہو گیا۔ وقوعہ یوں بیان کیا گیا کہ منہاج گلی میں گرا پڑا تھا۔ اتفاق سے تین آدمی ادھر سے گزرے تو منہاج کو دیکھ کر رک گئے۔ یہ کوئی بھلے آدمی تھے۔ انہوں نے دیکھا یہ تو زندہ ہے تو ساتھ والے گھر سے انہوں نے چارپائی لی اور ایک دو اور آدمی ساتھ لیے اور منہاج کو چارپائی پر ڈال کر ہسپتال پہنچایا۔

ڈاکٹر نے دیکھا کہ یہ زندہ ہے تو اس نے ایک تو تھانے فون کیا اور دوسرے یہ کام کیا کہ منہاج کو کوئی ایسا انجکشن دیا کہ وہ ہوش میں آ گیا۔ اس نے نزعی بیان ڈاکٹر کو، انسپکٹر فدا الاسلام کی موجودگی میں دیا تھا۔

میں نے جب یہ بیان پڑھا تو اس میں منہاج نے یہ بھی لکھوا دیا تھا کہ انسپکٹر شجاع الدین ابو بکر کو فوراً اطلاع دی جائے کیونکہ وہ اس قاتلانہ حملے کی بیک گراؤنڈ سے واقف ہیں اور وہ قاتل کو بڑی اچھی طرح جانتے ہیں۔

کیا اچھا اتفاق تھا کہ بیدار بخت مجھے ملا تھا اور اپنے گھر میں لے گیا تھا۔ میں نے فدا الاسلام سے کہا کہ ایک منٹ دیر نہ کرو اور فوراً میرے ساتھ چلو۔

ہم دونوں تھانیدار باہر آئے۔ دو کانسٹیبل موجود تھے۔ انہیں ساتھ لیا اور میں ان سب کو بیدار بخت کے گھر لے گیا۔

رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ بیدار بخت کے دروازے پر دستک دی تو پہلے اندر سے دھیمی دھیمی باتوں کی آواز آئی۔ پھر یوں لگا جیسے کوئی بہت ہی آہستہ آہستہ

دروازے تک آ رہا ہو۔ میں نے اور زیادہ زور سے دروازے پر ہاتھ مارا تو اندر سے دروازہ کھل گیا۔ دروازہ کھولنے والا بیدار بخت تھا۔

ہم دونوں تھانیدار اسے اندر دھکیلتے ہوئے گھر میں داخل ہو گئے۔ اسے کہا کہ وہ فوراً اپنے دوسرے ساتھی کی نشاندہی کرے اور آلۂ قتل چاقو یا خنجر ہمارے حوالے کر دے۔ بیدار بخت نے ہمیں ٹالنے کی کوشش کی۔ میں نے اس کے منہ پر گھونسہ مارا اور فدا الاسلام نے اس کے پیٹ پر لات ماری۔ وہ درد سے دوہرا ہو گیا۔

مکان کے تین کمرے تھے۔ وہاں دو ہی آدمی رہتے تھے۔ ایک بیدار بخت اور دوسرا اس کا ساتھی۔ وہ بھی جاگ اٹھا تھا اور چارپائی پر بیٹھا آنکھیں پھاڑے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

اب میں آپ کو اس واردات کی پوری تفتیش نہیں سناؤں گا کیونکہ یہ صاف ظاہر ہو چکا ہے کہ قاتل بیدار بخت اور اس کا ایک ساتھی تھا۔ وہ ساتھی یہی تھا جو اس مکان میں موجود تھا۔

اس مکان کا چھوٹا سا صحن تھا۔ دو دھلے ہوئے کرتے صحن میں بندھی ہوئی رسی کے ساتھ لٹک رہے تھے۔ ہم سمجھ گئے کہ ان پر خون کے دھبے ہوں گے۔ انہوں نے گھر آتے ہی کپڑے دھوئے اور لٹکا دیئے۔ ہم نے تلاشی شروع کی تو ایک خنجر اور ایک لمبا چاقو برآمد ہوئے۔ فدا الاسلام ظالم قسم کا پولیس آفیسر تھا۔ اس نے پولیس والا ٹارچر وہیں شروع کر دیا اور سب سے پہلے بیدار بخت نے اقبال جرم کیا پھر اس کا ساتھی بھی بول پڑا۔

ہم نے پڑوسیوں کو جگا کر دو آدمیوں کی موجودگی میں خنجر اور چاقو قانونی طریقے سے برآمد کئے اور دونوں کرتے بھی قبضے میں کر لئے۔ ان برآمدگیوں پر ہم نے ان دونوں آدمیوں کو بطور گواہ دستخط کرنے کو کہا جو انہوں نے کر دیئے۔ بیدار بخت اور اس کے ساتھی کو ہم باقاعدہ گرفتار کر کے تھانے لے گئے۔

بیدار بخت نے اپنے بیان میں کہا کہ تین چار روز پہلے اس نے منہاج الدین کو دیکھ لیا۔ دوڑ کر اس تک پہنچا اور سلام دعا ہوئی۔ منہاج نے بیدار بخت کو بڑی بری سنائی اور کہا کہ بڑا اچھا ہوا تمہاری کنول ماری گئی تھی۔ اس طرح ان کے درمیان کچھ تلخ کلامی ہوئی۔ بیدار بخت نے منہاج سے کہا کہ کنول کا قاتل وہی ہے۔ منہاج نے بڑے بارعب طریقے سے کہا کہ ہاں اسے میں نے قتل کیا تھا، جاؤ میرا جو کچھ بگاڑ سکتے ہو بگاڑنے کی کوشش کرو۔

میں نے آپ کو بیدار بخت کا پورا بیان نہیں سنایا۔ صرف اتنا سنایا ہے جس سے آپ سمجھ لیں گے کہ قتل کا باعث کیا تھا۔

قتل کی رات دن کے وقت بیدار بخت نے منہاج کا پیچھا کیا تھا۔ اس نے بڑے استقلال کا مظاہرہ کیا کہ جہاں کہیں منہاج گیا بیدار بخت اس کے پیچھے اس طرح رہا کہ منہاج اسے دیکھ نہ سکے۔ آخر منہاج ایک دعوت سے واپس آتے اس گلی سے گزر رہا تھا کہ بیدار بخت نے اپنے ساتھی کے ساتھ اس پر قاتلانہ حملہ کر دیا۔ دونوں کو یقین تھا کہ منہاج فوراً مر جائے گا۔ انہوں نے تو خنجر اور چاقو مار مار کر منہاج کی پشت چھلنی کر دی تھی۔ میں نے بعد میں پوسٹمارٹم رپورٹ دیکھی تھی جس پر لکھا گیا تھا کہ خنجر یا چاقو ایک گردے میں سے گزر گیا تھا۔ پھیپھڑے بھی بری طرح کٹ گئے تھے۔

وہ تو منہاج کو مرا ہوا سمجھ کر چلے گئے تھے لیکن اللہ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مقدمہ کورٹ میں گیا، پھر سیشن میں گیا اور چند ہی مہینوں بعد دونوں ملزموں کو سزائے موت سنا دی گئی جو اپیل میں بھی قائم رہی اور ایک روز ان دونوں کو پھانسی دے دی گئی۔

***

ایک جان کا بلیدان

بھارت کے صوبہ بہار کا ایک چھوٹا قصبہ حسین آباد ہے۔ یہ قصبہ گزرے ہوئے پچاس برسوں میں خاصا بڑا ہو چکا ہوگا اور اس کا نام حسین آباد نہیں رہا ہوگا، ہندوؤں نے اسے رام پور یا کرشن آباد یا ایسا ہی کوئی ہندووانہ نام دے دیا ہوگا۔ ہندو اپنے دیس میں اسلام کا ہر نشان مٹانے کے درپے رہتے ہیں۔ بہرحال میں حسین آباد کو ویسے ہی ایک چھوٹے سے قصبے کی صورت میں پیش کروں گا جیسے میرے وقتوں میں ہوتا تھا یا جب اس واردات کے وقت تھا۔ یہ ریلوے سٹیشن بھی ہے اور پولیس سٹیشن بھی۔ امریکہ نے جنگِ عظیم میں جاپان کے دو شہروں، ہیروشیما اور ناگاساکی پر ایٹم بم گرائے تو اس کے کچھ ہی دنوں بعد میرے علاقے میں یہ واردات ہوئی جو آپ کو سنا رہا ہوں۔ اس وقت میں تھانہ حسین آباد کا انچارج سب انسپکٹر ہوا کرتا تھا۔

تعارف کے طور پر تحریر کرتا ہوں کہ صوبہ بہار ہندوؤں کی غالب اکثریت کا صوبہ تھا۔ مسلمان بہت تھوڑے تھے اور معاشی لحاظ سے بھی کمزور تھے۔ انگریزوں کے دورِ حکومت میں ہندوؤں نے صوبہ بہار میں مسلمانوں کا بہت قتلِ عام کیا تھا۔ برصغیر میں جوں جوں تحریکِ پاکستان زیادہ متحرک، فعال اور مقبول ہوتی جارہی تھی، بہار میں ہندو، مسلمانوں کا خون بہانے میں اضافہ کرتے چلے جارہے تھے۔ 1946ء میں تو وہاں کے ہندوؤں نے مسلمانوں کے قتلِ عام کا برصغیر میں ایک نیا ریکارڈ قائم کر دیا تھا۔ یہ میں نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ میں کہا کرتا ہوں کہ ہندوؤں کو درندے کہنا درندوں کی توہین ہے۔ ایسا ہولناک اور ہیبت ناک قتلِ عام کہ مجھ میں آج بھی اتنی ہمت نہیں کہ آنکھوں دیکھے واقعات قلم بند کروں۔ یہاں میں اس واردات اور تفتیش تک ہی اپنے آپ کو پابند رکھنا چاہتا ہوں جس کا اس قتلِ عام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

یوں تو تمام تر صوبہ بہار کے ہندو اپنے مذہب کے معاملے میں دقیانوس تھے لیکن قصبہ حسین آباد اور اس کے اردگرد کے دیہاتی علاقے کے ہندو تو مذہب کے لحاظ سے بہت ہی پسماندہ اور قدیم ہندووانہ روایات کے پابند تھے۔ ستی کی رسم یعنی بیوہ کا اپنے خاوند کے ساتھ ارتھی پر بیٹھ کر جل مرنا انگریزوں کے قانون کے مطابق قتل کا جرم تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہاں ہر بیوہ کو زندہ جلا دیا جاتا، پھر بھی دور دراز کے دیہاتی علاقوں میں ستی کی رسم کی باتیں ہوتی تھیں اور کوئی ایک آدھ واقعہ ہو بھی جاتا تھا۔

انسانی جان کی قربانی کی بھی کہیں نہ کہیں سے خبر مل جاتی تھی۔ یہ ہندو کسی غریب مسلمان یا کسی اچھوت کا بچہ اغوا کر کے اس کی گردن کاٹتے اور اپنے دیوتاؤں کو قربانی پیش کرتے تھے۔ انسانی جان کی قربانی آج بھی دی جاتی ہے۔ کوئی ایک سال پہلے میں نے ایک اخبار میں صوبہ بہار کی خبر پڑھی تھی کہ ہندوؤں نے ایک اچھوت کے بچے کی جان کی قربانی دی تھی۔ یہ لوگ ایسا ایکا کر لیتے ہیں کہ پولیس کسی کے خلاف یہ جرم ثابت نہیں کر سکتی۔ اب تو وہاں پولیس بھی خالصتاً ہندوؤں کی ہے اس لیے کسی اچھوت یا مسلمان کے بچے کو قتل کر دینا کوئی جرم نہیں سمجھا جاتا۔

یہ تو رہا اس علاقے کا تعارف جس کی واردات پیش کر رہا ہوں۔ اب واردات سنیئے...... ایک روز تینتیس چونتیس برس کی ایک مسلمان عورت تھانے آئی اور مجھے ملی۔ بڑی اچھی شکل وصورت کی عورت تھی۔ لوئر مڈل کلاس کی بھی کہہ سکتے ہیں اور اس سے ذرا کم بھی۔ وہ اسی قصبے کی رہنے والی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اس نے کہا کہ اس کا چودہ برس عمر کا بیٹا دو تین دنوں سے لاپتہ ہے۔ میں نے اس سے پہلی بات یہ پوچھی کہ بیٹے کا باپ زندہ نہیں ہے؟ وہ اکیلی کیوں آئی ہے؟

"زندہ ہے"ـــــ عورت نے جواب دیاـــــ "سوتیلا ہے اور ویسے بھی لاپرواہ اور اپنی بات منوانے والا آدمی ہے۔ کہتا ہے لڑکا خود ہی کہیں چلا گیا اور آوارہ گردی کر کے واپس آ جائے گا...... میں ماں ہوں، میرا دل نہیں مانتا۔ لڑکا مجھے بتائے بغیر کہیں نہیں جا سکتا تھا"۔

یہ تو میں نے بھی سوچا تھا کہ چودہ برس عمر کا لڑکا کسی وجہ سے ناراض ہو کر کہیں چلا گیا ہوگا۔ اس عمر میں لڑکے آوارہ دوستوں کے ساتھ اِدھر اُدھر ہو جاتے ہیں اور دو چار دنوں

بعد واپس آ جاتے ہیں۔ اس لڑکے کے سوتیلے باپ نے لڑکے سے عدم دلچسپی کے باعث کہہ دیا ہوگا کہ لڑکا خود ہی کہیں چلا گیا ہے اور واپس آ جائے گا لیکن اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ آج کل آپ نے دیکھا ہوگا اور اخباروں میں بھی پڑھتے رہتے ہوں گے کہ نوجوان لڑکی اغوا ہوگئی اور اس کے گھر والے پولیس کو بمعہ ثبوت لکھوا رہے ہیں کہ فلاں فلاں نے ان کی بیٹی کو اغوا کیا ہے لیکن تھانے دار صاحب بات صاف کہتے ہیں کہ لڑکی خود کسی کے ساتھ چلی گئی ہے، جاؤ ڈھونڈو، ہم کچھ نہیں کر سکتے۔

میں انگریزوں کی بادشاہی کی بات سنا رہا ہوں جب تھانے دار کسی نہایت معمولی رپورٹ کو بھی نظرانداز کرنے کی جرأت نہیں کیا کرتا تھا۔ اس عورت کو میں ٹرخا سکتا تھا کہ پہلے خود لڑکے کو ڈھونڈو، اگر نہ ملے تو پھر میرے پاس آنا لیکن اس دور میں ٹال مٹول اور ٹرخانے کا تصور بھی نہیں تھا۔ میں نے یہ معلوم کرنے کے لیے کہ لڑکے کو گھر سے کوئی ناراضگی ہوئی ہوگی یا کسی اور وجہ سے غصے اور احتجاج میں آ گیا ہوگا، اس عورت سے پوری انکوائری کی۔ اس عورت سے پوچھا کہ سوتیلا باپ اس لڑکے سے کیسا سلوک روا رکھتا تھا۔

''سوتیلے باپ نے تو اسے کبھی اپنا بیٹا سمجھا ہی نہیں''۔۔۔ لڑکے کی ماں نے بتا دیا۔۔۔ ''سوتیلے باپ کا سلوک بہت برا ہے۔ میں مانتی ہوں کہ لڑکا بہت شرارتی ہو گیا ہے۔ سوتیلا باپ اسے مارتا پیٹتا ہے۔ یہ باپ کے برے سلوک کا ہی اثر تھا کہ لڑکا کوئی کام کاج نہیں کرتا تھا''۔

لڑکے کی ماں سے جو معلومات حاصل ہوئیں وہ مختصراً یوں تھیں کہ اس عورت کی شادی قصبہ حسین آباد کے ایک گھر میں ہوئی تھی۔ اپنے خاوند کے ساتھ اس کی بن نہ سکی۔ عورت نے تو یہی کہنا تھا کہ اس کا خاوند بہت برا آدمی تھا اور اس میں کچھ بہت بری عادات تھیں۔ عورت نے ایسے ہی کہا۔

یہ بچہ پیدا ہوا۔ جب یہ آٹھ سال کا ہوا تو میاں بیوی میں جو چپقلش اور کھینچا تانی چلی آ رہی تھی، وہ اس حد تک جا پہنچی جہاں طلاق کو ہی واحد حل سمجھا جاتا ہے۔ اس عورت کو طلاق مل گئی۔ ایک تو اس کا یہ بچہ تھا اور اس سے تین چار سال چھوٹی ایک بچی تھی۔ عورت کے سسرال والے بچے کو اپنے پاس رکھنا چاہتے تھے لیکن لڑکا روتا اور چیختا چلا جاتا تھا۔ بھاگ کر ماں کے پاس آ جاتا تھا۔ لڑکے کے باپ کا باپ جا کر لڑکے کو بہلا پھسلا کر اپنے گھر لے

جاتا لیکن لڑکا پھر بھاگ کر ماں کے پاس پہنچ جاتا تھا۔ بچی تو تھی ہی ماں کے ساتھ۔

ڈیڑھ پونے دو برس بعد اس عورت کی شادی قصبے سے دو اڑھائی میل دور ایک گاؤں میں ایک آدمی کے ساتھ ہوگئی۔ اس آدمی کی بیوی مر گئی تھی اور اس کی دو بچیاں تھیں۔

اس عورت کی مجبوری یہ تھی کہ اس کی بہنیں ہی بہنیں تھیں، بھائی ایک بھی نہیں تھا اور باپ مر چکا تھا۔ عورت دو بچوں کے ساتھ اپنی بیوہ ماں پر بوجھ بننے سے گھبراتی تھی۔ اسے دوسرا خاوند ملا تو اس نے فوراً شادی کر لی۔ یہ خاوند کسان تھا۔ اپنی زمین تھوڑی تھی۔ کچھ زمین بٹائی پر لے رکھی تھی۔ لڑکا جب گیارہ بارہ سال کا ہوا تو باپ اسے کھیتوں پر کام کے لیے چلنے کو کہتا تھا لیکن لڑکا نہیں مانتا تھا۔ سوتیلے باپ کا سلوک پہلے ہی اچھا نہیں تھا، اب اس نے لڑکے کو نافرمانی کی سزا دینی شروع کر دی۔

میری رائے یہ تھی کہ لڑکا احتجاجاً باپ کا ہاتھ نہیں بٹاتا تھا اور ماں اسے پیار سے بگاڑ رہی تھی۔ گیارہ بارہ سال عمر کے بچے کو کاشت کاری کی مشقت پر لگانا کوئی ظلم نہیں تھا۔ ان غریبوں کے اس سے بھی چھوٹے بچے بڑی عمر کے آدمیوں جتنا کام کرتے تھے۔ ماں نے یہ بھی تسلیم کیا کہ لڑکا شرارتی تھا اور سرکش بھی۔ ذرا سی بات پر باغی ہو جاتا تھا۔

میں نے بڑی تفصیلی انکوائری کی تھی اور اتنی ہی تفصیل سے یہاں پیش کرنا بے معنی سمجھتا ہوں، آپ میری رائے کے ساتھ دلچسپی رکھیں۔ میں نے یہ رائے قائم کی کہ لڑکا سوتیلے باپ کے گھر میں اپنے آپ کو قیدی سمجھتا تھا جس پر ظلم و تشدد ہو رہا تھا۔ پھر لڑکا خودسر اور باغی بھی تھا۔ ایسے لڑکے عموماً گھروں سے بھاگ جایا کرتے ہیں اور واپس بھی آ جاتے ہیں۔ میں نے لڑکے کی ماں کو یوں کہہ کر مایوس کرنا مناسب نہ سمجھا کہ لڑکا گھر سے بھاگ گیا ہے اور واپس آ جائے گا۔ البتہ رپورٹ تحریر نہ کی۔ میرا ارادہ ٹالنے والا تھا ہی نہیں۔ میں اس عورت کی پوری پوری مدد کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ وہ ماں تھی اور مجبور ہو کر میرے پاس آئی تھی۔ اس سے پوچھا کہ اس کی یا اس کے اس دوسرے خاوند کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں؟ اس نے میری توقع کے عین مطابق جواب دیا کہ دشمنی کسی کے ساتھ بھی نہیں تھی۔

یہ صوبہ پنجاب یا صوبہ سرحد نہیں تھا جہاں خاندانی دشمنیاں چلتی ہیں اور ایک دوسرے کے آدمی قتل کئے جاتے ہیں ان دونوں صوبوں میں قتل کو تو معمولی واردات سمجھا جاتا ہے

لیکن صوبہ بہار کے لوگوں میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔

اس عورت نے صرف ایک شک بتایا جو یہ تھا کہ اس کا پہلا خاوند یا پہلا سسر لڑکے کو ورغلا کر لے گیا ہوگا۔ اس نے بتایا کہ وہاں ایک دو آدمی بھیج کر معلوم کروا چکی ہے۔ ان لوگوں نے کہا ہے کہ لڑکا ان کے ہاں نہیں گیا۔ میں نے اس سے اس کے پہلے خاوند کا نام اور ایڈریس پوچھ کر لکھ لیا۔

عورت کو دلی طور پر تسلی دی کہ وہ گھر چلی جائے اور میں پوری تفتیش کروں گا اور اس کے بیٹے کو کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالوں گا۔ یہ بھی کہا کہ وہ گھر جا کر اپنے خاوند کو میرے پاس بھیج دے۔

اس کے جانے کے فوراً بعد میں نے ایک کانسٹیبل کو اس عورت کے خاوند کے پہلے گھر کا ایڈریس بتا کر کہا کہ اسے اپنے ساتھ لے آئے۔ خاوند چونکہ اس قصبے کا ہی رہنے والا تھا اس لیے جلدی تھانے پہنچ گیا۔ اس کا باپ بھی اس کے ساتھ تھا۔ عورت کے دوسرے خاوند کا گاؤں بھی میرے ہی تھانے کے علاقے میں آتا تھا۔ یہ بھی اچھا ہوا کہ عورت کا پہلا سُسر بھی آ گیا تھا۔ میں نے پہلے اس کے پہلے خاوند کو بلا کر اپنے پاس بٹھایا اور پوچھا، کیا اسے معلوم ہے کہ اس کا پہلی بیوی سے جو بیٹا تھا وہ لاپتہ ہو گیا ہے؟

اس نے بیزاری کے سے لہجے میں جواب دیا کہ اسے معلوم ہے لیکن اس لڑکے کے ساتھ اسے کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ یہ عورت بدکار تھی اور طلاق کی وجہ بھی یہی تھی۔ اس نے کہا کہ اسے یقین ہی نہیں تھا کہ یہ بیٹا اس کا ہے یا بیٹے کا باپ کوئی اور ہے۔

میں نے اسے بتایا کہ لڑکے کی ماں اس پر شک کرتی ہے کہ وہ لڑکے کو ورغلا کر لے گیا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کا باپ یعنی عورت کا پہلا سسر چاہتا تھا کہ لڑکا ماں کو نہ دیا جائے کیونکہ اسے اس بچے کے ساتھ بہت پیار تھا لیکن بچہ ماں کے بغیر رہتا نہیں تھا اور خاوند یعنی پہلا خاوند اسے رکھنا بھی نہیں چاہتا تھا۔ مختصراً یہ کہ عورت کے پہلے خاوند نے عورت پر بدکاری کا الزام لگا کر یہ ظاہر کیا کہ وہ جس طرح اس عورت سے دست بردار ہو گیا تھا اسی طرح اس لڑکے کو بھی اپنا بیٹا نہ سمجھ کر دل سے اتار دیا تھا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس لڑکے کے ساتھ دلچسپی ہوتی تو کبھی اور کسی قیمت پر لڑکے کو ماں کے ساتھ نہ چھوڑتا لیکن اب چھ

سال گزر گئے ہیں اور اس کے ذہن اور دل پر لڑکے کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا۔

اس کے بعد میں نے اس پہلے خاوند کے باپ کو بلایا۔ یہ لوگ دکانداری کی سطح کا کوئی چھوٹا سا کاروبار کرتے تھے۔ باپ کا انداز اور اس کا لباس معزز لوگوں جیسا تھا۔ میں نے اس کے آگے لڑکے کا نام لیا ہی تھا تو اس شخص کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے ساتھ ذرا طویل گفتگو ہوئی تھی۔ میں اس شخص سے خاصا متاثر ہوا۔ اس نے اپنے بیٹے کو برا بھلا کہا اور بہو کے خلاف کوئی خاص بات نہ کی۔ اس کے ساتھ جو گفتگو ہوئی وہ مختصراً یہ تھی کہ اسے گم شدہ لڑکے کے ساتھ اور لڑکے کو اس کے ساتھ بچپن سے بہت پیار تھا۔ اس نے کہا کہ اس کا اپنا بیٹا بدکار تھا۔ تاڑی (گھٹیا قسم کی دیسی شراب) پیتا تھا اور انتہائی گھٹیا قسم کی عورتوں کے ساتھ اس نے ناجائز مراسم قائم کر رکھے تھے۔

اس پہلی بیوی کو اس شخص کے بیٹے نے دل سے قبول کیا ہی نہیں تھا۔ اس بوڑھے آدمی نے کہا کہ اس کی بہو یعنی گم شدہ لڑکے کی ماں صبر کرنے والی لڑکی تھی۔ اس نے بہت حد تک اپنے آپ پر جبر بھی کیا اور صبر بھی کیا۔ اس نے بتایا کہ یہ عورت ذہنی لحاظ سے خاصی ہوشیار اور ہوش مند تھی۔ اس نے خاوند کو اس برے راستے سے ہٹنے کو کہا تو خاوند نے اسے دھتکارنا شروع کر دیا یہ بچہ پیدا ہوا جو اب لاپتہ ہو گیا تھا۔ بچے نے شعور سنبھال کر دیکھا تو اسے یہی نظر آیا کہ اس کا باپ اس کی ماں کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کرتا ہے۔

اس لڑکے کو دادا سے پیار ملتا تھا یا اپنی ماں سے۔ یہ لڑکا جب پانچ چھ برس کی عمر کو پہنچا تو اس کی ماں نے انتقاماً ایک آدمی کے ساتھ ناجائز راہ و رسم پیدا کر لی۔ خاوند کو ذرا دیر بعد پتہ چلا۔ لڑکا سات آٹھ برس کا ہو گیا تھا جب اس لڑکے کے باپ نے اس کی ماں کو بدکاری کے الزام میں طلاق دے دی۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اپنے اس بیٹے کو بھی ساتھ لے جاؤ اور بیٹی کو بھی کیونکہ یہ دونوں اس کی اولاد ہے ہی نہیں۔ اس طرح ماں اس بیٹے کو اور بیٹی کو بھی ساتھ لے کر اپنے گھر چلی گئی۔ پھر اس نے دوسری شادی کر لی۔

میں نے اس عورت کے اس پہلے سسر سے پوچھا کہ میں اگر یہ کہوں کہ اس لڑکے کو تم لوگوں نے کہیں چھپا کر رکھ لیا ہے تو کیا جواب دو گے؟ اس نے کہا ایسا کرنا ہوتا تو بہت پہلے کر لیتے۔ اب تو اس تلخی کو قبول کر لیا ہے کہ مجھے یہ بچہ واپس نہیں مل سکتا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اس لڑکے کو جو اب نوجوانی کی عمر میں پہنچ گیا ہے۔ ہم ہمیشہ کے لیے تو چھپا کر نہیں

رکھ سکتے۔

میں نے آخر میں اس سے کہا کہ لڑکا ان کے پاس ہے تو واپس بھیج دیں اور عدالت میں جا کر لڑکے کا مطالبہ کریں۔ میں نے یہ بھی کہا کہ مجھے اگر بعد میں پتہ چلا کہ لڑکا آپ کے پاس ہے تو پھر یہ جرم ہوگا جس کی سزا خاصی زیادہ ہوگی۔

میں نے باپ بیٹے کو ڈرایا دھمکایا تو تھا لیکن مجھے بہر حال یقین ہو گیا تھا کہ لڑکا ان کے پاس نہیں۔ قانون کے مطابق آٹھ برس بعد یہ اپنا لڑکا واپس لے سکتے تھے۔ یہ انہیں معلوم تھا...... دونوں کو میں نے بھیج دیا اور تقریباً نصف گھنٹہ بعد مجھے بتایا گیا کہ گم شدہ لڑکے کا سوتیلا باپ آ گیا ہے۔ میں نے اسے اندر بلا لیا۔ اس سے پوچھا کہ لڑکا کہاں جا سکتا ہے اور اگر وہ گھر سے بھاگ گیا ہے تو وجہ کیا ہوگی!

اس شخص نے کوئی زیادہ بات نہ کی۔ کہنے لگا کہ لڑکا گھر سے بھاگ گیا ہے۔ وجہ یہ بتائی کہ لڑکا نکما تھا اور کام سے گھبراتا تھا۔ یہ سوتیلا باپ اسے زبردستی کام پر لگاتا تھا اور لڑکا اتنا ہی زیادہ ڈھیٹ ہوتا جا رہا تھا۔ اس شخص نے تسلیم کیا کہ وہ لڑکے کو مارتا پیٹتا بھی تھا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ یہ لڑکا بری طرح شرارتی تھا اور دلیر اتنا کہ بڑے آدمیوں کے منہ آنے سے بھی نہیں ڈرتا تھا۔ لڑاکا بھی تھا اور کبھی کبھی اس کی کوئی نہ کوئی شکایت بھی آ جاتی تھی کہ اپنے بیٹے کو سمجھاؤ، یہ شریف لڑکا نہیں۔

میں نے لڑکے کے اس سوتیلے باپ سے کہا کہ وہ واپس گاؤں چلا جائے اور جو لڑکے اس کے سوتیلے بیٹے کے گہرے دوست ہیں انہیں تھانے بھیج دے۔ میں نے اس خیال سے ایک کانسٹیبل کو ساتھ بھیج دیا کہ ہو سکتا ہے اس کے کہنے پر کوئی لڑکا تھانے نہ آئے۔

شام ہونے کو تھی جب تین لڑکے اپنے باپوں کے ساتھ تھانے میں آئے۔ میں نے ان سب کو اپنے دفتر میں بلا لیا۔ ان کے باپوں کو تسلیاں دیں کہ وہ گھبرائیں نہیں، ان کے بیٹوں سے کچھ باتیں پوچھنی ہیں اور پھر انہیں فارغ کر دوں گا۔ باپ اپنے بیٹوں کو میرے پاس چھوڑ کر دفتر سے نکل گئے۔

میں نے تینوں کو اکٹھے ہی بٹھائے رکھا۔ وہ کوئی ملزم یا مشتبہ تو تھے نہیں کہ ان سے الگ الگ بیان لیتا۔ میں نے انکوائری شروع کر دی۔ ان سے بہت سوال پوچھے جن سے

میرا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ لڑکا طبعاً کیسا تھا؟ کیا اس میں گھر سے بھاگ جانے والے اوصاف موجود تھے؟ کیا اس نے کبھی ایسی بات کی تھی کہ وہ گھر سے بھاگ جائے گا وغیرہ؟

مجھے گم شدہ لڑکے کا نام بالکل ہی یاد نہیں۔ کہانی سنانے کی سہولت کے لیے اسے سہیل لکھ دیتا ہوں۔ سہیل کے ان دوستوں نے بڑی برخورداری سے اس کے متعلق ہر وہ بات بتائی جو مجھے مطلوب تھی۔ طبعاً وہ دلیر اور شرارتی تھا اور خطرناک حد تک شرارت کر گزرتا تھا۔ لڑائی جھگڑے سے گھبرانے والا نہیں تھا۔ میں یہ واضح کر رہا ہوں کہ دیہاتی لڑکوں کی طرح سادہ لوح نہیں تھا۔ ڈر، خوف اور گھبراہٹ سے تو وہ واقف ہی نہیں تھا۔ تیز طرار اور ذہین بھی تھا۔ اس میں گھر سے بھاگ کر اپنا راستہ خود بنانے والے لڑکوں جیسے اوصاف موجود تھے۔ پھر اس کے گھر میں وہ تمام حالات رواں دواں تھے جو گھروں سے لڑکوں کو بھاگ جانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اپنے باپ کو تو وہ گالیوں سے ہی نوازتا رہتا تھا۔ دوستوں کے ساتھ باپ کا جب بھی ذکر آتا وہ ایک دو گالیاں دے کر باپ کا ذکر کرتا تھا۔

ان لڑکوں نے ایک بات پورے وثوق سے بتائی۔ کہتے تھے کہ ماں کے ساتھ سہیل کو اتنا زیادہ پیار تھا کہ اسے ہر طرح اور ہر قیمت پر خوش رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ تینوں لڑکوں نے ایک دوسرے کی تائید میں کہا کہ سہیل ماں کو چھوڑ کر جانے والا نہیں تھا۔ یہ الگ بات ہے کہ ماں نے اسے خود کہا ہو کہ وہ چلا جائے اور کہیں نوکری کرے لیکن لڑکوں نے یہ بھی کہا کہ ماں اسے اپنی نظروں سے اوجھل کرنا بھی برداشت نہیں کرتی۔

آخر میں ان لڑکوں سے پوچھا کہ سہیل کو انہوں نے آخری بار کب اور کہاں دیکھا تھا۔ ایک اور بات بھی پوچھی، وہ یہ کہ اس نے کبھی تو کہا ہوگا کہ وہ باپ سے اتنا تنگ آ گیا ہے کہ گھر سے بھاگ جائے گا...... لڑکوں نے بتایا کہ سہیل نے کبھی ایسی بات نہیں کہی تھی کہ وہ گھر سے بھاگ جائے گا۔ پھر انہوں نے بتایا کہ دو روز پہلے دوپہر کے کچھ بعد سہیل ان تینوں میں سے دو لڑکوں کے ساتھ کہیں کھڑا یا بیٹھا تھا۔ باپ نے اسے دور سے پکارا۔ سہیل اس کے پاس گیا اور باپ اسے ساتھ لے کر کھیتوں کی طرف چلا گیا۔ اس کے بعد انہوں نے سہیل کو نہیں دیکھا۔

فوراً میرے ذہن میں شک ابھرا۔ اس شک کے تحت میں نے لڑکوں سے پوچھا کہ انہوں نے سہیل اور اس کے باپ کو کھیتوں کی طرف سے واپس آتے دیکھا تھا؟...... تینوں

نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ اس کے بعد سہیل کو نہیں دیکھا۔ اب انہوں نے بتایا کہ سہیل کے باپ کو انہوں نے کھیتوں کی طرف سے واپس آتے نہیں دیکھا۔

میرا شک یہ تھا کہ ایسا نہ ہوا ہو کہ سوتیلے باپ نے خود ہی لڑکے کو غائب یا قتل کر دیا ہو۔ قتل کی صورت میں دو باتیں ذہن میں رکھیں۔ ایک یہ کہ سہیل قتل ہوا ہوتا تو اس کی لاش مل جاتی اور دوسری بات یہ کہ بہار کے لوگ ایسی انتہائی اور سنگین کارروائی کرنے والے لوگ تھے ہی نہیں۔ وہ صحیح معنوں میں مرے اور مٹے ہوئے لوگ تھے۔

میرا مسئلہ یہ تھا کہ سہیل نابالغ اور کم عمر تھا۔ اس کے اغوا کا امکان رد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ قانون اور اپنے فرائض سے ہٹ کر میری ذاتی اور جذباتی رائے یہ تھی کہ لڑکا مسلمان ہے اور میں اسے برآمد کر کے اس کی ماں کی جھولی میں ضرور ڈالوں گا...... میں اسلامی رشتے کی پابندی کرنا چاہتا تھا جو میرا ایمان تھا۔

اگر یہ لڑکی کا معاملہ ہوتا پھر میں دن رات ایک کر دیتا۔ میں نے سہیل کی گم شدگی کی رپورٹ نہیں لکھی تھی۔ دو دن گزر گئے تو سہیل کی ماں ایک بار پھر میرے پاس آئی۔ بیچاری مغموم تھی لیکن اب اس کے خیالات کچھ بدل گئے تھے۔ اس ماں کا ماں ہونے کے علاوہ ایک مسئلہ یہ بھی تھا کہ سہیل ہی اس کا واحد بیٹا تھا۔ باقی تین لڑکیاں تھیں۔ ایک پہلے خاوند سے اور دو دوسرے خاوند سے۔ لڑکے کا ضائع ہو جانا اس کے لیے قابل برداشت نہیں تھا۔

میں نے اپنی ذات کے اشارے پر ماں سے کہا کہ مجھے امید ہے کہ لڑکا خود ہی واپس آ جائے گا۔ میری یہ بات سن کر ماں نے کہا کہ اسے بھی یہی شک ہونے لگا ہے کہ لڑکا باپ کے سلوک سے پریشان ہو کر خود ہی بھاگ گیا ہے۔

ماں نے مزید گفتگو کی تو پتہ چلا کہ اسے دو عاملوں نے جن میں اس علاقے کا ایک مشہور شاہ صاحب تھا، بتایا تھا کہ لڑکا واپس آ جائے گا اور ان دونوں نے ماں کو یقین دلایا تھا کہ لڑکا زندہ اور سلامت ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ لڑکا ہے کہاں۔ ماں نے ان دونوں کی باتیں دل و جان سے تسلیم کر لی تھیں اور وہ تسلی میں تھی۔

میں نے اسے کہا کہ ان دونوں عاملوں نے ٹھیک ہی کہا ہو گا اور غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن جہاں تک میری کوشش کا تعلق ہے میں اپنی تلاش جاری رکھوں گا۔ ماں کو میں نے رخصت کر دیا۔ یہاں میں پھر کہتا ہوں کہ میں اس عورت کو ٹرخا نہیں رہا تھا۔ علاقے کے

مخبروں کو تھانے بلا کر بڑی سختی سے کہہ دیا تھا کہ وہ لڑکے کا سراغ لگائیں۔

دو دن اور گزر گئے۔ تیسری صبح طلوع ہوئی۔ میں اپنے گھر میں تھانے جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل آیا۔ اس نے ایسی اطلاع دی کہ میں اس لڑکے اور اس کی ماں کو ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کو بھول گیا۔ اس اطلاع نے مجھے سرتاپا ہلا ڈالا...... اطلاع یہ آئی تھی کہ ایک گاؤں کے مندر کا پنڈت قتل ہو گیا ہے۔ یہ سن کر میری حالت جو غیر ہو گئی تھی اس کا باعث یہ تھا کہ پنڈت کو کسی مسلمان نے ہی قتل کیا ہو گا اب اس علاقے کے مسلمانوں کا اللہ ہی حافظ ہے۔ ہندوؤں نے صرف قانون پر بھروسہ نہیں کرنا تھا بلکہ انہوں نے قانون اپنے ہاتھ میں لے کر اس علاقے کے ہر مسلمان سے پنڈت کے قتل کا انتقام لینا تھا۔ اس کے علاوہ میری خوف زدگی کا باعث یہ تھا کہ قاتل کو بروقت یا فوراً پکڑ نہ سکا تو ہندو کوتاہی کا الزام تھوپ کر میرے خلاف محکمانہ کارروائی کروا دیں گے جو میرے لیے بہت نقصان دہ اور توہین آمیز ہو گی۔ یہ تو سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ قاتل ہندو ہو گا۔

میں بھاگم بھاگ تھانے پہنچا۔ سات آٹھ سرکردہ ہندوؤں کا ایک وفد میرے انتظار میں میرے دفتر میں بیٹھا تھا۔ میں نے سب سے پہلے وفد سے پنڈت کے قتل پر اس طرح اظہارِ افسوس کیا جیسے میرا اپنا باپ قتل ہو گیا ہو۔

اس وفد کے ایک پنڈت نما آدمی نے پہلی بات یہ کہی کہ تفتیش میں ذرا سی بھی ڈھیل نہ ہو اور قاتل چوبیس گھنٹوں کے اندر پکڑ لیا جائے۔ اس شخص نے ایسے انداز سے یہ بات کہی جیسے میں ان کا تنخواہ دار ملازم یعنی چوکیدار ہوں۔ میں نے جی حضوری کے انداز سے انہیں بتایا کہ ایسا ہی ہو گا بشرطیکہ مجھے ہر وہ بات بتا دی جائے جو تفتیش کے لیے لازمی ہوتی ہے۔

یہ پنڈت ایک ذرا بڑے گاؤں میں قتل ہوا تھا۔ یہ گاؤں گم شدہ لڑکے سہیل کے گاؤں سے ایک طرف کو تھا اور قصبے سے اس کا فاصلہ تقریباً چار میل تھا۔ یہ گاؤں بھی میرے تھانے میں آتا تھا۔ وہاں ہندوؤں نے ایک مندر بنا رکھا تھا۔ تھانے آنے والے وفد نے مجھے بتایا کہ سورج نکلنے سے کچھ پہلے کسی نے دیکھا کہ پنڈت مندر کے اندر مرا پڑا ہے۔ شور شرابہ ہوا تو ہندو وہاں اکٹھے ہونے لگے۔ کسی سیانے آدمی نے پنڈت کا جسمانی جائزہ لیا تو اسے پنڈت کے سر کے ایک طرف کنپٹی پر یا اس سے ذرا قریب ایک ابھار نظر آیا۔ لاش کے

قریب ایک موٹا ڈنڈا پڑا تھا۔ ان لوگوں کا خیال یہ تھا کہ یہ ڈنڈا قاتل نے پنڈت کے سر پر مارا ہے اور اسی سے پنڈت مر گیا۔

میں نے بڑی تیزی سے وفد کے پنڈت نما لیڈر کے نام سے ایف آئی آر تحریر کی اور موقعۂ واردات پر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل اور چار کانسٹیبلوں کو ساتھ لے کر چل پڑا۔ وفد کے لوگ تین یکے لائے تھے۔ ہم سب ان پر سوار ہوئے اور روانہ ہو گئے۔ میدانی علاقہ تھا پگڈنڈیاں ہموار تھیں، یکوں نے ہمیں جلد ہی منزل پر پہنچا دیا۔

مندر کے باہر ہندوؤں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ یہ ہجوم غم و غصے سے بھرا ہوا ہے اور بارود کی طرح ذرا سی چنگاری ملنے سے پھٹ جائے گا۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ علاقے کا تھانیدار مسلمان ہے۔ مجھے دیکھتے ہی ہجوم سے کئی آوازیں اٹھیں جو مسلمانوں کے اور خاص طور پر میرے خلاف تھیں۔ مثلاً ایک آواز یہ تھی جو مجھے آج تک یاد ہے ــــ ''قاتل نہ ملا تو ہم کسی مسلمان کو زندہ نہیں رہنے دیں گے'' ــــ ایک آواز تو بار بار اٹھتی تھی ــــ ''مسلمان کے سوا اور کوئی قاتل ہو ہی نہیں سکتا'' ــــ یوں لگتا تھا جیسے اس صوبے پر ہندوؤں کا راج ہے اور وہ قانون کو اپنے گھر کی لونڈی سمجھتے ہیں۔

میرے دل میں نفرت کا طوفان اٹھا لیکن میں اس طوفان کو دبائے رکھنے کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ انڈین فلموں اور انڈین فلموں کے گانوں کے رسیا پاکستانی لوگ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کی نفرت کس حد تک بھری ہوئی ہے یہ نفرت کسی دور میں بھی کم نہیں ہوئی بلکہ بڑھتی ہی چلی آ رہی ہے۔

میں ہجوم میں سے راستہ بناتا مندر کے اندر جانے لگا تو ایک بڑی ہی توہین آمیز آواز میرے کانوں میں پڑی۔ آواز یہ تھی کہ خیال رکھنا یہ یعنی میں مسلمان ہے اور تفتیش میں ضرور گھپلا کرے گا...... میں مندر کے دروازے میں رک گیا۔ مندر ذرا اونچے چبوترے پر کھڑا تھا۔ میں نے پیچھے مڑ کر ہجوم کا سامنا کیا اور ہاتھ بلند کر کے ہجوم کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

''سب لوگ میری ایک بات غور سے سن لو'' ــــ میں نے بڑی بلند آواز میں کہا ــــ ''میں مسلمان ہوں اور تم لوگ مسلمانوں کو اور مجھے برا بھلا کہے جا رہے ہو لیکن یہ نہ بھولو کہ یہاں تمہاری بادشاہی نہیں، انگریز کی بادشاہی ہے اور انگریز کا قانون چلتا ہے۔ یہ بھی سوچ

لو کہ اس علاقے کا پولیس کپتان (ڈی ایس پی) انگریز ہے۔ اگر تم لوگوں نے اشتعال انگیزی بند نہ کی تو میں اس انگریز پولیس کپتان کو اطلاع بھجوادوں گا اور وہ پولیس کی گارد لے کر فوراً پہنچ جائے گا پھر تمہارے پنڈت کے قتل کی تفتیش دھری رہ جائے گی۔ میں ہر اس شخص کو گرفتار کر لوں گا جو دوسروں کو فساد پر اکسائے گا۔ سب لوگ مندر سے دور ہٹ جاؤ''۔

یہ بات ذہن میں رکھیں کہ ہندو بڑی ہی بزدل قوم ہے لیکن ہجوم کی صورت میں ہندو بڑے ہی دلیر ہو جاتے ہیں۔ ہندو مسلمانوں کا جو قتل عام کرتے رہے ہیں اور اب بھی کرتے ہیں، یہ ہجوم کی صورت میں کرتے ہیں۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک ہندو ایک مسلمان کے مقابل آ کر اسے للکارے۔ ایک مسلمان کو سات آٹھ ہندو اکٹھے ہو کر قتل کرتے ہیں۔

میں نے ہجوم پر نگاہ دوڑائی۔ ہجوم پر خاموشی طاری رہی لیکن میں خوب جانتا تھا کہ اس خاموشی میں ایک ہولناک طوفان چھپا ہوا ہے۔ میں مندر کے اندر چلا گیا اور مجھے لاش تک لے جایا گیا۔ نفرت کا یہ عالم تھا کہ اس مندر سے مجھے تعفن اٹھتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پنڈت کی لاش فرش پر پڑی تھی۔ قریب سامنے ایک چبوترہ سا بنا ہوا تھا جس پر ایک تو گنیش دیوتا کا بت تھا اور اس کے ساتھ کرشن مہاراج کی مورتی تھی اور ان پر پھولوں کے ہار ڈالے ہوئے تھے۔

میں نے لاش کو پاؤں سے سر تک دیکھا۔ کنپٹی کا ابھار بڑا ہی نمایاں تھا۔ قریب ڈنڈا پڑا ہوا تھا۔ یہ شاہ بلوط کی لکڑی کا موٹا ڈنڈا تھا۔ شاہ بلوط کی لکڑی لوہے کی طرح مضبوط اور وزنی ہوتی ہے۔ مجھے یقین ہو گیا کہ پنڈت کے سر پر یہی ڈنڈا مارا گیا ہے۔

میں نے پوچھا کہ یہ ڈنڈا اس مندر میں ہی پڑا تھا یا نہیں...... بتایا گیا کہ مقتول پنڈت کبھی کبھی یہ ڈنڈا اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ قتل کے وقت بھی یہی ڈنڈا اس کے ساتھ تھا۔ اس سے یہ ظاہر ہوا کہ قاتل کے پاس کوئی اور آلۂ قتل نہ تھا یعنی چھری، خنجر اور چاقو۔ ہوتا تو وہ اس ہتھیار سے پنڈت کو قتل کرتا۔ پنڈت کا ہی ڈنڈا استعمال نہ کرتا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قاتل قتل کی نیت سے نہیں آیا تھا۔ قتل کی نیت سے آیا ہوتا تو اپنے ہتھیار سے پنڈت کو قتل کر کے جاتا۔

میں نے اپنے تجربے کی بنا پر اور وہاں جو شواہد نظر آئے، انہیں دیکھ کر قتل کا یہ نقشہ

ذہن میں بنایا کہ کوئی آدمی پنڈت کے ساتھ یہاں موجود رہا اور بیٹھے بٹھائے کوئی ایسی اشتعال انگیزی ہوگئی کہ اس شخص نے قریب پڑا ڈنڈا اٹھا کر پنڈت کے سر پر مارا اور بھاگ نکلا۔ میں ان پنڈتوں کے کردار اور اخلاق سے بھی واقف تھا۔ عورت کے معاملے میں یہ پنڈت صاف نیت ہوتے ہی نہیں تھے۔

یہ دوسرا شک تھا جو میرے ذہن میں آیا۔ اس شک کی شکل وصورت یہ تھی کہ پنڈت نے کسی بے اولاد عورت کو اولاد کا جھانسہ دے کر مندر میں بلایا ہوگا اور اس کی عزت پر ہاتھ ڈالنے لگا تو عورت نے غیرت مندی کا یہ مظاہرہ کیا کہ ڈنڈا اٹھا کر پنڈت کے سر میں مارا اور بھاگ گئی لیکن اس شک کو میں نے اس بنا پر کمزور پایا کہ ہندو عورتوں کا اخلاق بھی گرا ہوا ہوتا تھا۔ ہندو مذہب تو یہ اجازت بھی دیتا ہے کہ کسی ہندو کی اولاد نہ ہو تو وہ اپنے کسی دوست کی خدمات حاصل کرسکتا ہے جو اس طرح ہوتی ہے کہ وہ اپنی بیوی اپنے دوست کے حوالے کر دے۔ جب بیوی امید سے ہو جائے تو اسے واپس لے آئے۔ نئے دور کے روشن خیال ہندو تسلیم نہیں کرتے کہ ان کے مذہب میں یہ سہولت اور اجازت حاصل ہے لیکن کسی بھی دقیانوسی اور کٹڑ پنڈت سے پوچھ لیں۔ وہ بتائے گا کہ مذہب ہندوؤں کو یہ سہولت اور اجازت دیتا ہے۔

ویسے بھی ہندو عورتیں پنڈتوں اور ننگ دھڑنگ سادھوؤں کے سامنے ایسی شرمناک حرکتیں کرتی ہیں جن کا ذکر بھی نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے ہندو عورتوں کے اس کردار کو سامنے رکھ کر سوچا تو میرا یہ شک رفع ہوگیا کہ کسی غیرت مند ہندو عورت نے پنڈت کے سر پر ڈنڈا مارا ہے۔

لاش پوسٹمارٹم کے لیے ایک یکے پر بھجوادی۔ قصبہ حسین آباد میں سرکاری ہسپتال تھا جس کا ڈاکٹر عام قسم کے پوسٹمارٹم کر لیتا تھا۔ تفتیش کے لیے مجھے اس وقت تک اس گاؤں میں ہی رہنا تھا جب تک میں کسی یقینی سراغ تک نہ پہنچ جاتا۔ میرے کہنے پر کسی بھی گھر میں میرے لیے بیٹھنے کا انتظام ہوسکتا تھا لیکن مندر کے سامنے بڑ کا ایک بڑا گھنا درخت تھا۔ موسم اچھا تھا۔ مجھے اس درخت کے نیچے بیٹھنا اچھا لگا۔ میں نے گاؤں کے ٹھاکر سے کہا کہ بڑ کے نیچے میرے لئے بیٹھنے کا بندوبست کر دیا جائے۔ فوراً ہی ایک کرسی اور چھوٹی سی ایک میز آ گئی اور دو چار پائیاں بھی میز اور کرسی کے ساتھ رکھ دی گئیں۔ میں نے ٹھاکر سے کہا کہ

کوئی آدمی یہاں کھڑا نہ رہے، سب یہاں سے چلے جائیں ورنہ میں کانسٹیبلوں سے کہہ دوں گا کہ جوئی کوئی تماشا دیکھنے یہاں رکے گا اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔

سب سے پہلے میں نے پنڈت کے پسماندگان کے متعلق پوچھا۔ بتایا گیا کہ اس کی بیوی ہے اور ایک بڑا بیٹا ہے جس کی عمر سولہ سترہ سال ہے۔ دو یا تین اور بیٹے تھے جو چھوٹے تھے۔ مجھے مقتول کے گھر کے ایسے افراد کی ضرورت تھی جو اچھی طرح سوچ سمجھ کر میرے سوالوں کا جواب دینے کے قابل ہوتے۔ میں نے مقتول پنڈت کی بیوی اور اس کے بڑے بیٹے کو بلوایا۔

مقتول کا گھر مندر کے قریب ہی تھا۔ اس کی بیوی اور بڑا بیٹا فوراً آ گئے۔ دونوں کو اکٹھے ہی بٹھالیا ان سے کوئی زیادہ انکوائری نہیں کرنی تھی۔ ایک بات تو یہ پوچھی کہ پنڈت کی کسی کے ساتھ کوئی بڑی ہی سنگین قسم کی دشمنی تھی؟ بیوی اور بیٹے نے یقین کے ساتھ کہا کہ کوئی دشمنی نہیں تھی بلکہ ہندو تو ہندو مسلمان بھی اس کا احترام کرتے تھے اور دو گھر عیسائیوں کے ہیں، وہ بھی پنڈت کو جیسے اپنا مذہبی پیشوا سمجھتے ہوں۔

پھر پوچھا کہ پنڈت رات کس وقت مندر میں گیا تھا۔ میرے خیال میں پنڈت کو رات کے وقت مندر میں کوئی کام نہیں ہوسکتا تھا۔ عبادت کے لئے تو لوگ صبح کے وقت جایا کرتے تھے۔

وہاں دشواری یہ تھی کہ اَن پڑھ اور دیہاتی لوگ تھے جنہیں صحیح وقت کا علم ہی نہیں ہوتا تھا۔ بیوی نے بتایا کہ مقتول شام کا کھانا کھا کر سو گیا تھا اور بیوی سے یہ کہہ کر سویا تھا کہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد اسے جگا دیا جائے، اسے مندر میں جانا ہے...... بیوی نے اسے جگا دیا اور وہ مندر کو چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد بیوی ایسی سوئی کہ اسے ہوش ہی نہیں رہا کہ پنڈت واپس آیا ہے یا نہیں۔ علی الصبح ابھی نیم تاریکی تھی جب اسے ایک آدمی نے آکر بتایا کہ پنڈت مندر میں مرا پڑا ہے۔

پھر میں نے پوچھا، کیا پنڈت ہر روز رات کے وقت مندر میں جایا کرتا تھا یا اکثر جاتا رہا تھا؟...... بیوی اور بیٹے نے بتایا کہ رات کو مندر میں جانا پنڈت کا معمول نہیں تھا۔ اگر کبھی جانا ہوتا بھی تو شام کے بعد کچھ دیر کے لیے جاتا اور واپس آ جاتا تھا۔

پاکستان کے دیہات میں دیکھا گیا ہے کہ گاؤں کی مسجدوں کے مولویوں کو اتنی سی

ہی حیثیت حاصل ہوتی ہے کہ وہ پیش امام ہیں لیکن یہ مولوی نمبرداروں، جاگیرداروں اور ایسے ہی بڑے زمینداروں کے خوشامدی اور غلام بنے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ بڑے چوہدری کے حکم سے اعلان کرتے ہیں کہ عید کس روز ہوگی۔ اس کے مقابلے میں دیہات کے پنڈتوں کی حیثیت بہتر بلکہ قابلِ احترام ہوتی تھی جس کی وجہ یہ ہے کہ ہندو، خصوصاً دیہاتی ہندو، توہم پرست لوگ ہیں۔ وہ پنڈتوں کو دیوتاؤں کے نمائندے سمجھتے ہیں۔ پھر پنڈتوں نے یہ قابلیت حاصل کر رکھی ہے کہ زائچے نکالتے ہیں اور شبھ گھڑی بتاتے ہیں۔ شادیوں کی تاریخیں پنڈتوں سے پوچھ کر طے کی جاتی ہیں۔ اکثر لوگ بچوں کے نام بھی پنڈتوں سے پوچھ کر رکھتے ہیں۔ بھارت کے دیہات میں آج بھی پنڈت سادہ لوح ہندوؤں کو بے وقوف بنا کر رکھتے ہیں۔

اس کے بعد میں نے ٹھاکر کو بلایا جسے نمبردار کی حیثیت حاصل تھی۔ یہ سرکاری حیثیت تھی۔ آپ نے پولیس انسپکٹروں کی کہانیوں میں پڑھا ہوگا کہ یہ نمبردار لوگ بڑے ماہر خوشامدی ہوا کرتے تھے۔ تھانیداروں کے آگے تو بچھ بچھ جاتے تھے۔ یہ ٹھاکر بھی اسی نسل سے تھا جو انگریزوں کو آسمان سے اتری ہوئی قوم سمجھتا تھا۔

''ٹھاکر بھیا!''ــــ میں نے اسے کہاــــ ''میں مان نہیں سکتا کہ تمہیں معلوم نہ ہو کر پنڈت کے قتل کا باعث کیا ہے۔ تمہارا پنڈت گاؤں کی سیاست کا شکار ہوا ہے۔ اگر تمہیں معلوم نہیں تو تم اس حیثیت کے قابل بھی نہیں''۔

اسے میں نے خوب لتاڑا، ڈرایا اور اسی پر زور دیا کہ وہ قاتل کو میرے سامنے لائے یا کوئی ایسا اشارہ دے دے کہ میں قاتل کو پکڑ سکوں۔ وہ بڑی ہی بے بسی سے لاعلمی کا اظہار کرنے لگا۔ اس کے ساتھ باتیں ہوتی رہیں اور ان باتوں میں مجھے یہ پتہ چلا کہ سب سے پہلے کس نے دیکھا تھا کہ پنڈت مرا پڑا ہے۔ میں تو یہی سمجھتا رہا کہ صبح سویرے ہندو پرارتھنا کے لیے مندر میں آئے تو کسی نے پنڈت کو مرا ہوا دیکھا۔

میں اس شخص کو شاملِ تفتیش کرنا چاہتا تھا جس نے سب سے پہلے پنڈت کی لاش دیکھی تھی۔ ٹھاکر سے پوچھا کہ وہ آدمی کون ہے اور اس شخص کے متعلق اس کی کیا رائے ہے۔ ٹھاکر نے بتایا کہ وہ درصل مندر کا ہی آدمی ہے اور اسے پنڈت کا بالکا یا شاگرد کہا جائے تو صحیح ہوگا۔

تفتیش میں بات سے بات نکلتی چلی جاتی ہے اور اس طرح کچھ ایسے انکشاف ہو جاتے ہیں جن کے متعلق ذہن میں ذرا سا بھی خیال نہیں ہوتا۔ اسی طرح ٹھاکر نے کہا کہ اس شخص نے سب سے پہلے اسے گھر جا کر بتایا تھا کہ پنڈت مندر میں مرا ہوا پڑا ہے۔ ٹھاکر جب مندر میں گیا تو کچھ اور لوگ بھی آ چکے تھے۔

میں نے ٹھاکر سے کہا کہ وہ اس شخص کو میرے پاس بھیج دے۔ ٹھاکر یہ کہہ کر چلا گیا کہ یہیں کہیں ہوگا، ابھی اسے بھیجتا ہوں۔ وہ ایک گاؤں تھا، کراچی اور لاہور جیسا شہر نہیں تھا کہ کسی کو تلاش کرنے میں پورا دن گزر جاتا۔ یہ شخص میرے پاس آ تو گیا لیکن کم و بیش نصف گھنٹہ بعد آیا۔ میں نے پہلی بات یہ پوچھی کہ وہ کہاں تھا کہ آتے آتے اس نے اتنا وقت ضائع کر دیا ہے؟ اس نے ڈرے ڈرے سے لہجے میں دبی دبی زبان میں کہا کہ وہ یہیں تھا۔

کچھ اس نے بیان دیا اور کچھ میں نے سوال کئے اور اس طرح سے جو مجھے معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ یہ شخص پنڈت کا شاگرد تھا اور مندر کے ساتھ ہی ایک کوٹھڑی جیسے کمرے میں رہتا تھا۔ صبح بہت سویرے مندر میں جھاڑو دیتا تھا۔ اس صبح وہ کوٹھڑی سے نکلا اور جب وہ مندر کی صفائی کر رہا تھا تو اسے پنڈت مرا ہوا نظر آیا۔ ابھی مندر میں اور کوئی نہیں آیا تھا۔ وہ سب سے پہلے پنڈت کے گھر گیا اور اس کی بیوی کو بتایا۔ اس کی بیوی روتی، چیختی اور چلاتی مندر کی طرف اٹھ دوڑی۔ اس کے بیٹے بھی اس کے پیچھے پیچھے دوڑتے مندر کے اندر آ گئے۔ اس چیخ و پکار پر لوگ گھروں سے نکل آئے اور مندر میں آ کر پنڈت کو مرا ہوا دیکھا۔

ٹھاکر نے مجھے بتایا تھا کہ یہ شخص سب سے پہلے اس کے گھر گیا اور اسے اطلاع دی کہ پنڈت مندر میں مرا پڑا ہے لیکن یہ بتا رہا تھا کہ وہ سب سے پہلے پنڈت کے گھر گیا۔ بات معمولی سی تھی لیکن مجھے ٹھاکر پر غصہ آیا کہ وہ اپنے نمبر بنا رہا تھا۔ میں نے پنڈت کے اس شاگرد سے پوچھا کہ ٹھاکر کس وقت مندر میں آیا تھا۔ اس نے جواب دیا کہ ٹھاکر کو اس نے لوگوں کے ہجوم میں دیکھا تھا۔

''......لیکن ٹھاکر نے مجھے کچھ اور بتایا ہے''ــــ میں نے کہاــــ ''تم نے سب سے پہلے ٹھاکر کو جا بتایا تھا''۔

اس نے کوئی جواب دینے کی بجائے احمقوں کی طرح میرے منہ کی طرف دیکھنا

شروع کر دیا۔ اس کے چہرے پر پولیس کا خوف صاف نظر آ رہا تھا۔

''ایک بات اچھی طرح پلے باندھ لو''۔۔۔ میں نے ذرا غصیلی آواز میں کہا۔۔۔ ''بات کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، مجھے صحیح بات بتاؤ۔ ذرا جتنا بھی جھوٹ بولا تو گرفتار کر لوں گا''۔

میں نے اسے یہ وارننگ دینا ضروری سمجھا تھا۔ وہ اہم گواہ تھا۔ اب اسے چاہئے تھا کہ بتا دیتا کہ اس نے کیوں کہا تھا کہ سب سے پہلے اس نے ٹھاکر کو اس کے گھر جا کر اطلاع دی تھی یا معذرت کر لیتا کہ یہ بات ایسے ہی اس کے منہ سے نکل گئی تھی لیکن اس کا ردِعمل دیکھا تو تھوڑا سا حیران ہوا اس کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا تھا۔ اُلوؤں کی طرح دائیں بائیں اور کبھی دروازے کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے اسے اور کچھ بھی نہ کہا اور نظریں اس کے چہرے پر مرکوز رکھیں۔ وہ میری طرف دیکھتا تھا تو اس کی گھبراہٹ میں نمایاں طور پر اضافہ ہو جاتا تھا۔

''کیا تم ٹھاکر سے ڈرتے ہو؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''کیا ٹھاکر نے تمہیں کہا تھا کہ یہ بیان دینا کہ تم نے سب سے پہلے اسے اطلاع دی تھی اور وہ سب سے پہلے مندر میں پہنچا تھا؟''

اب تو اس کی حالت اور بھی بری ہو گئی۔ میں سمجھ گیا کہ یہ ٹھاکر سے ڈرتا ہے اور ٹھاکر نے اپنے نمبر بنانے کے لیے اسے کہا ہو گا کہ مجھے یہ بتائے کہ ٹھاکر سب سے پہلے لاش پر پہنچا تھا...... میں نے بڑے سخت غصے کے لہجے میں اس آدمی کہا کہ وہ بولتا کیوں نہیں۔ وہ تو کانپنے لگ گیا۔ ایک تو پہلے ہی میرے دل میں ہندوؤں کی نفرت بھری ہوئی تھی، اس شخص کا یہ ردِعمل اور ردّیہ دیکھا تو میرا غصہ بے قابو ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ شک بھی ہوا کہ پنڈت کو کسی بڑی سنگین وجہ سے اس نے قتل نہ کیا ہو!

''اب میں تمہیں اپنا دوست سمجھتا ہوں''۔۔۔ میں نے اپنے لہجے کو نرم کر کے کہا۔۔۔ ''اگر تم نے پنڈت کو قتل کیا ہے تو صاف بتا دو۔ مجھ سے کوئی سی قسم لے لو میں پردہ پوشی کروں گا''۔ اب تو اس کی حالت یہ ہو گئی جیسے بے ہوش ہو جائے گا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن ہونٹ کانپ کر رہ جاتے تھے۔ میں نے دو تین مرتبہ اسے پیار سے کہا کہ وہ صحیح بات اگل دے لیکن اس کی حالت غیر ہی ہوتی چلی گئی۔ مجھے پھر غصہ آ گیا۔

''قاتل تم ہو''۔۔۔ میں نے کہا۔

اس نے تڑپنا شروع کر دیا۔ کبھی ہاتھ جوڑ دیتا اور کبھی اوٹ پٹانگ سی حرکتیں کر کے کہتا کہ یہ بالکل جھوٹ ہے۔

''میں ٹھاکر سے ڈرتا ہوں''۔۔۔ آخر اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے۔۔۔ ''وہ مجھے بہت مارے گا''۔

''ٹھاکر مجھ سے بڑا نہیں''۔۔۔ میں نے کہا۔۔۔ ''تھانیدار میں ہوں ٹھاکر نہیں۔ سچ بولو ورنہ ابھی ہتھکڑیاں لگوا دوں گا''۔

''میں نے قاتل کو دیکھا تھا''۔۔۔ اس نے کہا۔۔۔ ''قاتل نے پنڈت کے سر پر ڈنڈا مارا تھا اور بھاگ گیا تھا۔ وہ چودہ پندرہ سال عمر کا لڑکا تھا۔ میں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ہمارے گاؤں کا رہنے والا نہیں۔ پنڈت نے مجھے بتایا تھا کہ ایک لڑکا رات کو اس کے پاس آ رہا ہے اور وہ سونہ جائے اس لیے وہ جاگتا رہا تھا''۔

''پھر تم نے صبح کیوں پنڈت کے گھر اطلاع دی کہ پنڈت مندر میں مرا ہوا ہے؟''۔۔۔ میں نے پوچھا۔۔۔ ''تم تو کہتے ہو کہ قاتل جو کوئی بھی تھا۔ پنڈت کو رات کو ہی مار گیا تھا اور تم نے اسے دیکھا تھا۔ تم نے اسی وقت سب کو کیوں نہ بتایا؟...... اب ذرا ہوش ٹھکانے رکھ کر بات کرنا ورنہ میں تمہیں ہی قاتل سمجھوں گا اور ہتھکڑی لگا کر ساتھ لے جاؤں گا''۔

''کیا آپ مجھے ٹھاکر سے بچالیں گے؟''۔۔۔ اس بزدل ہندو نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔۔۔ ''ٹھاکر کو بھی معلوم تھا کہ یہ نوجوان لڑکا رات کو پنڈت کے ساتھ تھا''۔

میں نے اسے پوری طرح مطمئن کر دیا کہ ٹھاکر سے اسے بچائے رکھوں گا اور میری موجودگی میں ٹھاکر اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔

''اصل میں بات یہ ہے مہاراج!''۔۔۔ اس نے کہا اور اس کے ساتھ ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس دوران وہ سسکیوں اور ہچکیوں کے ساتھ کہنے لگا۔۔۔ ''ٹھاکر نے مجھے راز داری سے کہا تھا کہ رات کو پنڈت کے پاس جوان لڑکا آئے گا، اس کا کسی کے ساتھ ذکر نہ کرنا لیکن مہاراج! ہوا یہ کہ یہ لڑکا پنڈت کو مار ہی گیا''۔

اس کم عقل اور بزدل آدمی کے ان الفاظ سے مجھے پکا شک ہو گیا کہ پنڈت ۔

ٹھاکر نے اس لڑکے سے مروایا ہے۔ ٹھاکر کی پنڈت کے ساتھ کوئی دشمنی ہوگی۔ سوچنے والی بات یہ تھی کہ پنڈت ٹھاکر اور اس لڑکے کے جال میں کس طرح آگیا کہ رات اتنی دیر سے خاص طور پر مندر میں گیا۔ کیا ٹھاکر نے پنڈت کو کوئی لالچ دیا تھا یا اسے یہ کہا تھا کہ اس کے پاس وہ ایک بڑی خوبصورت لڑکی بھیج رہا ہے؟...... مجھے ان سوالوں کے جواب کسی نہ کسی طرح لینے تھے۔

"یہ بتاؤ"—— میں نے پوچھا—— "اس لڑکے کو مندر میں کون لایا تھا؟"

"یہ مجھے معلوم نہیں"—— اس نے جواب دیا—— "میں ویسے ہی مندر کے اندر گیا تو پنڈت کے سامنے فرش پر لڑکا بیٹھا ہوا تھا۔ پنڈت اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھ رہا تھا۔ اچانک لڑکے نے پاس پڑا ہوا ڈنڈا اٹھایا اور بڑی زور سے پنڈت کے سر پر ایک طرف مارا اور اٹھ کر بھاگ گیا۔ اس وقت پنڈت سر سے ننگا تھا۔ وہ ایک طرف لڑھک گیا۔ میں نے جا کر دیکھا اور کئی بار بلایا، پنڈت جی مہاراج، پنڈت جی مہاراج لیکن وہ نہ بولا پھر اس کی آنکھیں پتھرا گئیں اور میں نے اس کی نبض دیکھی۔ نبض بند ہوگئی تھی"۔

"اگر وہ لڑکا تمہارے سامنے لایا جائے تو کیا اسے پہچان لو گے؟"—— میں نے پوچھا۔

"پہچان لوں گا مہاراج!"—— اس نے جواب دیا۔

"تم نے رات کو ہی پنڈت کے گھر والوں کو کیوں نہ بتا دیا کہ پنڈت مارا گیا ہے؟"—— میں نے پوچھا۔

"میں ٹھاکر کے گھر چلا گیا"—— اس نے جواب دیا—— "اسے جگایا اور کان میں بتایا کہ یہ واقعہ ہوگیا ہے۔ ٹھاکر نے کچھ سوچ کر مجھے کہا کہ ابھی کسی کو نہ بتانا۔ صبح سویرے پنڈت کے گھر والوں کو بتا دینا کہ تم نے صبح مندر میں جا کر صفائی شروع کی تو دیکھا پنڈت جی مہاراج مرے پڑے ہیں"۔

میں نے تفتیش وہیں روک دی۔ اس شخص کو اپنے پاس بٹھا لیا اور ٹھاکر کو بلایا۔ وہ آیا تو میں نے ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ ان دونوں کو تھانے ساتھ لے چلو۔ ٹھاکر نے مجھے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن میں نے اس کی طرف توجہ نہ دی۔ دو یکے لئے جو باہر انتظار میں کھڑے تھے۔ اپنے ساتھ آئے ہوئے کانسٹیبلوں کو ایک یکے میں اور باقی سب دوسرے

یکے میں بٹھایا اور تھانے والے قصبے کی طرف روانہ ہوگئے۔

ہم تھانے پہنچے تو سورج غروب ہوگیا۔ میں تھانے میں یہ کہہ کر اپنے گھر چلا گیا کہ رات گیارہ بجے واپس آؤں گا اور ان دونوں سے تفتیش کروں گا۔ دوسری بات یہ کہی کہ ان دونوں کو سوائے پانی کے کچھ اور کھانے پینے کے لیے نہیں دینا۔ میں ٹھاکر کو خاص طور پر بھوک کی اذیت دینا چاہتا تھا۔ پنڈت کے اس شاگرد نے ٹھاکر کے خلاف میرے ذہن میں ایسا شک پیدا کر دیا تھا جو یقین کی حدوں کو چھو رہا تھا۔

غالباً گیارہ بج چکے تھے جب میں تھانے چلا گیا۔ شام کا کھانا کھا کر میں نے دو گھنٹے سو لیا تھا۔ اب میں رات بھر جاگنے کے لیے ترو تازہ تھا۔ ٹھاکر کو اپنے دفتر میں بٹھا کر دروازہ بند کر لیا۔ چونکہ اس آدمی کو گاؤں کی نمبرداری جیسی سرکاری حیثیت ملی ہوئی تھی اس لئے اس کے ساتھ ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔ وہ خود کچھ دنوں کے وقفے سے تھانے سلام کرنے بھی آیا کرتا تھا لیکن اب اس کی حیثیت ایک مشتبہ کی تھی۔ معلوم نہیں وہ مجھے شاہ صاحب کیوں کہا کرتا تھا اور میں نے اسے کبھی روکا بھی نہیں تھا۔

"ٹھاکر بھیا!"—— میں نے اسے بڑے تحمل سے اور دوستانہ لہجے میں کہا—— "اپنی سرکاری حیثیت کو بچاؤ اور بے خوف وخطر سچ بول دو۔ مجھ سے مت پوچھنا کہ تمہارے متعلق مجھے کیا کیا معلوم ہو چکا ہے، تم اس وقت مشتبہ نہیں ملزم ہو۔ سچ بتا دو وہ لڑکا کون تھا اور تم نے اس لڑکے کے ہاتھوں اپنے پنڈت کو کیوں قتل کروا دیا ہے؟ تمہارے اس جرم پر پردہ ڈالنا میرا کام ہے"۔

وہ تھا تو دیہاتی اور چٹا اَن پڑھ، اسے نہ جاننے والے اسے پس ماندہ اور گنوار ہی کہتے لیکن یہ مجھے معلوم تھا کہ یہ شخص کس قدر عیار اور شیطان تھا۔ عیاری اور مکاری کی کامیابی کے لیے تعلیم یافتہ ہونا ضروری نہیں ہوتا۔ میں نے اس پر جو الزام عائد کیا تھا، کوئی اور ہوتا تو وہ بری طرح گھبراہٹ اور بوکھلاہٹ میں مبتلا ہو جاتا اور خوف زدگی تو قدرتی ردِعمل ہوتا لیکن اس شخص پر تو جیسے کچھ اثر ہی نہیں ہوا تھا۔ میری بات سن کر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

"یہ بات گاؤں میں ہی کہہ دیتے شاہ صاحب!"—— اس نے بڑے شگفتہ لہجے میں کہا—— "لیکن شاہ صاحب! میں آپ کی ناراضگی سے ڈرتا ہوں کیونکہ آپ مسلمان

ہیں......"

"بات لمبی مت کرو" — میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا — "فوراً اصل بات پر آجاؤ"۔

"گستاخی کی معافی چاہتا ہوں شاہ صاحب!" — اس نے ہاتھ جوڑ کر غلامانہ لہجے میں کہا — "یہ لڑکا مسلمان ہے اور یہ ہندو ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اسے اپنے پاس رکھا اور پھر پنڈت کے حوالے کر دیا تھا۔ پنڈت نے کہا تھا کہ وہ رات کو اسے مندر میں بٹھا کر ہندو بنائے گا۔ پھر بھگوان جانے کیا بات ہوئی کہ لڑکے نے پنڈت کے سر پر ڈنڈا مارا اور بھاگ گیا"۔

"میں جانتا ہوں بات کیا ہوئی تھی" — میں نے قیاس آرائی کرتے ہوئے کہا۔ "تم اور پنڈت اس لڑکے کو زبردستی ہندو بنا رہے تھے۔ اسے موقع مل گیا اور پنڈت کو ڈنڈا مار کر بھاگ گیا...... اگر کوئی اور بات ہے تو بتاؤ"۔

"آپ نے پنڈت کے اس آدمی پر اعتبار کر لیا ہے" — ٹھاکر نے کہا — "یہ تو جاہل اور کم عقل آدمی ہے۔ معلوم نہیں آپ کو کیا بتا تا رہا ہے"۔

"تم اپنی بات کرو" — میں نے کہا — "میں جانتا ہوں یہ آدمی کم عقل ہے اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم اپنے آپ کو بہت ہی زیادہ عقل مند سمجھتے ہو لیکن یہ سوچ لو کہ تھانے میں ہم کس طرح اصل بات اگلوا لیا کرتے ہیں۔ یہ بھی سوچ لو کہ انگریزوں نے تمہیں جو سرکاری عزت دے رکھی ہے، اس سے ہاتھ دھو بیٹھو گے اور ذلت کی گندگی میں جا پڑو گے...... یہ بتاؤ کہ وہ لڑکا کون تھا؟ کہاں کا رہنے والا تھا اور تم اسے کہاں سے پکڑ لائے تھے۔ یہ بھی دماغ میں بٹھا لو کہ میں اس وقت ایک مسلمان کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک تھانیدار کی حیثیت سے بات کر رہا ہوں۔ ایک بات یہ بھی کہہ دیتا ہوں کہ تم نے کہا کہ تم لڑکے کے گاؤں وغیرہ کو نہیں جانتے تو میں نہیں مانوں گا۔ کسی مسلمان کو ہندو بنانا یا کسی ہندو کو مسلمان بنانا کوئی جرم نہیں۔ میری توجہ صرف اس واردات پر ہے کہ ایک آدمی قتل ہو گیا ہے۔ اگر تم صحیح بات نہیں بتاؤ گے تو اس کا مطلب یہ لیا جائے گا کہ تم قانون اور انصاف کے معاملے میں میری مدد نہیں کر رہے"۔

اس نے ذرا توقف کے بعد لڑکے کا جو نام لیا اور پھر اس کے گاؤں کا جو نام لیا، یہ سن

کر مجھے یوں لگا جیسے اس ٹھاکر نے بجلی کے ننگے تار میرے جسم کے ساتھ لگا دیئے ہوں...... اس نے لڑکے کا نام سہیل بتایا اور اسی گاؤں کا نام لیا جہاں سے سہیل کی ماں اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کروانے آئی تھی۔

میں کچھ وقت بعد ذہنی طور پر نارمل حالت میں آیا۔ پہلے خیال یہ آیا کہ میں نے سہیل کی ماں سے کہا تھا کہ اس کا بیٹا واپس آجائے گا۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بھی آگیا کہ سہیل پنڈت کو مار کر کیا اپنے گاؤں گیا ہوگا یا فرار ہو گیا ہے؟ غالب خیال یہ تھا کہ وہ گرفتاری کے ڈر سے کہیں دور بھاگ گیا ہوگا۔ مجھے یہ بھی معلوم کرنا تھا کہ سہیل اس ٹھاکر کے جال میں کس طرح آگیا تھا۔

ٹھاکر سے میں نے یہ تصدیق کرانی چاہی کہ یہ وہی سہیل ہے جو لاپتہ ہو گیا تھا اور یہ اسی گاؤں کا ہے۔ ٹھاکر سے میں اس تصدیق کے مقصد کے تحت کچھ باتیں پوچھنے لگا تو وہ اِدھر اُدھر کی ہانکنے لگا۔ اس سے مجھے اور زیادہ شک ہوا کہ معاملہ کچھ اور ہے اور اب یہ شخص مجھے گمراہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس جاہل کو معلوم تھا کہ وہ مجھے کوئی بات صحیح نہیں بتائے گا تو میں سہیل سے ساری بات معلوم کر لوں گا مگر یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ سہیل اپنے گاؤں میں ہے یا کہیں دور نکل گیا ہے۔

یہ ذہن میں رکھ لیں کہ سہیل کا گاؤں قصبہ حسین آباد سے کم و بیش اڑھائی میل دور تھا اور ٹھاکر کے گاؤں کا فاصلہ تقریباً چار میل تھا اور سہیل کے گاؤں اور ٹھاکر کے گاؤں کے درمیان اڑھائی تین میل کا فاصلہ تھا...... رات کے بارہ بج چکے تھے۔ میں نے اپنی ضرورت کے مطابق عملے کے کچھ آدمیوں کو بیدار رکھا ہوا تھا۔ ایک ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ سہیل کے گاؤں جائے اور اگر وہ گھر میں ہو تو اسے ساتھ لے آئے۔ ہیڈ کانسٹیبل کو سہیل کا گاؤں بتایا اور یہ بھی کہ سہیل وہ لڑکا ہے جس کی ماں اس کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوانے آئی تھی۔ ہیڈ کانسٹیبل کو یہ بھی بتا دیا کہ ہو سکتا ہے کہ لڑکا گھر ہی ہو اور یہ بتایا جائے کہ وہ تو گھر سے لاپتہ ہے۔ یہی وہ چھوٹی چھوٹی باتیں ہوتی ہیں جو تفتیش کرنے والے پولیس افسر کے ذہن میں نہ آئیں تو دشواری کا سامنا ہوتا ہے۔ یہ بات کہ ہو سکتا ہے کہ گھر والے سہیل کو چھپا لیں، میرے ذہن میں اس لئے آگئی تھی کہ سہیل نے گھر جا پناہ لی ہوگی اور اس نے ماں کو یا سوتیلے باپ کو بتا دیا ہوگا کہ وہ پنڈت کو مار کر بھاگا ہے۔ اس صورت میں

گھر والوں نے یہی کہنا تھا کہ لڑکا تو گھر سے کئی دنوں سے لاپتہ ہے۔

ہیڈ کانسٹیبل نے عقل مندی کی کہ ایک کانسٹیبل کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ دونوں سائیکلوں پر گئے۔ گاؤں تک پگڈنڈی بڑی صاف اور ہموار ہی تھی۔

میں پھر ٹھاکر کے پاس جا بیٹھا اور اسے کہنے لگا کہ وہ صحیح بات بتا دے لیکن ابھی تک وہ اسی بات پر قائم تھا کہ لڑکے کو ہندو بنایا جا رہا تھا۔ میں اسے کہتا تھا کہ یہ لڑکا سات آٹھ دنوں سے لاپتہ تھا اور اب خیال آتا ہے کہ اسے اغوا کیا گیا تھا۔ میں اغوا کا الزام ٹھاکر پر عائد کر رہا تھا اور اسے یہ بھی کہتا تھا کہ وہ ان سب افراد کے نام بتا دے جو لڑکے کے اغوا اور پھر اسے ہندو بنانے میں شامل تھے۔

میں ان تفصیلات کو اپنی تحریر سے حذف کر رہا ہوں کہ ٹھاکر کے ساتھ میری کیا گفت و شنید ہوئی، میں نے اس سے کیا سوالات پوچھے اور اس کے جوابات کیا تھے۔ ابھی میں نے اس پر کوئی زیادہ دباؤ نہیں ڈالا تھا۔ میں ہیڈ کانسٹیبل کی واپسی کا منتظر تھا کہ سہیل اس کے ساتھ آتا ہے یا نہیں۔ اصل بات تو سہیل ہی سے معلوم ہونی تھی۔ ٹھاکر کے متعلق میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اسے ایذا رسانی سے اقبال جرم پر لاؤں گا۔

"جناب شاہ صاحب!" ___ ٹھاکر نے بھکاریوں کے سے لہجے میں کہا ___ "آپ کی بادشاہی میں آپ کا غلام ابھی تک بھوکا ہے۔ کچھ کھلا پلا تو دیں، بھوک سے برا حال ہو رہا ہے"۔

"چکر بازی چھوڑ ٹھاکر!" ___ میں نے کہا ___ "ساری بات اگل ڈالو پھر جو تمہاری پسند ہوگی وہ منگوا کر کھلاؤں گا اور شراب بھی پلاؤں گا"۔

وہ اتنا ڈھیٹ تھا کہ ہنس مسکرا کر مجھے پرچانے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اسے باہر کانسٹیبلوں کے حوالے کر دیا اور اپنے دفتر میں کرسی پر بیٹھ کر ٹانگیں میز پر رکھیں اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ سہیل کے متعلق کوئی اطلاع ملنے تک میں آرام کر لینا چاہتا تھا۔

رات نصف گزر گئی تھی۔ بڑی جلدی آنکھ لگ گئی اور میں ایسی گہری نیند سویا کہ اڑھائی تین گھنٹے گزر گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل نے مجھے جگایا اور یہ خوشخبری سنائی کہ سہیل آ گیا ہے اور اس کی ماں اس کے ساتھ ہے۔ میں نے دونوں کو بلا لیا۔

میں پہلی بار سہیل کو دیکھ رہا تھا۔ ماں نے اس کی عمر چودہ سال بتائی تھی لیکن وہ دو چار

سال اور زیادہ عمر کا جوان لگتا تھا۔ ماں نے بڑی خوشی سے مجھ سے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے تھے کہ لڑکا خود ہی واپس آ جائے گا۔ یہ ہے میرا بیٹا، واپس آ گیا ہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ آدھی رات کے وقت اسے تھانے کیوں بلایا گیا ہے؟

اس کی اس بات سے مجھے محسوس ہوا کہ سہیل نے ماں کو بتایا نہیں کہ یہ پنڈت کو مار کر آیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مجھے یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے سہیل کو معلوم ہی نہ ہو کر پنڈت اس کے ڈنڈے کی ضرب سے مر گیا ہے۔ سہیل نے پنڈت سے فرار ہونے کے لئے اسے ڈنڈا مارا ہوگا۔ بہرحال میں نے اس کی ماں کے ساتھ کچھ ایسی شگفتہ سی باتیں کیں کہ وہ مطمئن ہو گئی اور مجھے یقین ہو گیا کہ سہیل نے اسے کچھ بھی نہیں بتایا۔ میں نے ماں سے کہا کہ وہ باہر جا کر بیٹھ جائے۔ اس کی تسلی کے لئے میں نے جھوٹ بولا کہ اس کی گم شدگی کی رپورٹ لکھ لی تھی اور اب یہ لکھنا ہے کہ لڑکا واپس آ گیا ہے اور اس تحریر پر اس کا انگوٹھا لگوانا ہے۔ یہ تو میری شرافت تھی کہ میں اس عورت کو مطمئن کر رہا تھا۔ وہ مطمئن ہوئی تھی یا نہیں لیکن اس میں اتنی جرأت نہیں ہو سکتی تھی کہ مجھ سے کچھ اور پوچھتی۔ ان لوگوں پر تھانے کی دہشت ایسی طاری ہوتی تھی کہ وہ پولیس کا نام سن کر ہی کانپنے لگتے تھے۔

سہیل میرے پاس اکیلا رہ گیا۔ میں نے اس کے ساتھ شفقت کے انداز سے دو چار باتیں کیں اور اس کے دل سے تھانے کا خوف اتارنے کی پوری کوشش کی۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ ڈرنے والا نوجوان نہیں ذرا حوصلہ افزائی چاہئے جو میں نے کر دی۔

اس نے ذرا ڈرتے ڈرتے مجھ سے پوچھا کہ یہ دو آدمی جو باہر بیٹھے ہیں، یہاں کیوں آئے ہوئے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ انہیں کس طرح جانتا ہے۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور اس کے چہرے سے بے چینی ظاہر ہونے لگی۔

"سہیل بھائی!" ___ میں نے لہجے میں پیار اور اپنائیت بھر کر کہا ___ "یہ تو تم جانتے ہو گے کہ میں مسلمان ہوں۔ میرے ساتھ سچ بولو گے تو میں تمہارے سر پر ہاتھ رکھ لوں گا اور کوئی تمہیں دشمنی کی نظر سے دیکھنے کی جرأت نہیں کرے گا۔ تمہیں یہ سچ سچ بتانا ہے کہ تم اتنے دن کہاں رہے اور واپس گھر کس طرح پہنچے"۔

مجھے یاد ہے کہ یہ بات کہہ کر ایک ضروری کارروائی یاد آ گئی۔ میں نے سہیل کو وہیں بیٹھا رہنے دیا اور خود باہر نکل گیا۔ ٹھاکر اور مندر کا آدمی الگ الگ برآمدے میں بیٹھے تھے

اور کانسٹیبل وہاں کھڑے تھے۔ میں نے مندر کے آدمی کو الگ لے جا کر پوچھا کہ یہ لڑکا جو اندر میرے پاس بیٹھا ہے، اس نے دیکھا ہے؟ مندر کے آدمی نے کہا کہ دیکھا ہے اور ساتھ ہی بولا کہ یہی وہ لڑکا تھا جس نے پنڈت کو ڈنڈا مارا تھا۔

پھر میں ٹھاکر کو الگ لے گیا اور اسے کہا کہ اس نے اس لڑکے کو میرے دفتر میں جاتے دیکھا ہے، کیا یہ وہی لڑکا ہے جیسے وہ ہندو بنا رہے تھے؟...... ٹھاکر نے ذرا پس و پیش کے بعد کہا کہ یہی ہے...... میں اپنے دفتر میں جا بیٹھا۔

سہیل سے کہا کہ اب میرے اس سوال کا جواب دے کہ وہ اتنے دن کہاں رہا ہے۔ میں نے ابھی تک پنڈت کا نام تک نہیں لیا تھا۔ میں کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کہ سہیل کو معلوم ہے یا نہیں کہ پنڈت مر گیا ہے۔

میں نے دیکھا کہ سہیل بات کرنے لگتا تھا تو جھجک جاتا اور پہلے سے زیادہ بے چین ہو جاتا تھا۔ وہ صاف طور پر ڈرا ہوا تھا۔

''ایک بات صاف صاف بتا دو سہیل!'' —— میں نے کہا —— ''کیا تم مجھ سے ڈر رہے ہو یا تمہارے دل پر کوئی اور خوف ہے؟...... میں تمہیں کہہ چکا ہوں کہ میری موجودگی میں تمہیں کوئی دشمنی کی نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے صحیح بات نہیں بتاؤ گے تو میں تمہاری مدد اور حفاظت کس طرح کروں گا؟...... چلو صاف صاف بولو''۔

''میں آپ سے نہیں ڈر رہا ہوں'' —— اس نے ذرا کھل کر بات کی —— ''آپ تو اتنے اچھے آدمی ہیں، میں ان دونوں آدمیوں سے ڈر رہا ہوں جو باہر بیٹھے ہیں''۔

''کیوں؟'' —— میں نے انجان بنتے ہوئے پوچھا —— ''ان میں تمہیں کیا ڈر ہے؟''

''میں نے ان کے پنڈت کے سر پر ڈنڈا مارا تھا اور وہاں سے بھاگ آیا'' —— سہیل نے کچھ رک رک کر کہا —— ''ان دونوں میں ایک آدمی نے دیکھ لیا تھا۔ دوسرا آدمی بھی مجھے جانتا ہے''۔

''یہی آدمی مجھے مندر میں پنڈت کے پاس چھوڑ کر چلا گیا تھا'' —— سہیل نے جواب دیا اور اپنا خوف اس طرح بیان کیا —— ''میرا خیال ہے کہ یہ دونوں آدمی تھانے میں یہی رپورٹ لے کر آئے ہیں''۔

یہ تو لمبی گفتگو ہے جو مجھے سہیل کے ساتھ کرنی پڑی اور آخر اس نے بتایا کہ وہ کہاں چلا گیا تھا اور اس پر کیا بیتی...... اس نے بات اس روز سے شروع کی جس روز وہ اپنے دو دوستوں کے ساتھ باہر کھڑا تھا اور اس کے سوتیلے باپ نے اسے بلایا اور کھیتوں کی طرف لے گیا تھا۔

کھیتوں میں لے جا کر باپ نے اسے کوئی کام بتایا اور کہا وہ ابھی آتا ہے۔ باپ وہاں سے کچھ دور چلا گیا۔ گندم کی فصل خاصی اونچی ہو گئی تھی۔ سہیل مینڈھ پر بیٹھ کر کام کرنے لگا۔ اچانک پیچھے سے کسی نے اس کے سر اور چہرے پر کپڑا پھینکا اور پھر غالباً دو آدمی تھے جنہوں نے اسے اٹھا لیا اور ایک طرف چل پڑے۔

کھیتوں کے آگے علاقہ ویران اور غیر آباد تھا۔ ذرا آگے زمین کچھ گہرائی میں چلی جاتی تھی۔ میں اس علاقے سے واقف تھا۔ وہ آدمی دو تھے یا تین چار تھے، سہیل کو جان سے مار دینے کی دھمکیاں دیتے ہوئے لے گئے اور ایک گھر میں قید کر دیا۔ سہیل نے بتایا کہ وہاں تک پہنچتے ایک گھنٹہ گزر گیا ہوگا۔

کسی گھر کے کمرے میں بند کر کے سہیل کی آنکھیں کھول دی گئیں۔ وہ تین آدمی تھے جنہوں نے اسے زبردستی اغوا کیا تھا۔ انہوں نے سہیل پر سوائے زبانی دھمکیوں کے ذرا سا بھی تشدد نہیں کیا بلکہ اسے سبز باغ دکھاتے رہتے، مثلاً یہ کہ ایک بڑی ہی خوبصورت لڑکی اس کے حوالے کر دی جائے گی اور اسے دولہا بنایا جائے گا اور پھر دو تین دن بعد اسے آزاد کر دیا جائے گا۔ سہیل نے ان سے پوچھا کہ اس پر یہ نوازشات کیوں کی جا رہی ہیں؟...... انہوں نے بتایا کہ وہ اپنے مذہب کی ایک خاص رسم ادا کریں گے جو اس طرح کی جاتی ہے کہ غیر مذہب کا ایک نوجوان لایا جاتا ہے اور اسے عیش و عشرت کروا کے آزاد کر دیا جاتا ہے اور پھر یہ رسم ادا ہوتی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ جب سہیل وہاں سے آزاد ہو کر اپنے گھر جائے گا تو اس نے نہایت اعلیٰ کپڑے پہنے ہوئے ہوں گے اور اس کی جیب میں بہت سے پیسے ہوں گے۔

بات آگے بتانے سے پہلے یہ بتا دیتا ہوں کہ شام کو پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے لکھا تھا کہ کنپٹی پر ڈنڈا اتنی زور سے لگا کہ دماغ کو ضرب پہنچی اور دماغ سے خون رسنے لگا جو موت کا باعث بنا۔ موت واقع ہونے کا وقت اندازاً رات ساڑھے گیارہ بجے لکھا تھا۔

سہیل کے اتنے سے بیان سے ہی میں نے جان لیا کہ ان لوگوں نے سہیل کی جان کی قربانی دینی تھی۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ان لوگوں نے لڑکے کو فوراً قربان کیوں نہ کر دیا اور اتنے دن کیوں انتظار کرتے رہے۔ میں نے ابتدا میں بتایا ہے کہ بھارت کے دیہاتی علاقوں میں آج بھی ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ ہندو کسی اچھوت کا بچہ یا کسی غریب اور نادار مسلمان کا بچہ اغوا کر کے اسے اپنے دیوتاؤں کے نام پر ذبح کر دیتے ہیں۔ سہیل کا بھی انجام یہی ہونا تھا۔

میرے لئے سہیل کا اغوا کوئی عجیب واقعہ نہیں تھا نہ میں نے اسے کوئی غیر معمولی واردات سمجھا۔ یہاں بے محل ہوگا کہ میں ہندوؤں کی توہم پرستی کے کچھ واقعات سناؤں۔ آپ حیران رہ جائیں گے کہ یہ قوم کیا اس حد تک پسماندہ اور توہم پرست ہے؟ کبھی یہ بھی سناؤں گا۔

اگر یہ اغوا کسی بڑے شہر میں ہوتا تو اغوا کرنے والے اغوا ہونے والے کو ٹرانکولائزر گولیاں دے دے کر سلائے رکھتے اور اسی حالت میں ذبح کر دیتے لیکن یہ دور دراز دیہات کا علاقہ تھا جن کے پاس اپنے شکار کو بے ہوش رکھنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس کی بجائے انہوں نے سہیل کو شہزادہ بنا کر رکھا، اسے نہایت اچھا کھانا دیتے اور شراب بھی پلاتے رہے جو سہیل کو بہت اچھی لگی۔ پھر ایک روز ایک بڑی حسین لڑکی سہیل کے پاس بٹھا دی گئی جو اس کے ساتھ پیار اور محبت کی باتیں کرتی رہی لیکن سہیل کے بیان کے مطابق، اس لڑکی کے پیار میں بدی کا نام و نشان نہ تھا بلکہ سہیل پر خمار سا طاری ہو جاتا تھا۔ اس نے بڑے واضح الفاظ میں بتایا کہ وہ اس قید میں خوش تھا۔

یہ بھی کوئی حیران کن بات نہیں تھی کہ سہیل ان لوگوں کے ہاتھوں میں کھیلنے لگا اور خوش رہا۔ یہ سوچئے کہ وہ نوجوانی میں داخل ہو چکا تھا، پسماندہ دیہاتی تھا اور اس کے اپنے ہی جذبات تھے۔ اسے اپنے سگے باپ سے بھی پیار نہ ملا اور سوتیلے باپ نے تو پیار کی بجائے اسے پھٹکار ہی دی۔ اس کا دماغ تو موم کی ناک تھا جسے کوئی جدھر چاہتا موڑ توڑ سکتا تھا۔ سہیل کو بے ہوشی کی دوائی کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

آخر وہ رات آئی جب سہیل کو مندر میں لے جایا گیا۔ اس نے مجھے بیان دیتے ہوئے کہا کہ باہر برآمدے میں جو آدمی بیٹھا ہوا ہے یہ اسے مندر میں لے گیا تھا۔ سہیل کا

اشارہ ٹھاکر کی طرف تھا۔ پنڈت وہاں انتظار میں بیٹھا تھا۔ سہیل اپنے قید والے کمرے میں گہری نیند سویا ہوا تھا اور اسے جگا کر مندر کو لے جایا گیا تھا۔ ٹھاکر اسے پنڈت کے پاس بٹھا کر چلا گیا۔

پنڈت نے اس کے ماتھے پر اپنی انگلی سے تلک لگایا اور کچھ پڑھنے بڑبڑانے لگا۔ پھر پنڈت نے منہ کسی دیوتا کے بت کی طرف کر کے ہاتھ جوڑے اور کچھ پڑھتا رہا۔ اس کے بعد وہ پھر سہیل کی طرف متوجہ ہوا۔ اس کے بعد سہیل نے جو بیان دیا اس سے میں نے یہ رائے قائم کی کہ یہ پنڈت کوئی جاہل آدمی تھا کہ اس نے سہیل کو اصل بات بتا دی یا شاید اس کے لیے یہ سچ بولنا لازمی تھا۔

پنڈت نے سہیل سے کہا کہ وہ بہت ہی خوش قسمت لڑکا ہے جسے دیوتاؤں نے اپنی قربانی کے لیے منتخب کیا ہے۔ پنڈت نے یہ بھی کہا کہ سہیل فوراً دوسرے جنم میں اس دنیا میں آئے گا لیکن ایک اَن پڑھ دیہاتی کی صورت میں نہیں بلکہ راجکمار کی صورت میں وہ ہندوستان کی کسی ریاست میں راج کرے گا۔

یہ سب کچھ بتا کر پنڈت نے سہیل سے کہا کہ وہ اس بت اور اس مورتی کے آگے ہاتھ جوڑے اور پنڈت جو کچھ کہتا جائے وہ سہیل اس کے ساتھ ساتھ بولتا جائے۔ اس وقت تک سہیل بالکل خاموش تھا۔ اس نے اپنے بیان میں کہا کہ اسے معلوم تھا کہ ہندو کبھی کبھی انسانی قربانی بھی دیتے ہیں اور کسی غیر ہندو کا بچہ اٹھا لیتے ہیں اور اسے ذبح کر دیتے ہیں۔ سہیل کے متعلق دوستوں نے ٹھیک بتایا تھا کہ بڑا دلیر لڑکا تھا اور اتنا نڈر کہ بڑی عمر کے آدمی بھی اس سے گھبراتے تھے۔

سہیل نے یوں بیان دیا کہ اس کی نظر ایک موٹے ڈنڈے پر پڑی جو پنڈت کے قریب فرش پر پڑا تھا۔ پنڈت نے اسے کہا کہ وہ اس بت کے آگے ہاتھ جوڑے تو سہیل کی ذات میں ایک مسلمان بیدار ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ بغیر سوچے اور بغیر ارادے کے اس کا ہاتھ اس ڈنڈے پر چلا گیا۔ پنڈت کے سر پر پگڑی تھی۔ اس کی موت اسی طرح لکھی تھی جو یوں پوری ہوئی کہ نہ جانے پنڈت نے کیوں اس وقت پگڑی سر سے اتاری اور سر کو کھجلایا۔ شاید سر کو کھجلانے کے لیے ہی پنڈت نے پگڑی اتاری تھی۔ سہیل نے پوری طاقت سے ڈنڈا اس کی بائیں کنپٹی پر مارا۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ باہر برآمدے میں ٹھاکر

کے ساتھ جو آدمی بیٹھا ہے، وہ اندر آیا اور دیکھ رہا تھا۔

پنڈت ایک پہلو پر لڑھک گیا اور سہیل اس قدر تیزی سے اٹھا اور باہر کو بھاگا جیسے وہاں وہ کبھی بیٹھا ہی نہیں تھا اور اپنے گاؤں کو دوڑتا گیا۔ آدھے راستے میں تھک گیا تو چلنے لگا۔ وہ گھوم گھوم کر پیچھے دیکھتا تھا لیکن اس کے تعاقب میں کوئی نہیں آرہا تھا۔

گھر پہنچ کر اس نے دروازے پر دستک دی تو اس کے باپ نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھتے ہی باپ نے گالی گلوچ شروع کر دی کہ وہ سات آٹھ روز نہ جانے کہاں آوارگی کر آیا ہے۔ ماں کی آنکھ کھلی تو وہ دوڑی باہر آئی اور سہیل کو گلے لگا لیا۔ میاں بیوی میں خاصا لڑائی جھگڑا ہوا۔ ماں اپنے بیٹے کی وکالت کر رہی تھی۔ سہیل بالکل ہی خاموش رہا اور سوتیلے باپ کی گالیاں سنتا رہا جو وہ اسے اور اس کی ماں کو دے رہا تھا۔

پنڈت کے قتل کی خبر سہیل کے گاؤں میں بھی پہنچ گئی تھی۔ سہیل نے مجھے بتایا کہ اس کا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا۔ وہ تو وہاں سے بھاگنا چاہتا تھا اور اسے یہ توقع ہی نہیں تھی کہ پنڈت ڈنڈے کی ایک ہی ضرب سے مر جائے گا۔ سہیل نے سوچا کہ اب وہ ایسا بھاگے کہ واپس کبھی بھی گاؤں میں نہ آئے۔ اسے ڈر تھا کہ پکڑا جائے گا اور پھانسی کی سزا ملے گی لیکن اس کی ماں اسے ایک منٹ کے لیے بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دے رہی تھی۔ دن کو اس کے دوست بھی آ گئے اور ماں نے دوستوں کو بھی گھر بٹھا لیا اور اس طرح دن گزر گیا۔ سہیل نے ارادہ کیا کہ رات کو سب سو جائیں گے تو وہ بھاگ جائے گا لیکن وہ اتنا تھکا ہوا تھا کہ سو گیا تو پھر میرے بھیجے ہوئے ہیڈ کانسٹیبل نے اسے جگایا اور اپنے ساتھ لے آیا۔

میں نے سہیل کو بہت تسلیاں دیں کہ میں اسے بچانے کی پوری کوشش کروں گا لیکن میں یوں نہیں کر سکتا تھا کہ اسے چھوڑ ہی دیتا۔ یہ تو ٹھاکر اور دوسرے ہندوؤں نے دیکھا تھا کہ قاتل سہیل ہے۔ وہ سہیل کو کسی اور طریقے سے پھنسا سکتے تھے۔

میں نے باہر جا کر سہیل کی ماں سے کہا کہ وہ گھر چلی جائے اور میں سہیل کو صبح گاؤں بھیج دوں گا۔ وہ تو مان ہی نہیں رہی تھی اور میں اسے اصل بات بتا نہیں رہا تھا۔ بڑی مشکل سے اسے چلتا کیا۔ اس کے جانے کے بعد سہیل کو کانسٹیبلوں کی نگرانی میں الگ بٹھا دیا اور ٹھاکر کو اپنے دفتر میں لے گیا۔ میں نے اسے کہا۔۔۔ ''اب کوئی ہیرا پھیری نہیں چلے گی۔ اپنے تمام ساتھیوں کے نام بتا دو اور اس لڑکی کی نشاندہی سب سے زیادہ ضروری ہے جسے

اس جرم میں استعمال کیا تھا''۔

یہ تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ ٹھاکر فوراً مان جاتا۔ اس نے پس و پیش شروع کی تو میں نے اسے کہا کہ اب میں اسے ایک منٹ کی بھی مہلت نہیں دوں گا، فوراً اقبالی ہو جائے اور میں ڈی ایس پی صاحب کو اطلاع دے رہا ہوں۔ وہ یہ نہیں دیکھے گا کہ وقت رات کا ہے، فوراً یہاں پہنچے گا۔

دراصل رات گزر گئی تھی اور قصبے کی جامع مسجد سے فجر کی آواز آ رہی تھی۔ ٹھاکر نے پہلے میرے آگے ہاتھ جوڑے پھر اٹھا اور میز کی ایک طرف سے میرے قریب آ کر میرے قدموں میں سجدے میں گر گیا اور فرش پر دو زانو ہو کر پھر ہاتھ جوڑے اور عرض یہ کی کہ اسے وعدہ معاف گواہ بنا لوں۔ اس نے دیکھ لیا تھا کہ میں کیس پر پردہ نہیں ڈال سکتا اور اسے کسی قیمت پر نہیں چھوڑوں گا۔

وہ جوں جوں میرے آگے بچھا جا رہا تھا، میرا غصہ اتنا ہی زیادہ شدید اور زہرناک ہوتا جا رہا تھا۔ ٹھاکر نے رشوت اس طرح پیش کی کہ میں اسے بتاؤں کہ میں کتنی رقم لوں گا۔ اس نے کہا کہ اس جرم میں جو لڑکی شامل تھی میں اسے بھی اپنا ہی سمجھوں اور جب چاہوں اپنے گھر بلوا سکتا ہوں۔ اس نے لڑکی کا حسن اس طرح بیان کیا جیسے کوئی افسانہ نویس یا شاعر اپنے کلام میں لفاظی کے جوہر دکھایا کرتا ہے۔ عمر سولہ سترہ سال بتائی۔

میں دوسرے ذرائع سے بھی ملزموں کی نشاندہی کروا سکتا تھا لیکن اس ٹھاکر کو میں بڑا سخت رگڑا دینے کے موڈ میں تھا۔ ایذا رسانی کو شریفانہ الفاظ میں تھرڈ ڈگری کہا جاتا ہے۔ مختلف صوبوں میں اس کے پولیس والوں نے مختلف نام رکھے ہوئے ہیں۔ اس تھانے سے پہلے والے تھانے میں میرا ایک عیسائی اے ایس آئی فرانسس ہوا کرتا تھا۔ کوئی ملزم اقبالی نہ ہوتو وہ کہا کرتا تھا کہ اسے ماہر نفسیات کے حوالے کر دو۔ وہ ماہر نفسیات اس تھانے کا ایک پرانا ہیڈ کانسٹیبل تھا جس نے ٹارچر کے اپنے ہی تین چار طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ ان میں سے کوئی ایک آدھا طریقہ کامیاب ہو جاتا تھا۔ قصبہ حسین آباد کے اس تھانے میں بھی ایک ویسا ہی ہیڈ کانسٹیبل تھا جو ٹارچر کا ماہر تھا۔ میں نے اسے بھی ماہر نفسیات کہنا شروع کر دیا تھا۔

میں نے ایک کانسٹیبل کو بلایا اور کہا کہ ٹھاکر جی کو ماہر نفسیات کے پاس لے

جاؤ۔ کانسٹیبل نے اسے بازو سے پکڑا اور باہر لے گیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے مندر کے آدمی کو بلایا۔ معلوم یہ کرنا تھا کہ یہ بھی اس سارے جرم میں شامل تھا یا نہیں۔

اس سے تفتیش کی تو وہ خوف زدگی کے عالم میں قسمیں کھاتا رہا اور اسی بات پر اڑا رہا کہ اس نے سہیل کو پہلی بار مندر میں ہی دیکھا تھا۔ اس کے ساتھ میں نے بہت دماغ سوزی کی لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اسے ان لوگوں نے سارے جرم کے ڈرامے میں شامل نہیں کیا تھا۔

تقریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد میرا ماہر نفسیات آیا۔ وہ ہنس رہا تھا۔ کہنے لگا کہ ٹھاکر جی تو پہلے ہی نسخے پر بول پڑے ہیں۔ یہ ٹھاکر کوئی جوان آدمی نہیں تھا کہ اتنی زیادہ ایذا رسانی برداشت کر سکتا۔ اس کی عمر ساٹھ سال کے قریب تھی۔

میں نے ٹھاکر کو بلوایا۔ وہ جب آیا تو اس سے ٹھیک طرح چلا بھی نہیں جا رہا تھا اور اس کا سر ڈول رہا تھا۔ کرسی پر اس طرح بیٹھا جیسے گر پڑا ہو۔ میں نے کہا کہ فوراً بیان دے دو۔ اس نے پانی مانگا جو اسے دیا گیا اور پھر اس نے بیان دے دیا۔

اس نے پہلی بات یہ کہی کہ ایک جان کا بلیدان دینا تھا۔ ہندی میں قربانی کو بلیدان کہتے ہیں۔ اسی پنڈت نے جو مارا گیا تھا، اپنا حساب کتاب نکال کر بتایا تھا کہ لڑکا مسلمان ہو اور اس کی عمر چودہ سال کے لگ بھگ ہو۔ اس کی جان کی قربانی چاند کی کسی خاص تاریخ والی رات دینی تھی۔

اب دیکھئے سہیل کا انتخاب کس طرح ہوتا ہے۔ سہیل کے سوتیلے باپ کا ایک دوست تھا جس کی عزیز داری ٹھاکر کے ساتھ تھی۔ یہ شخص سہیل کے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ ٹھاکر نے اس کے ساتھ ایسے ہی ذکر کیا کہ ایک لڑکا خواہ اچھوتوں کا ہو یا مسلمانوں کا، بلیدان کے لیے درکار ہے اور اس کی عمر چودہ سال ہونی چاہئے۔ اس شخص کو معلوم تھا کہ سہیل کا سوتیلا باپ سہیل سے بہت تنگ آیا ہوا تھا۔ میں نے بعد میں اس شخص سے بھی بیان لیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ یہ سوتیلا باپ تو یہاں تک کہتا تھا کہ یہ لڑکا مر ہی جائے تو اچھا ہے یا میں اسے اس قدر پریشان کروں کہ گھر سے بھاگ جائے۔ اس آدمی نے ٹھاکر کی بات سن کر سہیل کے سوتیلے باپ کے ساتھ ذکر کیا۔ سوتیلا باپ یوں چپ ہو گیا جیسے اسے یہ بات اچھی لگی ہو لیکن اپنی زبان سے کچھ کہنے سے ڈرتا ہو۔

ٹھاکر کو اس کے اس عزیز نے بتایا تو ٹھاکر نے کہا کہ سوتیلا باپ کچھ رقم لے لے اور اپنا لڑکا انہیں دے دے۔ سوتیلے باپ نے لڑکے کی قیمت اڑھائی سو روپے مانگی اس رقم کو آج دس اور پندرہ ہزار کے درمیان کہہ لیں۔ یہ طے پایا کہ باپ اپنے اس سوتیلے بیٹے کو ایسی جگہ لے آئے جہاں کوئی دیکھنے والا نہ ہو۔ وہاں سے لڑکے کو اٹھا لے جانا ٹھاکر کا بندوبست تھا۔ اس طرح سوتیلا باپ اڑھائی سو روپیہ وصول کر کے سہیل کو کھیتوں میں لے گیا، خود غائب ہو گیا اور جس طرح سہیل کو وہاں سے اغوا کیا گیا وہ میں پہلے تحریر کر چکا ہوں۔

ٹھاکر نے اپنے بیان میں کہا کہ جس رات پنڈت مارا گیا ہے بلیدان اسی رات دینا تھا۔ آخری رسم پنڈت کو ادا کرنی تھی جو وہ مندر میں کر رہا تھا۔ مختصر یہ کہ وہ سہیل کو پوتر (پاک) کر رہا تھا۔ اس کے بعد سہیل کو جنگل میں لے جا کر ذبح کرنا تھا۔

قربانی دینے کی ضرورت یوں پیش آئی تھی کہ پہلے ایک رات زلزلے کا شدید جھٹکا آیا جو بارہ تیرہ سیکنڈ رہا۔ لوگ گھروں سے بھاگ نکلے تھے۔ چند دنوں بعد چاند گرہن ہو گیا اور اس کے فوراً بعد ایسا طوفان آیا کئی لوگوں کے گھر گر گئے اور کچھ موتیں بھی ہوئیں۔ اس کے بعد فصلوں کی بجائی ہوئی اور آسمان سے بادل بالکل ہی غائب ہو گئے۔ صاف نظر آتا تھا کہ اب کے خشک سالی ہو گی اور اس کا نتیجہ قحط ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ساری آفات چھ مہینے کے عرصے میں آئی تو کسی نے بتایا کہ دیوتا سخت ناراض ہیں، ایک جان کی قربانی دے دو اور اس کا خون پانی میں ملا کر دور دور تک یہ پانی چھڑک دو ورنہ بے شمار جانیں ضائع ہو جائیں گی۔

ہوا یہ کہ پنڈت ایک مسلمان لڑکے کو قربانی کے لئے پوتر کر رہا تھا، اس کے دیوتاؤں نے اسی پنڈت کی جان کا بلیدان لے لیا۔

ٹھاکر نے تمام ملزموں کی نشاندہی کر دی۔ میں نے اسے اور سہیل کو حوالات میں بند کر دیا اور خود ڈی ایس پی کے پاس چلا گیا جو چھبیس ستائیں میل دور ضلع کے مرکزی شہر میں ہوتا تھا۔ اسے زبانی یہ ساری واردات سنائی۔ اس نے ہندوؤں کے خلاف بڑی ہی نفرت کا اظہار کیا اور مجھے کچھ ضروری ہدایات دیں۔ میں نے اسے کہا کہ ہندو فساد پر اتر آئیں گے اور مقدمہ خراب کریں گے۔ ڈی ایس پی نے میری حوصلہ افزائی کی اور کہا کہ وہ پولیس کی

گارڈ بھیج دے گا اور میں مقدمہ بالکل صحیح اور مضبوط بناؤں۔

اس کے بعد جو ہوا وہ پولیس کی کارروائیاں تھیں اور مقدمے کی تیاری۔ میں نے اپنے تھانے کے زیادہ سے زیادہ کانسٹیبل ساتھ لئے اور اٹھ کر کے گاؤں جا کر اس کی نشاندہی پر پانچ آدمیوں کو گرفتار کیا اور لڑکی کو بھی۔ آپ سن کر حیران ہوں گے کہ یہ لڑکی ٹھاکر کی سگی بھتیجی تھی اور بہت ہی خوبصورت۔ سہیل کے سوتیلے باپ کو گرفتار کیا اور اس آدمی کو بھی جس نے ٹھاکر اور اس سوتیلے باپ کے درمیان سودا طے کروایا تھا۔ یہ تو بڑا لمبا قصہ ہے کہ میں نے اپنے انگریز ڈی ایس پی کی زیر ہدایات مقدمہ کس طرح تیار کیا اور اس مقدمے کو کورٹ میں کس طرح اور کس انداز سے پیش کیا۔ مقدمے کی سماعت بڑی ہی دلچسپ تھی لیکن یہ مختصراً سنائی نہیں جا سکتی۔ اس واردات کی خبریں اخباروں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

میں اب یہ بتا دیتا ہوں کہ میرے اس کیس کا انجام کیا ہوا۔ تمام ملزموں کو مختلف دفعات میں سزا دی گئی سوتیلے باپ کو دو سال سزائے قید بامشقت دی گئی تھی۔ ٹھاکر اور اس کے ساتھیوں کو اغوا برائے قتل اور ایک اور دفعہ میں سات سات سال سزا دی گئی تھی۔ لڑکی کو سیشن جج نے بری کر دیا تھا۔ ٹھاکر کے جس عزیز نے سودا کروایا تھا اسے ایک سال سزائے قید دی گئی۔

سہیل کو آٹھ سال سزائے قید دی گئی۔ چونکہ وہ ابھی نابالغ تھا اس لئے جج نے فیصلے میں لکھا کہ اسے بورسٹل جیل میں بھیجا جائے۔

سہیل کو بچانے کے لیے میں نے ایک استادی کھیلی تھی۔ پنڈت کا وہ آدمی جس نے سہیل کو پنڈت کے سر پر ڈنڈا مارتے دیکھا تھا بہت ہی بزدل اور ڈرپوک تھا اور عقل کا بھی ڈھیلا تھا۔ وہ ملزم نہیں گواہ تھا۔ میں نے اسے الگ بٹھا کر کہا کہ جس طرح میں کہتا ہوں اس طرح بیان دینا اور اگر اس نے ایک لفظ بھی اِدھر اُدھر کیا تو اسے پنڈت کے قتل میں عمر قید دلوا دوں گا۔ وہ تو اسی دھمکی سے کانپنے لگا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ یہ ضرور کہے کہ اس نے سہیل کو پنڈت کے سر پر ڈنڈا مارتے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا لیکن یہ بھی کہے کہ اپنے کانوں سے اس نے سنا تھا کہ پنڈت سہیل سے کہہ رہا تھا کہ تمہاری جان کی قربانی دی جا رہی ہے اور دیوتاؤں نے تمہیں اپنی قربانی کے لیے پسند کیا ہے اور تم فوراً دوسرا جنم لے

کر اور راجکمار بن کر دنیا میں واپس آؤ گے۔

اس شخص نے کورٹ میں یہی بیان دیا۔ میں نے سرکاری وکیل کے کان میں بھی یہ بات ڈال دی تھی۔ خوش قسمتی سے سرکاری وکیل عیسائی تھا۔ اس شخص کے اس بیان سے یہ کیس قتل عمد کا رہتا ہی نہیں تھا بلکہ سیلف ڈیفنس (حفاظت خود اختیاری) کا کیس بن جاتا تھا یعنی ایک آدمی سے کہا جا رہا ہے کہ ہم تمہیں ذبح کر رہے ہیں اور وہ آدمی اپنی جان بچانے کی کوئی ترکیب کرتا ہے۔

دوسری بات جو میں نے سہیل کے صفائی کے وکیل کے کانوں میں ڈالی وہ یہ تھی کہ سہیل کا ارادہ پنڈت کو قتل کرنے کا تھا ہی نہیں۔ اگر ارادہ قتل کا ہوتا تو سہیل مقتول کے سر پر کئی ڈنڈے برساتا کہ وہ مر جائے لیکن اس نے ایک ڈنڈا مارا اور بھاگ نکلا۔

سیشن جج ہندو تھا۔ اس نے سہیل کو محض تعصب میں آ کر آٹھ سال سزا دے دی لیکن ہائیکورٹ میں اپیل ہوئی تو جج نے یہی دو نکتے پکڑ لئے۔ ایک سیلف ڈیفنس اور دوسرا یہ کہ یہ قتل عمد ہے ہی نہیں۔ پنڈت کے اس آدمی کی گواہی میرا کام کر گئی۔ اپیل میں سہیل کی سزا آٹھ سال سے کم کر کے صرف دو سال رہنے دی گئی۔

*** ختم شد ***